فہرست مضامین

تعارف	۳
الحاد ولادینیت کا بڑھتا ہوا طوفان اور کرنے کا کام	۶
اقامت دین اور نظام کی تبدیلی کی جدوجہد اس کی اہمیت اور صحیح صورت	۱۴
عالمی اسلامی دعوت کا کام عالمگیریت کے پس منظر میں	۱۸
معاشرہ کی جدید نوعیت اور مثبت تحریک کی ضرورت عالمی صورتحال کے پس منظر میں	۲۴
موجودہ دور میں قوموں کے درمیاں لڑی جانے والی اصل لڑائی	۲۹
موجود حالات میں اہل پاکستان کے لئے بچاؤ کی صورت	۳۶
انقلاب فرانس وانقلاب روس کے جدید اسلامی فکر پر اثرات اور اسلامی تحریک کے صحیح نقوش وخطوط	۳۹
معاشرہ کو درپیش چیلنج اور اس سے عہدہ برآ ہونے کی صورت	۵۳
قرآن سے اخذ فیض کی صلاحیت کی صورت (نفس امارہ کے مطالعہ کی روشنی میں)	۶۳
اسلام اور فرد کے درمیاں معرکہ آرائی کا اصل میدان	۶۹
وقت کا چیلنج اور ہمارا کردار وذمہ داریاں	۷۵
عصر حاضر میں صحیح اور متوازن فکری رہنمائی مولانا علی میاں کی نظر میں (''مجالس حسنہ'' کتاب کی روشنی میں)	۸۲
موجودہ دور میں تصوف کا کردار محبت آمیز تنقیدی نظر	۱۱۱

	قومیت اور جدید قومی پرستی اثرات ونتائج پر ایک نظر	۱۳۰
	جماعت اسلامی کی جدوجہد فکر اور حکمت عملی پر ایک نظر (ایک سوال نامہ کے جواب میں)	۱۴۸
	عالم عرب کی مؤثر اسلامی تنظیم اخوان المسلمون پر ایک نظر	۱۶۶
	مولانا عبیداللہ سندھی کی فکر پر ایک نظر	۱۷۷
	تحریکِ سیکولرزم کے سوسالہ بانی دانشور کی کہانی	۱۸۹
	سندھ میں نظریاتی ودعوتی کام اور اس کے لئے صحیح حکمت عملی	۱۹۹

تعارف

زیر نظر کتاب ''وقت کا چیلنج ہمارا کردار اور ذمہ داریاں'' راقم سطور کے اہم مضامین کے مجموعہ پر مشتمل ہے۔

ان مضامین میں ملت اسلامیہ کو درپیش وقت کے سب سے بڑے چیلنج مادیت پرستی کی عالمی قوتوں، جدید مادی نظریات اور مادی تہذیب کے علمبرداروں اور عالمی ساہوکار کی طرف سے درپیش چیلنج، مسلم معاشرے کی نفس پرستی کی بنیاد پر تعمیر وتشکیل کی کاوشوں، تعلیمی وتربیتی نظام کی تباہی، خانقاہی نظام میں پیدا ہونے والی خرابیوں، اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے کام کرنے والی تحریکوں کے فکر وکام پر سیر حاصل تجزیے، انقلاب فرانس وانقلاب روس کے پیدا کردہ فکری اثرات سے بلند ہوکر، حقیقی اسلامی تحریک کے صحیح اہداف وخطوط ونقوش کے تعیین، معاشرہ کو اخلاقی انارکی، نفسی قوتوں کی بڑھتی ہوئی پرستش سے روکنے کی صورت، دعوتی کام کے لئے بہتر سے بہتر حکمت عملی کی نشاندہی، عالمگیریت کے چیلنج سے عہدہ برآ ہونے کے لئے عقل کے بھرپور استعمال، جدید نظریات کے صحیح ادراک، مسلم ملت کے بارے میں عالمی کفر کی پالیسیوں اور حکمت عملی سے پوری طرح آشنائی، نئے دور کے قیامت خیز حالات میں دینی ومذہبی طبقات کو غور وفکر سے کام لے کر نئی حکمت عملی سے کام کرنے کی ضرورت، دل کی خوابیدہ صلاحیتوں کی بیداری، اللہ کے ساتھ والہانہ محبت کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی معنوی اور حقیقی زندگی کی یافت، مادی زندگی پر فدائیت کے نتیجہ میں معاشرہ میں حیوانوں کی طرح چھینا جھپٹی اور جانوروں کی طرح ایک دوسرے کو مار گرانے کی حرکتوں سے بچاؤ، گھروں اور خاندانوں کو مغربی طرز معاشرت کی تباہیوں سے حفاظت کی تدابیر، مادہ پرستی کے تیز طوفان میں ایمان ویقین میں استحکام کے ذریعہ چٹان کی طرح اس کے رخ کو موڑنے کی کاوشوں غرض کہ کتاب میں اس طرح کے بہت سارے مسائل پر وسعت فکری، دردمندی اور دل کی گہرائیوں سے گفتگو کرکے معاشرہ کے

ہر طبقہ کے افراد کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی گئی ہے۔

کتاب میں جدید اسلامی تحریکوں سے وابستہ افراد کے لئے یہ نکتہ پیش کیا گیا ہے کہ اللہ کی محبت کے اجزاء سے بہرہ وری اور دل کی صلاحیتوں کی بیداری کے بغیر اعلائے کلمتہ اللہ کی جدوجہد معنیٰ خیز ہو اور کارکنوں میں باہمی الفت ومحبت کی صورت پیدا ہو سکے، ممکن نہیں۔ اس لئے راہ محبت کو اہمیت دیئے بغیر چارہ کار نہیں۔ اقامت دین، اعلائے کلمتہ اللہ اور اسلامی حکومت کے لئے جدوجہد کا کام جتنا عظیم کام ہے، اخلاص، للّٰھیت، بے نفسی، ایمان ویقین کی گہرائیوں، اللہ کی محبت ومعرفت کے ذخیرہ کی اتنی زیادہ ضرورت درپیش ہے۔

خانقاہی نظام سے وابستہ بزرگوں سے درخواست کی گئی ہے کہ تصوف جو زہد، فقر، دنیا سے استغنا، توکل، قناعت، افراد معاشرہ کی دینی واخلاقی تربیت، اور ان کی نفسی قوتوں کی تہذیب جیسے عظیم کام کا ذریعہ اور اس کا مرکز رہا ہے۔ اور صدیوں تک اس نے مسلم معاشرہ کی تہذیب کے سلسلہ میں فیصلہ کن کردار ادا کیا ہے، وہ نئے دور کے چیلنج کو قبول کرتے ہوئے سلف صالحین کے اس تربیتی ادارہ کو اپنی ساری صلاحیتوں اور اس ادارہ سے وابستہ سارے اصولوں کی پابندی کے ساتھ تربیت کے اس کام کو جاری رکھیں، یہ ملت پر ان کا سب سے بڑا احسان ہوگا۔

پاکستانی ملت، عرصہ سے نت نئے بحرانوں سے دوچار ہورہی ہے۔ ایک بحران ختم نہیں ہوتا تو دوسرا شروع ہوتا ہے۔ یہ بحران ایسے ہیں، جس نے پاکستانی ملت کو دنیا بھر میں رسوا کر دیا ہے، اور اس کی اخلاقی اقدار اور قومی کردار کی ساکھ کو ختم کر دیا ہے۔

یہ سارے بحران اس لئے پیدا ہورہے ہیں کہ ہم نے اپنے پاکیزہ نظریے اور تہذیب سے بغاوت کی روش اختیار کرکے، خود کو غیروں کے سامنے فروخت کر دیا ہے۔ دنیا کی متاع قلیل کی خاطر اپنے نظریے اور اپنی تہذیب سے دستبرداری اختیار کرنا، اس کی جتنی بھی بڑی سزا ملے، وہ کم ہے۔

حالت یہ ہے کہ ہمارا تعلیمی نظام پرائمری سطح سے لے کر یونیورسٹیوں کی سطح تک عالمی سرمایہ دار اور بین الاقوامی یہودیت کی ایماء اور اس کی ہدایات کے تحت بنتا ہے اور

تیار ہوتا ہے۔ ہمارے ماہرین تعلیم اور حکمران اس سلسلہ میں بے حمیتی کا مظاہرہ کرکے ان کے مادہ پرست افکار کو تعلیم کا بنیادی حصہ بنانے اور اسلامی تہذیب کی ساری چیزیں ایک ایک کرکے نصاب تعلیم سے نکالنے کے معاملہ میں ذرا بھی حجاب محسوس نہیں کرتے۔

اس سلسلہ میں ہمارے ماہرین کی غیرت کا خاتمہ، سب سے بڑا المیہ ہے۔ یہ چیز ایسی ہے جو نظام تعلیم کے ذریعہ مادہ پرست اور نفس پرست قسم کے انسان پیدا کرنے کا موجب بن رہی ہے۔ ریاست اور معاشرہ کو نئے نئے المیوں اور بحرانوں سے بچانے کی کم سے کم صورت یہ تھی کہ افراد معاشرہ کی اخلاقی حِس کو بیدار کرنے اور انہیں اپنی پاکیزہ تہذیب سے وابستہ رکھنے کی طاقتور تحریک موجود ہوتی، جو غیر سیاسی سطح پر اپنا کام کرتی، لیکن بدقسمتی سے معاشرہ اس طرح کی طاقتور تحریک کو جنم دینے کی صلاحیت سے ہی قاصر ہو چکا ہے۔

معاشرہ میں دولت کا مقصود حیات بن جانا، یہ بیماری بھی ایسی ہے، جو ہلاکت خیز ہے، بالعموم دیکھا گیا ہے کہ جب دولت آتی ہے، بنگلہ بنتا ہے اور بڑی گاڑی آجاتی ہے تو دینی ومذہبی زندگی کی پامالی کا عمل شروع ہوتا ہے اور اخلاقی قدریں اور شرم وحیا رخصت ہونے لگتی ہے، سنگ دلی وقساوت قلبی آجاتی ہے، دولت پرستی اور دولت کو مقصود بنانے کا یہ نتیجہ ایسا ہے جو اس کا خاصہ ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کی اس آیت **فَلَا تُعْجِبْكَ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ** کی تشریح میں ایک مفسر نے بالکل بجا لکھا ہے:

''اس میں اہل ایمان کو اس بات سے ڈرایا گیا ہے کہ کہیں وہ اہل دنیا کے اموال اور سامان زینت کو مستحسن نہ سمجھیں اور اس کی وجہ سے آخرت کے عمل سے کہیں دور نہ ہوجائیں اور فکر آخرت کے حوالے سے حجابات میں مبتلا نہ ہوجائیں۔

زیر نظر کتاب میں اس طرح کے بیشتر مسائل پر بحث کرکے، ریاست کی درستگی اور معاشرے کی صحیح خطوط پر تعمیر کے سلسلہ میں اہم نکات پیش کئے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو قبولیت کا شرف عطا فرمائے اور ہم سب کے لئے نافع بنائے۔ (آمین)

۱۵ اگست ۲۰۱۵ء — **محمد موسیٰ بھٹو**

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

الحاد ولادینیت کا بڑھتا ہوا طوفان

اور کرنے کا کام

آج مسلم دنیا کو عالمی فکر سے جس قسم کا چیلنج درپیش ہے، وہ سیاسی، سائنسی اور ٹیکنالوجی غلبہ ہی کا چیلنج نہیں ہے، بلکہ یہ نظریاتی، تہذیبی اور فکری غلبہ کا بھی چیلنج ہے۔ بلکہ اس چیلنج کی نوعیت ہمہ گیر فکری وتہذیبی غلبہ کی ہے۔ آج عالمی فکر کی یہ چاہت ہے کہ دنیا میں مادی فکر کی سوچ کا غلبہ ہو، دنیا ہی کو سب کچھ سمجھ کر، اس دنیا کو خوبصورت بنانے کے لئے ساری ذہنی اور علمی توانائیاں صرف ہوں اور مادہ پرستانہ نقطہ نگاہ اور جنسی آزادی کی فکر اور خوشحال زندگی کے نظریات باقی سارے نظریات پر غالب ہوجائیں، چنانچہ مغرب کی یہ غالب فکر آج پوری دنیا کی فکر بن چکی ہے۔ عالم اسلام کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک کے کسی بھی شہر اور کسی بھی محلّہ میں آباد مسلمان سے گفتگو کی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کا مطمحہ نظر وہی ہے، جو اہل مغرب کا ہے۔ زندگی کی صلاحیتوں اور وقت کے استعمال اور فکر کا اصل ہدف مادی زندگی ہی ہے۔ مغربی تہذیب اور فکر کے غلبہ نے تقریبا ہر فرد کو اس بات کا حریص بنادیا ہے کہ جو کچھ حاصل ہونا ہے، وہ اس زندگی میں حاصل ہوجائے۔ دنیا کی لذتوں اور مادی حسن کی رعنائی سے دستبرداری اور سامانِ دنیا سے محرومی کے خوف نے ہر فرد کے احساسات کو اذیتناک بنا دیا ہے۔ یہ ساری صورتحال مغربی فکر کے غلبہ کا نتیجہ ہے۔ اس لئے مغربی فکر کی گمراہی کی نوعیت کو سمجھ کر اس فکر کے مقابلہ میں مسلم افراد کی صحتمند بنیادوں پر ذہن سازی کا کام سرانجام دینا اور اس کے لئے امت کے ذہین افراد کی صلاحیتوں کا صرف ہونا، یہ دورِ جدید کے چیلنج کا سب سے بڑا تقاضہ ہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا زیرِ نظر مقالہ اس سلسلہ میں دینی طبقات کے کام کے لئے بہتر ہدف کا تعین کرتا ہے، یہ تفصیلی مقالہ ہے، ہم یہاں اس کا خلاصہ پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ **(مرتب)**

اب کچھ عرصہ سے دنیائے اسلام کو ایک ایسے ارتداد سے سابقہ پیش آیا ہے، جس نے اس کے اس سرے سے اس سرے تک آفت مچائی ہے، یہ اپنی شدت وقوت اور وسعت عمق میں اب تک کی تمام ارتدادی تحریکوں سے بازی لے گیا ہے۔ کوئی ملک نہیں ہے، جو اس کی غارت گری سے بچا ہوا ہو۔ بلکہ ملک تو ملک، خاندانوں میں ایسے مشکل ہی سے تھوڑے بہت ہوں گے، جو اس کی دسترس سے محفوظ ہوں۔ یہ وہ ارتداد ہے جو شرقِ اسلامی پر یورپ کی سیاسی اور تہذیبی تاخت کے پیچھے پیچھے آیا ہے۔ یہ سب سے عظیم ارتداد ہے، جو عہدِ رسالت سے لے کر آج تک کی اسلامی تاریخ میں رونما ہوا ہے۔

شریعتِ اسلامی کی اصطلاح میں ''ارتداد'' کے کیا معنیٰ ہیں؟ ایک دین کے بدلے دوسرا دین اور ایک عقیدے کے بدلے دوسرا عقیدہ اختیار کرنا! رسول ﷺ جو تعلیمات لے کر آئے، جو کچھ ان سے تواتر سے منقول ہے اور جو کچھ اسلام میں قطعی طور پر ثابت ہے، اس سے انکار کرنا!! اور ایک مرتد کیا رویہ اختیار کرتا تھا؟ رسالتِ محمدی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کا انکار کرتا تھا اور مسیحیت، یہودیت یا برہمنیت کی طرف منتقل ہوجاتا تھا۔ یا الحاد کی راہ اپناتا اور وحی ورسالت اور آخرت سے منکر ہوتا تھا۔ یہ ارتداد کے وہ معنیٰ ہیں، جن سے پرانی دنیا یا پرانی سوسائٹی واقف تھی۔ ہر وہ شخص جو اپنا دین چھوڑتا تھا، اگر مثال کے طور پر نصرانی بن جاتا تو کلیسا میں داخل ہوتا یا ہیکل میں جاتا۔ یا اگر برہمنیت اختیار کرتا تو بُت خانہ کی راہ لیتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ یہ ارتداد سب پر روشن ہوجاتا تھا اور مرتد دور سے پہچان لیا جاتا تھا۔ اس کی طرف انگلیاں اٹھتی تھیں اور مسلمان اس شخص سے تمام امیدیں منقطع کر لیتے تھے۔ الحاصل عام طور پر کسی کا ارتداد کوئی راز نہیں ہوا کرتا تھا۔

یورپ نے مشرق میں وہ فلسفے پہنچائے، جو دین کی بنیادوں کے انکار پر مبنی تھے۔ جن کی بنیاد اس عالم میں کارفرما (مصرف) قوت کے انکار پر تھی۔ وہ باشعور قوت جو اس دنیا کو عدم سے وجود میں لائی، اور جس کے دستِ تصرف میں کائنات کی زمام کار ہے۔ (**الا لہ الخلق والامر**) (خبردار! اسی نے تخلیق کیا اور اسی کا حکم چلتا ہے)۔ وہ فلسفے جو عالم غیب، وحی، نبوت، شرائع شماویہ اور روحانی واخلاقی قدروں کے انکار پر مبنی ہیں۔ یہ ہے مغرب کے لائے ہوئے تمام فلسفوں کی مشترک بنیاد، جن میں کوئی علم الحیات اور ارتقاء کے مسائل سے بحث کرتا ہے۔ کسی کا تعلق اخلاق سے ہے، کسی کا محور علم النفس ہے۔ اور

کسی کا موضوع بحث سیاست واقتصاد۔ یہ فلسفے اپنے موضوعات والوں میں خواہ باہم کتنے ہی مختلف ہوں تاہم اس نقطے پر سب ملتے ہیں کہ انسان اور کائنات کو محض مادی نظر سے دیکھیں اور ان دونوں کے ظاہری احوال وافعال کی مادی توجیہہ کریں۔

یہ فلسفے مشرقی اسلامی معاشرے پر حملہ آور ہوئے اور اس کے باطن تک گھس گئے۔ یہ فلسفے سب سے بڑا دین ہیں جو تاریخ میں اسلام کے بعد پیدا ہوئے۔ سب سے بڑا دین اپنی وسعتِ اشاعت کے لحاظ سے، سب سے گہرا دین اپنی جڑوں کے لحاظ سے اور سب سے طاقتور دین دلوں اور دماغوں کو مسخر کرنے کے لحاظ سے۔ اسلامی ملکوں کا وہ طبقہ جو علم وفہم کے لحاظ سے ممتاز تھا، اس دین پر فریفتہ ہوگیا۔ اس نے اسے نہایت خوشگواری کے ساتھ حلق سے اتارا اور اطمینان کے ساتھ ہضم کر لیا۔ وہ اس دین کا ٹھیک اسی طرح پیرو بن گیا، جس طرح ایک مسلمان اسلام کا اور ایک مسیحی مسیحیت کا۔ حتیٰ کہ وہ اس پر جان دیتا ہے۔ اس کے شعائر کی عزت کرتا ہے۔ اس کے رہنماؤں اور داعیوں کی عظمت کا کلمہ پڑھتا، اپنے ادب اور تالیفات میں اس دین کی دعوت دیتا ہے اور جو دین، جو نظام اور جو طرزِ فکر اس کے معارض ہوتا ہے اس کی تحقیر کرتا ہے۔ اس دین کے ہر پیرو سے وہ اخوت کا رشتہ استوار کرتا ہے اور اس طرح یہ تمام افراد ایک امت، ایک خاندان اور ایک گروہ بن گئے ہیں۔

یہ نیا دین، اگرچہ اس کے پیرو اس کو ''دین'' کے نام دینے سے انکار کرتے ہیں۔ کیا ہے؟ کائنات کو وجود میں لانے والی اس علیم وخبیر ہستی کا انکار جو مالکِ تقدیر بھی ہے اور رہنمائے حیات بھی (الذی قدر فھدیٰ) حیات بعد الموت، حشر، جنت و دوزخ اور ثواب وعذاب کا انکار، نبوت و رسالت کا انکار۔ شرائع سماویہ اور حدودِ شرعیہ کا انکار۔ اور اس حقیقت کا انکار کہ اللہ نے اپنی تمام مخلوق پر اپنے عظیم تر رسول (خاتم الرسلؐ) کی اطاعت فرض کے ہے، اور ہدایت وسعادت کو اس کی پیروی میں منحصر کر دیا ہے اور اس بات کا انکار کہ اسلام وہ آخری اور دائمی پیغام ہے، جو دین ودنیا کی تمام سعادتوں کا کفیل ہے اور زندگی کا ایک نظام ہے جو سب سے اعلیٰ اور افضل ہے اور وہی وہ دین ہے، جس کے علاوہ کوئی دین اللہ کے یہاں مقبول نہیں اور جس کے بغیر دنیا کی فلاح وسعادت کا کوئی امکان نہیں، اور اس کا انکار کہ دنیا انسان کے لئے پیدا کی گئی ہے اور انسان اللہ کے لئے۔

آج جس طبقہ کے ہاتھ میں اکثر ممالک اسلامیہ کی زمامِ حیات ہے، وہ اسی دین کا پیرو ہے۔ اگرچہ یہ سب پختگیٔ ایمان اور سرگرمی عمل میں ایک درجہ کے نہ ہوں۔ ہاں اس میں کوئی شک نہیں کہ اس طبقہ میں ایسے افراد بھی ہیں، جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور اسلام کی پیروی کرتے ہیں، مگر اس طبقہ کا وہ وصف جو افسوس ہے کہ، اس پر غالب ہوگیا ہے اور اس کے اکثر اور مقتدر افراد کا دین یہی مادہ پرستی اور زندگی کا مغربی فلسفہ ہے، جو الحاد پر مبنی ہے۔

میں پھر کہتا ہوں کہ یہ وہ ارتداد ہے، جس نے عالمِ اسلام کو اس سرے سے اس سرے تک تاراج کیا ہے، گھر گھر اور خاندان خاندان پر اس کا حملہ ہوا ہے۔ یونیورسٹیوں، کالجوں، اسکولوں اور اداروں سب پر اس کی یورش ہوئی ہے، مشکل ہی سے کوئی ایسا خوش قسمت خاندان ہوگا، جس میں اس دین کا کوئی پیروکار، پرستار اور عقیدت گذار موجود نہ ہو۔ تم جب ذرا اس سے تنہائی میں باتیں کروگے، کچھ چھیڑو گے اور اندر کی بات اگلواؤ گے تو یا وہ ایمان باللہ سے محروم ہوگا، یا ایمان بالیوم الآخر سے خالی ہوگا۔ یا رسول اللہ ﷺ پر ایمان نہ رکھتا ہوگا یا قرآن کو ایک معجزہ وابدی کتاب اور دستورِ حیات نہ مانتا ہوگا۔ اور ان میں سب سے غنیمت وہ ہوگا، جو کہے گا کہ میں اس قسم کے مسائل پر غور نہیں کرتا اور ان کو کوئی بڑی اہمیت نہیں دیتا۔

بلاشبہ یہ ارتداد ہے۔ لیکن اس نے مسلمانوں کی توجہ اپنی طرف نہیں کھینچی، کیوں؟ اس لئے کہ اس ارتداد کا مارا ہوا کلیسا یا ہیکل میں نہیں جاتا۔ اور نہ اپنے ارتداد اور تبدیلی مذہب کا اعلان کرتا ہے۔ نہ معاشرہ اس پر چونکتا ہے کہ احتساب وعتاب کی صورت پیش آئے اور فصل وانقطاع کا معاملہ درپیش ہو۔ پس وہ بدستور اسی سوسائٹی اور معاشرہ میں رہتا ہے، اپنے تمام حقوق حاصل کرتا ہے، بلکہ معاشرہ پر حاوی ہونے تک کا موقع اس کو مل جاتا ہے۔ یہ عالم اسلامی کا نہایت اہم مسئلہ اور بڑا قابلِ فکر معاملہ ہے، ارتداد پھیلتا ہے، اسلامی معاشرہ پر حملہ آور ہوتا ہے اور کوئی اس پر چونکتا تک نہیں۔ علماء امت اور رجالِ دین اس سے کوئی پریشانی اور بے چینی نہیں محسوس کرتے، پہلے جب کوئی پیچیدہ مسئلہ پیش آتا تھا تو لوگ اس کو حل کرنے کے لئے حضرت علیؓ کو یاد کرتے تھے۔ ایسے موقع پر ضرب المثل تھی ''قضیۃ ولا ابا حسن لہا'' اس ارتداد کے موقع پر بے ساختہ حضرت ابو بکر کی شاہانِ

عزیمت یاد آتی ہے اور کہنا پڑتا ہے ''قضیۃ ولا ابا بکر لہا''۔

لیکن یاد رکھیئے، یہ مسئلہ جنگ نہیں چاہتا اور نہ اس پر رائے عامہ کو بھڑکانا درست ہے۔ یہ برافروختگی اور سختی سے حل نہیں ہوسکتا، بلکہ سختی الٹا نقصان پہنچائے گی اور فتنہ کو اور بھڑکادے گی۔ اسلام خفیہ تحقیقاتی عدالتوں سے آشنا نہیں ہے، اور نہ وہ جبر وظلم کا روادار ہے۔ یہ معاملہ حکمت اور صبر وتحمل چاہتا ہے اور اس سے نپٹنے کے لئے دردفکر اور گہرے مطالعہ کی ضرورت ہے۔''

یہ فلسفے مغربی فاتحین کے جلو میں آئے اور مشرقی عقل وطبیعت نے فاتحین کے ساتھ ساتھ ان کی اطاعت بھی قبول کر لی۔ مشرق کے تعلیم یافتہ طبقہ نے بھی ان کو قبول کیا؟ ان لوگوں میں وہ بھی تھے، جنہوں نے سمجھ کر قبول کیا تھا، مگر وہ کم تھے، زیادہ تر وہ تھے، جو ذرا بھی نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن معتقد اور مومن سب، اور سب ایک سرے سے مسحور، ان فلسفوں پر ایمان لانا ہی عقل وخرد کا معیار بن گیا اور اس کو روشن خیالوں کا شعار سمجھا جانے لگا۔

اس طرح یہ الحاد وارتداد اسلامی ماحول اور اسلامی دائروں میں بغیر کسی شورش اور کشمکش کے پھیل گیا۔ نہ باپ اس انقلاب پر چونکے، نہ اساتذہ اور مربیوں کو خبر ہوئی اور نہ غیرت ایمانی رکھنے والوں کو کوئی جنبش ہوئی، اس لئے کہ یہ ایک خاموش انقلاب تھا۔ اس الحاد وارتداد کو اختیار کرنے والے کسی کلیسا میں جاکر نہیں کھڑے ہوئے۔ نہ کسی معبد میں داخل ہوئے، نہ کسی بت کے آگے انہوں نے ڈنڈوت کی۔ اور نہ کسی استھان پر جا کر قربانی پیش کی اگلے دور میں یہی سب علامات تھیں، جن سے کفر وارتداد اور زندقہ کا علم ہوتا تھا۔

اگلے مرتدین اسلامی سوسائٹی کو خیر باد کہہ کر اس سوسائٹی سے منسلک ہوجایا کرتے تھے، جس کا دین انہوں نے اختیار کیا ہوتا تھا۔ اور اپنے عقیدے کی تبدیلی کا صراحت اور جرأت کے ساتھ اعلان کردیتے تھے۔ پھر جو کچھ نئے مذہب کی راہ میں انہیں برداشت کرنا پڑتا تھا، برداشت کرتے تھے، انہیں اس پر اصرار نہیں ہوتا تھا کہ پرانی سوسائٹی میں جو حقوق اور منافع انہیں حاصل تھے، ان کو محفوظ رکھنے کے لئے اس سوسائٹی سے چپکے رہیں لیکن آج جو لوگ دینِ اسلام سے اپنا تعلق منقطع کرتے ہیں، وہ اس پر تیار نہیں ہوتے کہ اسلامی سوسائٹی سے بھی اپنا رشتہ کاٹ لیں، حالانکہ دنیا بھر میں اسلامی معاشرہ ہی تنہا وہ معاشرہ ہے، جس کی تاسیس وترکیب عقیدے کی بنیاد پر ہوتی ہے، اور مخصوص عقائد کے بغیر

اسلامی معاشرہ وجود ہی میں نہیں آتا۔ لیکن یہ نئے مرتدین اصرار کرتے ہیں کہ اس معاشرہ کے نام پر فوائد حاصل کرتے ہوئے اپنی جگہوں پر جمے رہیں اور اسلام کے بخشے ہوئے تمام حقوق سے متمتع ہوتے رہیں۔ یہ ایک نرالی صورتحال ہے، جس سے اسلام کی تاریخ کو کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا۔

اس صورتحال کا ہمیں ہمت واستقلال اور حکمت ودانائی کے ساتھ مقابلہ کرنا ہے۔ دنیائے اسلام پر آج ایک دینی، فکری اور تہذیبی ارتداد کی سخت مصیبت آئی ہوئی ہے۔ یہ مصیبت ان تمام لوگوں کے غور وفکر کا موضوع بننی چاہئے، جو اسلام کا درد رکھتے ہیں۔ آج ہر اسلامی ملک کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کا حال یہ ہے کہ اعتقاد وایمان کا سرشتہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ چکا ہے۔ اخلاقی بندشیں وہ توڑ کر پھینک چکا ہے۔ اندازِ فکر اس کا سرتا سر مادی ہوچکا ہے اور سیاست میں اس نے لادینیت کا نظریہ اپنا لیا ہے۔ اگر ''اکثر'' کا لفظ بولتے ہوئے مجھے خوف بھی ہو تو میں ضرور کہوں گا کہ ان میں بہت سے ایسے ہیں، جو اسلام پر ایک عقیدے اور ایک نظام کی طرح ایمان نہیں رکھتے۔ اور مسلمان عوام باوجود یہ کہ ان میں خیر وصلاح کے تمام جوہر موجود ہیں۔ اور وہ اپنی طبیعت سے انسانیت کا صالح ترین گروہ ہیں، اس طبقہ کی علمی بالاتری، ذہنی تفوق اور اثر ونفوذ کی بنا پر اس کے ماتحت اور مطیع ہیں۔

یہ ہے اجمال کے پیرایہ میں آج کے عالم اسلامی کی دینی اور اعتقادی تصویر! اس تصویر میں جو کچھ نظر آتا ہے، میرے نزدیک یہ جاہلیت کی ایک موج ہے، جو اسلام کا سارا سرمایہ بہائے لیے جارہی ہے۔ دنیائے اسلام کو اپنی پوری تاریخ میں اس سے زیادہ سرکش موج سے سابقہ نہیں پڑا ہے، نہ اس جیسی طاقتور مخالف موج کا سامنا عالمِ اسلامی کو کبھی ہوا ہے۔ اور پھر اس کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اس کی ہلاکت خیزیوں پر چونکنے والے کم اور وہ تو کم سے بھی کم تر ہیں، جو سب کچھ چھوڑ چھاڑ اور اپنی ساری قوتوں کا سرمایہ لئے اس کے مقابلہ پر ڈٹ گئے ہوں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ماضی میں یونانی فلسفہ کے اثر سے جونہی الحاد زندقہ پھیلنا شروع ہوا، فوراً ایسی ہستیاں سامنے آکھڑی ہوئیں، جنہوں نے اپنے علمی تبحر، عظیم عقلیت، نادرۂ روزگار ذکاوت اور قوی شخصیت کے سارے ہتھیاروں سے اس کے خلاف جنگ کی۔ ایسے ہی باطنیت اور ملاحدہ کی جماعت کا ظہور ہوا تو اس کے مقابلہ میں بھی علم وحکمت اور دلیل وبرہان کی تلواریں لے کر اسلام کے سرفروش میدان میں

آ کودے۔ چنانچہ اسلام ان بروقت نصرتوں کی بنا پر علمی اور عقلی اعتبار سے ایسی مضبوط پوزیشن میں رہا کہ مخالفت کی موجیں اٹھتیں اور سرٹکرا کر واپس چلی جاتیں۔ سیلاب کے ریلے آتے اور بے اثر ہوکر گذر جاتے۔

آج دنیائے اسلام کا اولین مسئلہ اخلاقی انحطاط کا نہیں ہے۔ اور نہ عبادات ونوافل میں تساہل، ترک شعائر اور تقلید اغیار، آج کے بنیادی مسائل ہیں۔ بے شک یہ مسائل نہایت اہم ہیں اور سعی توجہ کے پورے مستحق۔ لیکن عالمِ اسلامی کا وہ مسئلہ جو طوفان بن کر کھڑا ہوا ہے اور اسلام کی ہستی اس کی زد میں آ گئی ہے، کفر وایمان کا مسئلہ ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اسلامی دنیا اسلام پر قائم رہے گی یا اس کا قلاوہ اپنی گردن سے اتار دیگی؟ اسلامی دنیا میں آج ایک معرکہ برپا ہے، جس میں ایک طرف مغرب کا فلسفۂ لادینیت ہے، دوسری طرف اسلام۔ خدا کا آخری پیغام! ایک طرف مادیت ہے اور دوسری طرف آسمانی شریعت! میں سمجھتا ہوں کہ یہ دین اور لادینیت کا آخری معرکہ ہے۔ اور اس کے بعد دنیا دونوں میں سے کسی ایک رخ کو اختیار کر لے گی۔

آج کا جہاد، آج کی خلافتِ نبوت اور آج کی سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ لادینیت کی اس طوفانی موج کا مقابلہ کیا جائے۔ نہیں! بلکہ آگے بڑھ کر اس کے قلب ومرکز پر حملہ کیا جائے۔ جو عالم اسلام کی جڑیں کھود رہی ہے۔ آج کی خلافتِ نبوت یہ ہے کہ امت کے نوجوان اور تعلیم یافتہ طبقہ میں اسلام کے اساسات وعقائد، اس کے نظام وحقائق اور رسالتِ محمدی پر وہ اعتماد واپس لایا جائے، جس کا رشتہ اس طبقہ کے ہاتھ سے چھوٹ چکا ہے، آج کی سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ اس فکری اضطراب اور ان نفسیاتی الجھنوں کا علاج بہم پہنچایا جائے، جن میں آج کا تعلیم یافتہ نوجوان بری طرح گرفتار ہے، اور اس کی عقلیت اور علمی ذہن کو اسلام پر پوری طرح مطمئن کر دیا جائے۔ آج کا سب سے بڑا جہاد یہ ہے کہ جاہلیت کے وہ بنیادی افکار جو دل ودماغ میں گھر کئے ہیں، ان سے علم اور عقل کے میدانوں میں نبرد آزمائی کی جائے، یہاں تک کہ اسلام کے اصول ومبادی پورے ایمانی جذبات کے ساتھ ان کی جگہ لے لیں!

کامل ایک صدی گذرتی ہے کہ یورپ ہمارے نوجوان اور ذہین طبقے پر چھاپے مارہا رہا ہے۔ شک والحاد، نفاق وارتیاوارتداد کا ایک طوفان ہے، جو اس نے ہمارے دل

ودماغ میں برپا کر رکھا ہے۔ غیبی اور ایمانی حقائق پر اعتماد متزلزل ہورہا ہے۔ اور سیاست واقتصاد کے مادہ پرستانہ نظریات اس جگہ پر قابض ہورہے ہیں۔ کامل ایک صدی سے یہ اکھیڑ پچھاڑ ہورہی ہے۔ لیکن ہمیں اس کے مقابلہ کی کوئی فکر نہیں ہوئی۔ ہم اپنے اسلاف کی علمی میراث پر تکیہ کئے بیٹھے رہے۔ اور اس کی کوئی پروانہیں کی کہ وقت کے تقاضوں کے مطابق اس ترکہ پر اضافے کرنا بھی ہمارا فرض ہے۔ ہمیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہوئی کہ یورپ کے ان فلسفوں کو سمجھیں اور پھر ان کا علمی محاسبہ بلکہ سرجنوں کی طرح ان کا پوسٹ مارٹم کریں۔ ہمارا سارا وقت سطحی بحثوں کی نذر ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ اس صدی کے آخر میں ہمارے سامنے، گویا یکا یک، یہ منظر آیا کہ ایمان وعقیدہ کی دنیا متزلزل ہے اور ایک ایسی نسل تیار ہوکر برسراقتدار آچکی ہے، جو نہ اسلام کے عقائد ومبادی پر ایمان رکھتی ہے، نہ اسلامی جذبات اور اسلامی حمیت رکھتی ہے۔ اور نہ اس کا کوئی علاقہ اپنی مؤمن ومسلم قوم سے اس کے سوا ہے کہ قومیت کے خانہ میں اس کا شمار بھی مسلمانوں میں ہوتا ہے۔ یا اگر کچھ تعلق ہے تو وہ محض سیاسی مصالح کی حد تک! بس اس کے سوا کوئی تعلق نہیں! اور اب اس سے بھی آگے بڑھ کر صورتحال یہ ہے کہ یہ لادینی مزاج اور لادینی اندازِ فکر ادب وثقافت اور صحافت وسیاست کے راستہ سے جمہور تک پہنچ چکا ہے۔ اور مسلمان قوموں کے سر پر عمومی پیمانہ کی لادینیت کا خطرہ منڈلا رہا ہے۔ خاکم بدہن! وقت کی رفتار وہ وقت قریب لارہی ہے کہ اسلام کو زندگی کے میدان سے قطعاً بے دخل کر کے رکھدیا جائے۔

اور اس پر یہ اضافہ کرتا ہوں کہ آج ایسے علمی ادارے اور اکیڈمیاں بھی عالمِ اسلام کی بڑی اہم ضرورت ہیں، جو ایسا طاقتور نیا اسلامی ادب پیدا کریں، جو ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو دوبارہ کھینچ کر اسلام۔ وسیع معنیٰ میں اسلام کی طرف لا سکے۔ جو انہیں مغرب کے ان فلسفوں کو ذہنی غلامی سے نجات دلا سکے، جنہیں ان میں سے کچھ نے سوچ سمجھ کر اور زیادہ تر نے محض وقت کی ہوا سے متاثر ہوکر حرز جان بنا لیا ہے۔ وہ ادب جو ان کے دماغوں میں ازسرنو اسلام کی بنیادیں اٹھائے اور قلب وروح کی غذا بنے۔ اس کام کے لئے عالمِ اسلامی کے ہر گوشہ میں آج ایسے ارباب عزیمت درکار ہیں، جو معرکہ کے اختتام تک اس علمی محاذ پر جمے رہیں۔

اقامت دین اور نظام کی تبدیلی کی جدوجہد اس کی اہمیت اور صحیح صورت

اقامت دین کی جدوجہد ایک ایسا فریضہ ہے، جس کے، مسلمان کی حیثیت سے ہم ذمہ دار ہیں۔ اقامت دین کا مطلب اللہ کے دین کو اپنی ذات پر جاری وساری کرنے کے لئے کوشاں ہونا، افراد معاشرہ کو اقامت دین کی طرف لانا، یعنی انہیں اس بات کی دعوت دینا کہ وہ اپنی زندگیوں میں دین کی تعلیمات کو نافذ کریں اور منکر کی ہر صورت سے بچیں۔ اقامت دین کی سب سے آخری صورت ریاستی نظام کو اسلامی شریعت کے مطابق بنانے کی کاوشوں کا ہونا ہے۔

جس ملک میں ہم رہتے ہیں، وہ اسلام کی خاطر بنا ہے، وہاں کے ریاستی نظام کا طاغوت کی بنیاد پر قائم ہونا، اللہ کے عذاب کو دعوت دینے کے مترادف ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ حکومتی وریاستی سطح پر اسلام سے فرار، بلکہ اس سے بغاوت کی بنا پر وطن عزیز نئے نئے بحرانوں، المیوں، تباہ کاریوں، اور خون وخرابہ سے دوچار ہوتا رہا ہے اور قومیتی تحریکوں اور مسلکی وگروہی تعصّبات کی وجہ سے لوگوں کی جان ومال اور عزت وآبرو خطرے سے دوچار رہتی ہے۔ نیم سرمایہ دارانہ نظام کے غلبہ کی وجہ سے لوگ بھوکوں مر رہے ہیں، یہ صورتحال نصف صدی سے جاری ہے۔

یہ سب ریاستی سطح پر دین کی تعلیمات وقوانین کو جاری وساری کرنے کی روش سے انکار اور نظام تعلیم کی طاغوت کی بنیاد پر تشکیل کا لازمی نتیجہ ہے۔

اقامت دین اور غلبہ دین کی جدوجہد اس لئے بھی ضروری ہے، تاکہ مادیت کے بتوں کی پرستش اور خالص مادی نظام کی کی تباہ کاریوں سے انسانیت کو نجات دلانے کی بہتر صورت پیدا ہو سکے اور ان کے سامنے ایک ایسی مثالی اسلامی ریاست کا عملی نقشہ موجود ہو، جسے دیکھکر وہ اپنے ریاستی نظام کے مفاسد سے بچکر، پاکیزہ اسلامی نظام کے سایہ میں

پناہ لے سکیں، اس طرح معاشی، معاشرتی وعملی زندگی میں انسانیت کے لئے قیامت خیز حالات اور حیوانی زندگی کے مظاہر سے بچاؤ اور اس سے نجات کی صورت پیدا ہو سکے۔

اسلامی نظام کے لئے جدوجہد کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ اسلام کے متعدد قوانین وتعلیمات ایسی ہے کہ ریاست کی اسلامی خطوط پر تشکیل کے بغیر ان پر عمل پیرا ہونا عملا نہ صرف دشوار ہے، بلکہ ناممکن ہے۔ اس طرح مسلمان کی حیثیت سے اسلام کے متعدد قوانین پر عمل کرنے کی سعادت سے ہم محروم ہیں۔

ہماری معاشی سرگرمیاں، ہماری تعلیمی پالیسیاں، ہمارے انتظامی ڈھانچہ، ہمارے سیاسی نظام اور عدالتی نظام میں پیدا شدہ بہت ساری خرابیوں کا بنیادی سبب یہی ہے کہ ہماری ریاست، اسلامی نظام کے نفاذ کے سلسلہ میں بغاوت کی روش پر قائم ہے، اور عالمی طاغوت کی پرستش کی راہ پر گامزن ہو کر، اس نے ریاست کے سارے نظام کو اسی بنیاد پر تشکیل دیا ہے۔ مغربی دنیا جو مادیت کے تشکیل دیئے ہوئے نظام سے تنگ ہے، سودی نظام کی تباہ کاریوں، دولت کے خاص طبقہ کی طرف ارتکاز، خودکشی، بدامنی، خاندانی نظام کی تباہی، ذہنی اور روحانی طور پر بے شمار مسائل سے دوچار ہے، وہ اپنی رہنمائی کرنے سے قاصر ہے تو ان کے مادی نظام سے ہمارے بحرانوں میں کمی کیسے واقع ہوسکتی ہے۔

اسلامی نظام کے غلبہ کا کام ایسا ہے، جس سے اسلام کے نصب العینی اہداف کے بہت سارے اجزا وابستہ ہیں، نظام کی تبدیلی کے بغیر ہم نہ تو اسلام پر پوری طرح عمل کر سکتے ہیں اور نہ ہی انسانیت پر اسلام کے حوالے سے اتمام حجت کی صورت پیدا ہوسکتی ہے۔

یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ ہمارا ملک اسلامی نظام کے غلبہ کی طاقتور اسلامی تحریک سے محروم ہے۔ ہزاروں لاکھوں علماء کرام اور بے شمار دینی مدارس کی موجودگی میں ریاستی سطح پر غلبۂ اسلام کی تحریک کا طاقتور نہ ہونا، یہ ہمارے ملی بحرانوں کو تیز سے تیز تر کرنے کا ذریعہ بن رہا ہے۔

جب تک معاشرہ میں ریاستی نظام کی اسلامی بنیادوں پر تشکیل کی کوئی طاقتور تحریک سامنے نہیں آتی، تب تک ہمارے لئے کرنے کا حقیقی کام یہ ہے کہ ہم اپنی ذات پر

اقامت دین کو جاری وساری کرنے کے لئے کوشاں ہوں۔ اس کے ساتھ ہی معاشرہ میں بھی خود احتسابی کی تحریک کو طاقتور بنا کر افراد معاشرہ کو ہر منکر سے بچانے اور ہر معروف پر عمل کرنے پر تیار کرنے کی جدوجہد کریں۔

حقیقت یہ ہے کہ غلبہ دین اور اقامت دین کی جدوجہد کی اصل ترتیب صحیح نقشہ اور بہتر حکمت عملی یہی ہے۔ جو معاشرہ مادہ پرستی اور نفس پرستی کے چنگل میں مبتلا ہو، جہاں نفسا نفسی کا ماحول غالب ہو، چھینا جھپٹی کی فضا موجود ہو، اور جہاں اپنی ذمہ داریوں وفرائض کا احساس مفقود ہو اور دولت ہی مقصود زندگی بن چکی ہے۔ اس معاشرہ میں اقامت دین کی اصل ترتیب یہی ہے، جس کا ذکر کیا گیا۔

اس ترتیب سے ہٹ کر، ریاستی سطح پر اقامت دین کے لئے مصنوعی طریقے اختیار کرنا اور سیاسی جماعت قائم کرکے، اس کے ذریعہ اس راہ پر گامزن ہونا، خطرات سے خالی نہیں، اس لئے کہ اس سے نہ تو اقامت دین کا کام کرنے والے افراد کی اپنی تربیت وتزکیے کی صورت پیدا ہوگی اور نہ ہی اسلامی بنیادوں پر معاشرہ کی تعمیر وتشکیل کا کام ہوسکے گا۔

اس طرح کی تحریکیں جو سیاست میں کام کو ناگزیر سمجھتی ہیں، وہ بھلی اس شعبہ میں بھی کام کریں، لیکن انہیں دعوتی، علمی، تحقیقی اور تعلیمی وتربیتی شعبوں کو زیادہ سے زیادہ مستحکم کرنے کی طرف توجہ دینا چاہئے، تاکہ دینی اعتبار سے معاشرہ کے بڑھتے ہوئے زوال کو روکا جا سکے اور معاشرہ سے اسلامی تحریک کو مضبوط سیرت وکردار کے افراد کافی مقدار میں ملنے کی صورتیں پیدا ہوتی رہیں۔

اس طرح کے دعوتی، تربیتی وعلمی کاموں کو فیصلہ کن اہمیت دیئے بغیر محض سیاسی تبدیلی میں توانائیاں خرچ کرنے سے ریاستی سطح پر اقامت دین کے غلبہ کی صورت کا پیدا ہونا ناممکن ہے۔ اس نکتہ کے فہم سے ہی اسلامی تنظیم وتحریک آنے والے بیس پچیس سال میں اس پوزیشن میں ہوسکتی ہے کہ وہ بڑی تعداد میں معاشرہ کے ذہین وباصلاحیت افراد کو اپنے قریب لاکر، ان کی تربیت کرسکے، اور ان کے ذریعہ معاشرہ کو ایک حد تک بدل کر افرادِ معاشرہ کی مدد سے ریاستی نظام میں صحتمند بنیادوں پر تبدیلی کا کام کر سکے۔

جو قومیں، جماعتیں وتنظیمیں اپنے تجربات ومشاہدات اور زمانہ کے تجربات سے

استفادہ کرکے، نئی حکمت عملی کے ساتھ کام کے لئے آمادہ نہیں ہوتی، اور اپنے بڑوں کی اپنے میں اختیار کردہ حکمت عملی کو حرف آخر سمجھکر اسی پر گامزن رہتی ہیں، قدرت کا اصول ہے کہ ایسی جماعتیں زمانہ کے چیلنج کا مقابلہ کرنے سے قاصر رہ جاتی ہے۔ اس طرح وہ نئے حالات میں اپنی افادیت کو قائم وبرقرار رکھنے میں ناکام ثابت ہوتی ہیں۔ قوموں اور جماعتوں کی تاریخ اس طرح کے جمودی رویوں کے نتائج وثمرات سے بھری ہوئی ہیں۔

خوش نصیب ہیں وہ افراد جو اپنی ذات پر اسلامی شریعت کو لاگو کرنے، صبغۃ اللہ (اللہ کے رنگ کو) غالب کرنے اور معاشرہ میں اس دعوتی کام کو فروغ دینے کے لئے کوشاں ہیں۔ وہ اقامت دین کے آخری سطح کے کام کو فی الوقت کرنے کے لئے نہ تو متفکر ہیں اور نہ ہی وہ اللہ کی طرف سے اس کے ذمہ دار ہیں، اس لئے کہ ریاستی سطح پر دین کے غلبہ کے کام کی ذمہ داری اس معاشرہ پر عائد ہوتی ہے، جو قابل ذکر حد تک اسلام سے ہمہ آہنگ ہو چکا ہو اور جس معاشرہ میں بُرائی پھیلنے سے پہلے ہی اسے نچلی سطح پر روکنے کی قوت واستعداد موجود ہو۔

عالمی اسلامی دعوت کا کام

عالمگیریت کے پس منظر میں

آج ہم جس معاشرہ میں رہ رہے ہیں، وہ عالمی سرمایہ دار کا پیدا وار معاشرہ ہے، پرنٹ میڈیا ہو یا الیکٹرانک میڈیا، وہ مکمل طور پر اس کے قبضہ میں ہے، جدید نوعیت کی ٹیکنالوجی اور صنعت وکاروبار اس کے ہاتھ میں ہے۔معیشت پر قبضہ ہے۔

افراد کی تربیت اور ذہن سازی کے ادارے اسی کے خطوط پر بنائے ہوئے ہیں۔

سرمایہ دار کی ضروریات نے معاشرہ کونفس پرستی اور مادیت پرستی کی ہولناک صورت دیدی ہے۔ چونکہ دین ومذہب اور پاکیزہ اخلاقی قدریں سرمایہ دار کی پیداواری چیزوں اور سرمایہ داریت کی راہ میں دکاوٹ ہیں، اس لئے دین ومذہب کو مٹائے بغیر سرمایہ داریت اور عالمگیریت کوفروغ ملنا ممکن نہیں۔ چنانچہ عالمی سرمایہ دار نے مادی نظریات کوفروغ دے کر انسانیت کے حیوانی وجبلی قوتوں کو مشتعل کر دیا ہے اور مادیت پرستی کی تحریکوں نے انسانیت کے روحانی وجود کو کمزور کرکے اسے ہولناک روحانی، اخلاقی اور نفسیاتی بحران میں مبتلا کر دیا ہے سرمایہ دار کی اس انسانیت دشمن کردار کا مقابلہ دین حق کے دعوتی کام کے ذریعہ ہی ہوسکتا ہے۔ اسی کی دوسری کوئی صورت موجود نہیں ہے۔

زیرنظر مضمون میں اس موضوع پر یعنی اسلام کے دعوتی کام کے کچھ پہلوؤں پر گفتگو کرنے کی کوشش کی گئی ہے اللہ نے توفیق دی تو موضوع کے مزید پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائے گی ۔ (محمد موسیٰ بھٹو)

معاشرہ کو اسلامی اعتبار سے سنبھالنا اور دین پر قائم رکھنے کے لئے کوشاں ہونا، یہ

دعوتی کام ایسا ہے جو ہر دور میں اہم رہا ہے، اور اسلام کے اہداف میں شامل رہا ہے۔لیکن موجودہ دور میں اس کام کی اہمیت غیرمعمولی طور پر بڑھ گئی ہے، اس لئے کہ مادیت پرستی کی ہمہ گیرلہروں نے افراد معاشرہ کے ایمان ویقین کو زیر وزبر کردیا ہے اور آخرت کے مقابلہ میں دنیا کے مفادات کوترجیح دینے کے رجحانات ومیلانات کو غالب کردیا ہے۔

جو امت، دنیا کی دوسری ملتوں کے لئے دین کے اتمام حجت کا ذریعہ ہو، اس امت کی عظیم اکثریت اگر خودنفس پرستی اور عالمی طاغوت کے زیراثر ہوتو اس صورت میں اسلامی دعوت کے فروغ کی صورت کیا ہوسکتی ہے؟

چونکہ اللہ نے آخر وقت تک دین کے قائم رکھنے اور دعوتی کام کرنے والے افراد کے موجود ہونے کی ذمہ داری لی ہے۔ اس لئے مادیت پرستی کی طوفان خیزیوں کے باوجود اسلامی دعوت کام کام کرنے والے افراد موجود ہیں اور وہ اپنی صلاحیت وبساط کے مطابق کام کررہے ہیں۔ یہ کام علمائے اہل سنت اور دینی مدارس کے ذمہ داروں اور اہل تصوف کی طرف سے ہو یا تبلیغی، جماعت کی طرف سے، جماعت اسلامی کی طرف سے ہو یا اہل حدیث کی طرف سے یہ کام قابل قدر رہے، اس کام کی اہمیت کوکم کرنا ناقدر شناسی ہوگی۔

سیلاب جب گھروں، محلوں اور شہروں کی تباہی کا ذریعہ بن رہا ہوتو اس وقت اس کی روک تھام کی کوشش کرنا تحسین کے قابل ہے نہ کہ لائق تنقید۔

تاہم دعوت کے کام کے لوازمات اور اس کے تقاضوں کوسمجھکر اس کام کوسرانجام دینا ضروری ہے، اس لئے بھی تاکہ اس کام میں اللہ کی مدد ونصرت کی شمولیت یقینی ہوجائے اور اس لئے بھی تاکہ دعوت کا کام زیادہ سے زیادہ مؤثر ہو سکے، اور باطل تحریکوں، اور باطل فکر کے مقابلہ کی بہتر صورت پیدا ہو سکے۔

ہماری نظر میں معاشرہ کو اسلامی نقطہ نگاہ سے سنبھالنے کے لئے اسلامی تحریک کے داعیوں کو جن چیزوں کی ضرورت لاحق ہے اور دعوت کا کام جن صلاحیتوں وخوبیوں وصفات کا متقاضی ہے۔ وہ درج ذیل چیزیں ہیں۔

سب سے پہلی چیز دین کے صحیح فہم کا ہونا ضروری ہے، دین کا یہ صحیح فہم قرآن وسنت اور سیرت پاک کی روشنی میں ہی حاصل ہوسکتا ہے، اس کے لئے قرآن وسنت اور سیرت پاک پر گہری نظر کے بغیر دعوتی کام کی تدریج، تربیت، اس کے سلیقہ، اور اس کام کی

حکمت عملیوں سے آشنائی مشکل ہے۔ داعیوں کے لئے اس سلسلہ میں قرآن وحدیث اور سیرت کو بنیاد بنائے بغیر ایک قوم بھی آگے بڑھنا نہ صرف دشوار ہے، بلکہ ابتلا وآزمائش کا موجب ہے اور اسلامی دعوت کے نام پر امت میں نئی نئی دعوتوں وتحریکوں کی ذریعہ بن سکتا ہے۔ قرآن وحدیث اور سیرت پاک ہی وہ اصل کسوٹی ہے، جو داعی کے کام کے لئے زندگی کے ہر موڑ پر اس کے لئے روشنی اور رہنمائی کا کام سرانجام دیتی ہے اور داعی اسی روشنی میں دعوتی کام کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو ہمت، حوصلہ، صبر اور حکمت وبصیرت سے دور کرنے کی صلاحیتوں سے بہرہ ور ہوتا ہے۔

دوسری بنیادی چیز داعی کا دعوت کے کام کے لئے اضطراب، درد اور غم ہے، یہ درد وغم ازخود اس کی شخصیت کو دوسروں کے لئے سراپا سوز آتش بنا دیتا ہے۔ حقیقی داعی پر آخرت کی زندگی کو اس طرح کھول دیا جاتا ہے کہ گویا وہ حساب کتاب اور جزا وسزا کا منظر دل کی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوتا ہے۔ اور یہ منظر اسے لوگوں کو اللہ کے عتاب، اس کی سزا اور اس کی نافرمانیوں سے بچانے کے لئے سراپا سوز بنا دیتا ہے اور داعی کے دل سے آتش کے انگارے نکلتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں، جس سے مدعی خود آتش ہوجاتے ہیں۔ بیسویں صدی میں مولانا الیاس رحمتہ اللہ علیہ اور حسن البناء اس کی بڑی مثال ہیں۔ ان شخصیتوں میں یقین کی کیفیت اتنی مستحکم تھی اور امت کا درد اتنا طاقتور تھا کہ جو شخص بھی ان کے قریب آیا (اور ہزاروں افراد قریب آئے) ان سب میں ان کی حرارت کے اجزا منتقل ہوگئے، ان دونوں شخصیتوں نے افراد معاشرہ میں ایک طرح کی آگ لگادی۔

ان دونوں شخصیتوں کے دعوتی کام میں فنائیت کا نتیجہ تھا کہ اب تک تبلیغی جماعت پوری دنیا میں سرگرم عمل ہے۔ جب کہ حسن البنا کی تحریک عالم عرب میں اسلام کے لئے متحرک ہے۔ اور طاغوت کی طرف سے ظلم وستم کی ہولناک واردات کے باوجود وہ اسلام پر قائم ہیں۔ یہ حقیقی داعی کی نظر کا وہ فیض ہوتا ہے، جو لوگوں کی زندگیوں کو زیر وزبر کردیتا ہے۔ ان کی زندگیوں میں آگ لگا دیتا ہے۔

تیسری چیز جو داعی کے اندر ہونا ضروری ہے وہ اپنے دور کے طاقتور نظریات، طاقتور باطل قوتوں اور ان کے طریق کار اور سازشوں کا ادراک ہونا ہے۔ یہ ادراک کہ اللہ ورسول کے دشمن، مسلم امت اور خود انسانیت کو پامال اور تباہ کرنے کے لئے کس حکمت عملی

پر گامزن ہیں نیز مسلم امت کے سلسلہ میں ان کی منصوبہ بندی کیا ہے، اور ان کو فکری وعملی گمراہی میں مبتلا کرنے کے لئے ان کے نقشے کیا ہیں۔ نفس پرستی کی قوتوں کو بھڑکانے، افراد امت کو فکری انتشار کا شکار بنانے اور ذہنی طور پر پامال کرنے کے لئے ان کے حربے کیا ہیں؟

اس ادراک کے بغیر دعوتی کام مؤثر ہو سکے اور دعوتی تحریک نئی نسلوں کو کفر کی طاقتوں کی حکمت عملی سے بچانے میں فیصلہ کن کردار ادا کرسکے، مشکل ہے۔

قرآن مجید نے ابتدائی اسلامی تحریک کے دور میں کارفرما کفر کی طاقتوں مشرکین مکہ اور اہل یہود کا جس تفصیل سے ذکر کیا ہے، ان کی نفسیات، مزاج، طریق کار اور سازشوں کی جس خوبصورتی سے نشاندہی فرمائی ہے، وہ ہمارے لئے لمحہ فکریہ ہے، اس کی روشنی میں ہمارے لئے ناگزیر ہے کہ ہم اسلام کو مٹانے کے سلسلہ میں کفر کی طاقتوں کی ذہنیت، مزاج اور ان کی سازشانہ کارروائیوں اور منصوبہ بندی سے پوری طرح آشنا ہوں، اور اپنی دعوتی حکمت عملی میں اس کے توڑ وازالہ کی پوری حکمت عملی شامل ہو۔

یہ تیسرا نکتہ بہت اہم ہے، جسے داعی ودعوتی تحریکوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ مثلا موجودہ دور میں عالمی کفر مسلماں ملکوں میں قومیت کی تحریکوں کو ابھار کر ان کے ذریعہ اسلامی وحدت پر ضرب کاری لگانا چاہتا ہے۔ قومیت کی ان تحریکوں میں دیندار مسلمان بھی بڑی سادگی سے شریک ہوجاتے ہیں کہ یہ تو حقوق کی تحریک ہے، اس کا عالمی کفر کی حکمت عملی سے کیا تعلق ہوسکتا ہے؟

یا مثلا عالمی سرمایہ دار اور مغربی ممالک مسلم ممالک میں این جی اوز کے ذریعہ ایسی ثقافتی تحریک کو مستحکم کررہے ہیں (جس پر وہ سالانہ اربہا ڈالر خرچ کررہے ہیں) جو اسلامی تہذیب کے اثرات کو مٹانے کا موجب ہو اور اس سلسلہ میں وہ مسلم معاشرہ میں اسلامی تہذیب کے منافی بہت سارے کام کررہے ہیں۔ جس سے معاشرہ میں شرم وحیا کی فضا ختم ہورہی ہے اور مرد وعورت کے اختلاط کی فضا تیزی سے بڑھتی جارہی ہے۔ اور مغربی تہذیب پر فریفتگی کی فضا پیدا ہورہی ہے۔

یا مثلا عالمی کفر کی کاوش ہے کہ مسلمان معاشرہ میں سیاست، معیشت، اور معاشرت غرض کہ ہر سطح پر سیکولر قیادت کو آگے بڑھایا جائے اور اسے معاشرہ پر مسلط کر دیا جائے،

عالمی کفر کی اس حکمت عملی کا نتیجہ ہے کہ مسلمان ممالک میں سیکولر لیڈر شپ کو فروغ حاصل ہے اور مسلمانوں کی اکثریت اپنی سیاست، معیشت ومعاشرت کی باگ سیکولر قیادت کے حوالے کرنے کے عمل کو معیوب سمجھنے سے قاصر ہے۔

دعوتی تحریکوں کے لئے اس کام میں دو چیزوں کا خصوصی خیال رکھنا ضروری ہے۔ ایک یہ کہ اصلاح نفس اور تربیت وتزکیہ کے کام کو سب سے زیادہ فیصلہ کو اہمیت دینا ہوگی، اصلاح نفس کے کام کی قیمت پر دعوتی کام اس کا نتیجہ اس کام کو غیرمؤثر کرنے کے مترادف ہے، سبب یہ ہے کہ باطن میں موجود نفسی خرابیاں اتنی طاقتور ہیں کہ اگر دعوتی کام کے ہر موڑ پر ان خرابیوں کا ادراک نہ ہو تو یہ دعوتی تحریکیں گروہی تحریکوں اور دوسری خرابیوں کی صورت اختیار کرسکتی ہیں۔ اس لئے دعوت کے کام میں خوداحتسابی اور تزکیہ نفس کو ہرصورت میں بنیادی اہمیت حاصل ہوگی۔

دوسری چیز جس کا احتیاط ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ دعوتی تحریکوں کی براہ راست سیاست میں عملی شرکت سے احتیاط ناگزیر ہے، اگرچہ موجودہ دور میں سیاست کی اہمیت فیصلہ کن ہے، لیکن جب دعوتی تحریک سیاست کا رخ اختیار کرتی ہے اور وہ سیاست میں فریق بننے لگتی ہے تو اس کی افادیت بڑی طرح متاثر ہوتی ہے اور دعوت کا کام سیاسی دشمنیوں کی نذر ہونے لگتا ہے، البتہ صبر آزما دعوتی کام کے نتیجہ میں اس دعوت سے متاثر ہونے والے ایسے افراد سامنے آسکتے ہیں، جو سیاسی مزاج کے حامل ہوں اور وہ براست راہ دعوتی تحریک کا حصہ نہ ہوں، لیکن سیاسی مزاج کے غلبہ کی وجہ سے وہ سیاسی جماعت کے ذریعہ کسی حد تک سیاست میں فروغ اسلام کا ذریعہ بن جائیں۔

دعوت دراصل نام ہے لوگوں کو جہنم کی آگ سے بچا کر، جنت میں داخل کرنے والے اعمال کی طرف لانے کا اور اللہ ورسول کی اطاعت کے ذریعہ بہتر اور پاکیزہ انسان کی حیثیت سے زندگی گذارنے کے سلیقہ سے بہرہ ور ہونے کا، اس لئے دعوتی تحریکوں کا ایسے مسائل میں الجھنا، جس سے ان تحریکوں کی حیثیت خاص فریق والی ہوجائے، صحیح نہیں۔ اس سلسلہ میں تبلیغی جماعت کی حکمت عملی ایسی ہے جو دوسری دینی دعوتوں کے لئے قابل تقلید ہے۔ البتہ تبلیغی جماعت میں اگر اعمال کے ساتھ ذہن اور فکر کو بھی مطلوبہ اہمیت دی جاتی اور دور جدید کے علمی وفکری چیلنج کو بھی ایک درجہ میں شامل کیا جاتا تو اس سے

جدیدیت کے فکری نوعیت کے چیلنج کے مفاسد سے بچاؤ کی بہتر صورت پیدا ہوتی اور تبلیغی جماعت کے پلیٹ فارم سے جدید فکر سے متاثر ہونے والے لاکھوں افراد کو سنبھالنے کی صورت بھی پیدا ہوتی۔

اخوان المسلموں کی دعوتی تحریک کچھ حالات کے جبر اور کچھ حکمت عملی کے نقص، کچھ اسلامی فکر میں سیاسی فکر کے غلبہ کی وجہ سے سیاست میں فریق بن گئی، جس کی وجہ سے شدید ابتلا وآزمائش کے مراحل سے گذری اور اب تک گذر رہی ہے، چنانچہ اسے معاشرہ کو بڑی حد تک بدلنے کے پوری طرح مواقع میسر نہ ہوسکے۔

دعوتی کام کے سلسلہ میں یہ نکتہ بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ دعوت کا کام محض فکر کے بل بوتے پر نہیں ہوتا، یا وہ محض قوائد وضوابط سے نہیں ہوتا، بلکہ دعوتی کام کی بنیاد، اللہ کی محبت، اللہ کے بندوں سے محبت، ان سے شفقت اور انہیں جہنم کی آگ سے بچانے کا آگ سے درد اور اس کی حقیقی فکر مندی ہونا ناگزیر ہوتی ہے، اس کے بغیر دعوتی تحریکیں معاشرہ میں نفوذ نہیں کرسکتی۔

دعوتی کام کے لئے جہاں دل کی تبدیلی ضروری ہے، وہاں طاقتور اسلامی فکر کا ادراک کامل کا ہونا اور دنیا کے سارے نظریات کے مقابلہ میں اسلام کے نظریہ کے کامل ہونے کا یقین ہونا اور باطل نظریات کے باطل ہونے کا پورا شعور حاصل ہونا ضروری ہے۔ دعوتی تحریک نہ تو دل کو نظر انداز کرسکتی ہے اور نہ ہی ذہن کو، اسے دونوں کی اصلاح کو پیش نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ دور جدید میں کفر نے ایسی صورت اختیار کر لی ہے کہ ایک فرد بظاہر مسلمان ہوتے ہوئے اور مسلمان معاشرہ کے سارے ثمرات سے بہرہ ور ہوتے ہوئے بھی وہ عملا ملت کفر کا حصہ ہوتا ہے، یہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ دور جدید میں فکری ونظریاتی نوعیت کی عالمی چیلنج کو سمجھنے میں کوتاہی واقع ہوئی ہے۔ اس لئے اسلامی دعوتی کوتاہی ہوئی تحریکوں کو جدیدیت کی فکری ونظریاتی نوعیت کے چیلنج کو سمجھنا (جس کا شروع میں ذکر کیا گیا) ناگزیر ہے۔ **(ماخوذ ''بیداری'' اگست ۲۰۱۵ء)**

معاشرہ کی جدید نوعیت

اور مثبت تحریک کی ضرورت

عالمی صورتحال کے پس منظر میں

پاکستانی معاشرہ کے حوالے سے اس وقت ایک اہم سوال یہ ہے کہ پاکستان میں معاشرہ کی سطح پر مثبت تحریک کے ابھرنے کی صورت کس حد تک موجود ہے؟ اس سلسلہ میں اہل علم واہل دانش کا ایک طبقہ یاس کا شکار ہے، اس کا کہنا ہے کہ مثبت تحریک کی بنیاد علم، علمیت، روحانیت اور ایثار وقربانی کے میلانات رجحانات وجذبات ہوتے ہیں، جو اس وقت پاکستانی معاشرہ میں تیزی سے مفقود ہوتے جارہے ہیں۔

علمی مزاج، روحانیت کے اجزا اور ایثار وقربانی کے بغیر معاشرہ سے مثبت تحریک کا ابھرنا ممکن نہیں۔

ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ یہ دور دراصل معاشی تحریکوں کا دور ہے۔ معاشی جدوجہد وتحرک ہی زندگی کے نصب العین کی حیثیت اختیار کرچکی ہے۔ پچاس سال پہلے تک معاشرہ میں علمی تحریک کو جنم دینے کی صلاحیت موجود تھی، اِس وقت معاشرہ اس اعتبار سے بالکل بانجھ ہوچکا ہے اور ہماری نوجوان نسل کی ساری آرزوئیں مادی زندگی کے مستقبل کو بہتر بنانے کے حوالے سے ہی وابستہ ہیں۔انہیں صرف اور صرف مادی زندگی مطلوب ہے۔ جس میں رقص ابلیس ہو اور اس کے مناظر ہوں، جنسی آزادی کے مواقع میسر ہوں اور جائز وناجائز طور پر دولت کمانے کے مواقع موجود ہوں، اخلاقی قدروں اور باہمی رواداری کی وہ روایت جو پچاس سال پہلے تک معاشرہ میں کسی حد تک موجود تھی، اب فرد اس کے مظاہر دیکھنے کے لئے ترستا ہے۔

یہ صورتحال بڑی حد تک عالمی سرمایہ دار اور ان کے حمایتی طبقات کی کوششوں سے پیدا ہوئی ہے، کچھ معاشرہ میں دعوتی کام کے فقدان سے بھی اور مذہبی طبقات میں جوہر

کردار کی کمی بھی اس کا سبب ہے اور لادینی تعلیمی وتربیتی وانتظامی وسیاسی نظام کو بھی اس میں بڑا عمل دخل ہے، یہاں اسباب پر بحث نہیں، بہرحال یہ حقیقت ہے کہ اس وقت معاشرہ سے طاقتور مثبت وصحتمند تحریک کے ابھرنے کے امکانات کم نظر آتے ہیں۔

کچھ دردمند افراد ہیں جو مادیت پرستی کے تیز تر سیلاب میں عقل وعقلیت کے ذریعہ معاشرہ کو بچانے اور تحفظ اسلام کے لئے کردار ادا کرنا چاہ رہے ہیں، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ مادیت پرستی کے سیلاب میں عقل کی حیثیت تنکوں سے زیادہ نہیں، جو خود اس سیلاب کی نذر ہوجاتے ہیں۔

کچھ دینی دبستان فکر ہیں جو عالمی سرمایہ دار کی حیرت انگیز مالی، عسکری اور ذہنوں کو تبدیل کرنے والی قوت کے ادراک کے بغیر کچھ روحانی مشقوں اور کچھ وعظ ونصیحت اور کچھ دائراتی خولوں کو مستحکم کرنے کے ذریعہ اس سیلاب کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس طرح کچھ نہ کچھ افراد کو تو کسی نہ کسی حد تک بچایا جا سکتا ہے، لیکن اس سے مادیت پرستی کی طاقتور تحریک کا مقابلہ اور مثبت طاقتور تحریک کی صورت کا پیدا ہونا ممکن نہیں۔

پاکستانی ملت یا خود مسلم امت اس وقت عالمی سرمایہ دار، بین الاقوامی یہودیت اور یورپ اور امریکہ کے مادہ پرستانہ حرص وہوس کے شدید شکنجہ میں ہے۔ مسلم امت کی ساری داخلی وخارجی پالیسیوں کی تشکیل میں ان قوتوں کا پوری طرح ہاتھ کارفرما ہے۔ مسلم امت بے پناہ وسائل اور زرخیز ذہن کے موجود ہوتے ہوئے بھی اپنے بیشتر وسائل دشمن کے حوالے کرچکی ہے اور وہ دشمن کے دیئے ہوئے قرضوں پر گذارہ کررہی ہیں۔ اور ہمارے مؤثر طبقات اس طرح کی علامات زندگی کو آزادی، خوشحالی اور خوشی کی زندگی سے عبارت سمجھ رہی ہے۔

اس غلامی سے نجات کے لئے دینی واخلاقی اعتبار سے ہمہ جہتی طور پر معاشرہ کو بدلنا وقت کی سب سے اہم ضرورت ہے۔

وقت کا یہ چیلنج سب کو پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اپنی نسلوں کو دین کے بنیادی اعتقادات اور کم سے کم دینی، روحانی اور اخلاقی معیار پر قائم رکھنے کے لئے بھی غیر معمولی دعوتی وعلمی تحرک کی ضرورت ہے۔ حالات کی ساری خرابی کے باوجود معاشرہ میں یہ تحرک پیدا ہوسکتا ہے، لیکن اس کے لئے اخلاص، اضطراب، گروہی خولوں سے بلندی، وقت کے

چیلنج کی نوعیت کو سمجھنے اور وسعت قلبی ووسعت ظرفی کی ضرورت ہے۔

اگر اس نکتہ کا استحضار موجود ہو کہ چیلنج ہمہ گیر نوعیت کا ہے، اور وہ چیلنج اپنی نسلوں کو جہنم کا ایندھن بننے سے بچانے کا ہے۔ تو دعوت کا کام اور دعوت کا میدان ہماری توجہات کا مرکز بن سکتا ہے، اگر اخلاص، توکل، مستقل مزاجی، حالات کے فہم اور حکمت کے ساتھ دعوتی وعلمی کام ہو تو اب بھی معاشرہ سے طاقتور اسلامی تحریک کے ابھرنے کی صورت پیدا ہوسکتی ہے۔ یاس کی کوئی گنجائش نہیں۔

یاد رکھیں، ہم عالمی سطح سے لے کر مقامی سطح تک ایک ایسی تہذیبی جنگ میں مبتلا کردیئے گئے ہیں، جس کے لئے عالمی کفر کی طاقتیں اپنی ترکش کے سارے تیر استعمال کر چکی ہیں۔ یہ جنگ اسلحہ سے زیادہ میڈیا، اخبارات اور تعلیمی اداروں، کلچرلی وتہذیبی سرگرمیوں کے ذریعہ لڑی جارہی ہے، اس کا ہدف ہماری نوجوان نسلیں ہیں کہ انہیں اسلامی تہذیب سے مکمل طور پر بے گانہ کرکے، مادہ پرست مغربی تہذیب، اس کے مظاہر اور اس کی اداؤں پر مجنون وار بنایا جائے، اسلامی تہذیب اور اس کے اعتقادی نظام پر ان کے اعتماد کو مجروح کر دیا جائے، بظاہر اسلامی نام ہونے کے باوجود اور تھوڑے بہت مذہبی مراسم کی ادائیگی کے باوجود ان کے دل و دماغ مغربی تہذیب کے سحر کا شکار ہوں، ان کی سوچ اور ان کی جدوجہد کا مرکز مادی دنیا کا حصول اور سرمایہ دار کی پیداواری اشیاء کی خریداری اور دنیاوی مستقبل کو ہی سب کچھ سمجھنے، اچھی گاڑیاں، اچھے مکان اور سامان تعیش کا حصول ہی مقصود زندگی ہوجائے۔

یہ جنگ جو ہم پر مسلط کردی گئی ہے، یہ تہذیبی جنگ بھی ہے تو معاشی بھی، اور عسکری جنگ بھی۔ ہمیں ادراک ہو یا نہ ہو، پچھلے ڈیڑھ دوسال سے ہم پر یہ جنگ مسلط کردی گئی ہے، اربوں ڈالر خرچ کرکے ہماری ذہین نسلوں کو خریدا گیا ہے، ہماری میڈیا کو ہماری پاکیزہ تہذیب اور پاکیزہ اخلاقی قدروں کی تباہی کے مقصد کے لئے استعمال کیا جارہا ہے، ہمارے حکمرانوں اور اہل سیاست اور بیوروکریسی کو قومی وسائل کی لوٹ مار اور کروڑ پتی اور ارب پتی بننے کی راہ پر لگا دیا گیا ہے۔ اور اس کے لئے ساری راہیں ہموار کردی گئی ہیں۔ اس طرح معاشی اعتبار سے ہمیں محتاج بنا کر عالمی مالیاتی اداروں کے قرضوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا گیا ہے، اس طرح قومی زندگی کو درپیش اشیائے ضرورت

کی اسی فیصد سے زیادہ چیزوں کے لئے مغربی کمپنیوں اور مغربی پیداواری اداروں کا دست نگر بنادیا گیا ہے۔ مادہ پرست مغربی تہذیب کی وکالت کے لئے دانشوروں، تعلیمی ماہروں، ادیبوں اور میڈیا پر آنے والے اہل علم کی فوج ظفر موج تیار کردی گئی ہے جو دشمن کا کیس ان سے زیادہ چرب زبانی کے ساتھ پیش کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔

یہ ہمہ جہتی تہذیبی جنگ ہے، جس سے ہم دوچار ہیں۔ عالمی کفر کے نمائندے بارہا اعلان کر چکے ہیں کہ ہماری تہذیب کو (مسلمانوں کی طرف سے) خطرہ درپیش ہے، اس خطرہ کے ازالہ کے لئے ہمیں جہاں بھی ضرورت محسوس ہوئی، وہاں ہم پوری عسکری قوت کے ساتھ آموجود ہوں گے۔ عراق میں، افغانستان میں، الجزائر میں اور اب مصر میں اسلامی تحریک کو کچلنے کے لئے جو کچھ ہورہا ہے، وہ سب اسی جنگ کا حصہ ہے۔

مختصرا یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمان ممالک اور مسلم امت کے بارے میں مغرب پچھلے ڈیڑھ سو سال سے جس پالیسی پر عمل پیرا ہے، اس کے پانچ اہداف ہیں، جن کے حصول کے لئے وہ اپنی توانائیاں ووسائل خرچ کررہا ہے، وہ اہداف یہ ہیں۔

یکم۔ مسلمانوں میں آخرت کے حوالے سے فکر کا خاتمہ ہوجائے اور اس سلسلہ میں وہ اہل مغرب کی طرح خالص مادی نقطہ نگاہ کے حامل ہوجائیں۔

دوم۔ مسلمانوں کی ثقافت تبدیل ہوجائے۔ وہ مکمل طور پر مغربی کلچر کا حصہ بن جائیں، ان کی معاشرت اور پوری طرز زندگی مغربی زندگی کا نمونہ ہوجائے۔ شرم وحیا کا خاتمہ ہو۔

سوم۔ خاندانی نظام ٹوٹ پھوٹ جائے، جنس پر عائد قدغنیں باقی نہ رہیں، عالم اسلام کبھی اس قابل نہ ہو سکے کہ وہ عسکری طور پر مغرب سے مقابلہ کا سوچ بھی سکے۔

چہارم۔ معاشی طور پر وہ ان کا محتاج ودست نگر ہو، معدنی وسائل سے مالا مال ہونے کے باوجود وہ ان وسائل سے استفادہ نہ کرسکیں اور ان معدنی وسائل کا پھل مغرب کی جھولی میں گرتا رہے، ان کے وسائل سے مغرب کو عالمی قوت بننے کی جو استعداد حاصل ہے، وہ مستقل قائم رہے۔

پنجم۔ مسلمان ممالک جدید ترین ٹیکنالوجی میں کسی قیمت پر شریک نہ ہوسکیں۔ وہ مغرب سے مغرب کی مرضی کے تحت ٹیکنالوجی بھاری قیمت پر خریدنے کی راہ پر گامزن

ہوں۔

دکھ اس بات کا ہے کہ اس تہذیبی جنگ اور اس کی نوعیت کے سمجھنے کے لئے ہمارے مذہبی عناصر نے دانشمندی کا مظاہر نہیں کیا، چنانچہ ان کی کاوشیں جس طرح ایک دوسرے کو غلط ثابت کرنے اور کمزور کرنے میں صرف ہورہی تھیں، اس میں کوئی واقع نہیں ہوئی، اس جنگ کے مقابلہ کے لئے ان کی طرف سے کوئی متحدہ پلیٹ فارم متشکل ہو، اس کا تو دور دور تک امکان نظر نہیں آ رہا ہے۔ گروہی دائرے مستحکم سے مستحکم تر ہوتے جارہے ہیں۔ امت پن کے رویے کا مظاہرہ نہ ہونے کے برابر ہے۔

عالمی اور مقامی سطح پر لڑی جانے والی اس جنگ میں ہمارے لئے جو اہم محاذ ہیں، جنہیں ہم مؤثر ہتھیار بھی کہہ سکتے ہیں، وہ افراد ملت کے دل وضمیر کو بدلنے، ان کی روحانی قوتوں کو بیدار کرنے، فکر ونظر کی تربیت کرنے، ایمان ویقین کو مستحکم کرنے، عالمی طاغوت کے خلاف شعور پیدا کرنے، ملت پن کے احساس کو پختہ کرنے اور مادی دنیا کے بے بقا ہونے، آخرت کے عقیدہ کو مستحکم کرنے اور اللہ سے والہانہ محبت پیدا کرنے اور جذبہ جہاد اور اس کی روح کو اجاگر کرنے جیسے ہتھیار ہیں۔

یہ ہماری پاکیزہ تہذیب کے وہ ہتھیار ہیں، جن کے ذریعہ ہم عالمی کفر اور طاغوت کی عالمی طاقتوں کے سارے ہتھیاروں اور سارے سازشی منصوبوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اس لئے کہ ہماری پاکیزہ تہذیب کے یہ ہتھیار اس نوعیت کے ہیں، جو انسانی فطرت کا ناگزیر حصہ ہیں۔ جب ملت کی فطرت کے یہ طاقتور ہتھیار اپنا کام کرنے لگتے ہیں تو بڑے سے بڑا طاغوت بھی راہ فرار اختیار کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ہماری تاریخ میں طاغوت کے ساتھ لڑی جانے والی ساری جنگیں اس کی شاہد ہیں۔ **(ماخوذ ''بیداری'' ستمبر ۲۰۱۵ء)**

موجودہ دور میں قوموں کے درمیاں

لڑی جانے والی اصل لڑائی

زیر نظر مضمون اس اعتبار سے اہم مضمون ہے کہ اس میں مسلمانوں کو تہذیبی طور پر درپیش خطرہ (جو بڑی حد تک ایک حقیقت بن چکا ہے) سے آشنا کیا گیا ہے۔ آج سے تین سو سال پہلے یورپی قومیں یاجوج ماجوج کی حیثیت سے ظاہر ہوکر، عالم اسلام کے مؤثر علاقوں پر غالب ہوگئیں، اس کے بعد ستر اسی سال سے ان یاجوجی ماجوجی قوتوں کی ہمراہی میں دجالی تہذیب کی علمبردار قوت امریکہ (یہودی سرمایہ دار کی پشت پر) ایک خطرناک منصوبہ پر عمل پیرا ہے، وہ منصوبہ یہ ہے کہ عالم اسلام پر ان کی مادی تہذیب کا غلبہ ہو اور مسلمانوں کو مسلمان کی حیثیت سے زندہ رہنے نہ دیا۔ اس مقصد کے لئے مختلف طریقوں سے ہمارے تعلیمی نظام اور میڈیا پر ان کا مکمل طور پر قبضہ ہو چکا ہے، ہماری معاشی، سیاسی تعلیمی تربیتی ساری پالیسیوں کا اختیار ان کے ہاتھ میں چلا گیا ہے۔

مسلمان ممالک میں اول تو انتخابات کے ذریعہ کسی دینی سیاسی جماعت کا برسراقتدار آنا دشوار ہے، جہاں ایسا ہوتا بھی ہے، وہاں فوجی قوت کے ذریعہ ان کی قوت کو ختم کرکے ملک کو مادہ پرستی کے شکنجے میں لانے کی آخری حد تک کاوش ہوتی ہے۔

اس طرح اس وقت تہذیبی تصادم عروج پر ہے۔ اور عالم اسلام کا دردمند مسلمان بے بسی کی تصویر بنتا ہوا نظر آتا ہے۔

جدید تعلیمی اداروں سے جو نسلیں تیار ہورہی ہیں، ان کے سامنے دنیا کو خوبصورت اور بہتر بنانے کے علاوہ دوسرا کوئی مقصد زندگی نہیں ہوتا،

دوسرے الفاظ میں وہ یاجوجی ماجوجی قوتوں اور دجالی تہذیب کے علمبرداروں کے فکری، علمی، عملی اور تہذیبی سانچہ میں ڈھل چکی ہوتی ہیں۔ دین ومذہب کو وہ ورد ووظائف، اور مسجد تک محدود سمجھتے ہیں۔

عالمی کفر اب دینی مدارس کے بارے میں متفکر ہے کہ ان مدارس کے ذریعہ پیدا ہونے والی اسلامیت اور مذہبی ماحول کو کیسے ختم کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے اس نے اپنے دنیادار حکمرانوں کو مدارس کو قومی دھارے میں شامل ہونے کا نعرہ دیا ہے کہ ان مدارس کو مجبور کیا جائے کہ وہ اپنے ہاں جدید تعلیمی نظام انگریزی اور ٹیکنالوجی وغیرہ کو لازمی حصہ کے طور پر شامل کریں۔

دینی مدارس پر عالمی کفر کی یہ بدنظری خطرہ سے خالی نہیں، اگر اسے اس کوشش میں کسی بھی حد تک کامیابی حاصل ہوتی ہے تو ان مدارس سے ایسے ہی پیٹ پرست، نفس پرست اور مادی دنیا پر ٹوٹ پڑنے والے افراد ہی پیدا ہوں گے، جو جدید تعلیمی اداروں سے ایک عرصہ سے پیدا ہورہے ہیں۔ اس لئے کہ مغربی نظام تعلیم اور اس کے نصاب میں مادیت اور مادہ پرستی کے زہر کو اس طرح گھول دیا گیا ہے کہ اس کے زہریلے اثرات سے بچاؤ کی ساری صورتیں مسدود ہیں۔

اس نقطہ نگاہ سے بھی مدارس کا تحفظ، اہل مدارس اور ہم سب کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔ البتہ جزوی اعتبار سے انگریزی زبان یا کمپیوٹر وغیرہ سے استفادہ، وہ اس سے مستثنیٰ ہے۔ دینی مدارس کا اصل ہدف ایثار، قربانی کا مظاہرہ کرکے اور سادہ زندگی گزار کر دینی تعلیمات کو عام کرنا، دینی واخلاقی اعتبار سے معاشرہ کو سنبھالنا اور قال اللہ وقال الرسول کی صدا کو بلند کرتے رہنا ہے۔

ہمارا مشاہدہ ہے کہ دینی مدارس کے فارغ جو افراد کالجوں ویونیورسٹیوں میں استاد کی حیثیت سے گئے، وہ نہ صرف اپنے ظاہری مذہبی

رنگ ڈھنگ کو برقرار نہ رکھ سکے بلکہ دین کی جدید تعبیروں سے متاثر ہو کر جدیدیت کی نذر ہوگئے۔

دینی سیاسی جماعتوں کو یہ نکتہ سمجھنا چاہئے کہ فکری، نظریاتی اور تہذیبی اعتبار سے معاشرہ کی تبدیلی کے بغیر سیاسی تبدیلی کوئی معنیٰ نہیں رکھتی۔ اس سلسلہ میں دینی سیاسی جماعتوں کو جس نکتہ کے استحضار کی ضرورت ہے، وہ یہ ہے کہ اس وقت عالمی سیاست، معیشت، عسکریت اور میڈیا وغیرہ پر بین الاقوامی یہودیت اور مادہ پرست مغربی سرمایہ دار کا مکمل قبضہ ہے اور اسلامی دنیا کے حکمران اور سارے مقتدر اور مؤثر طبقات براہ راست یا بالواسطہ طور پر اس عالمی ساہوکار کے آلہ کار ہیں۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی تہذیب اور ان کی پالیسیوں پر عمل پیرا ہونے پر مجبور ہیں۔

بین الاقوامی یہودیت اور عالمی سرمایہ دار کے پاس قارون کا اتنا خزانہ موجود ہے کہ وہ عالم اسلام کے کروڑوں ذہین افراد کو آسانی سے خرید رہا ہے، لیکن خریدنے سے پہلے وہ اپنے نظام تعلیم کے ذریعہ انہیں ذہنی طور پر آسانی سے اپنا ہمنوا بنارہا ہے۔ ان حالات میں معاشرہ کو دینی اور اخلاقی طور پر سنبھالنے کے بہت سارے کاموں سے صرف نظر کرکے، سیاست اور سیاسی تبدیلی میں اپنی بیشتر توانائیاں اور وسائل خرچ کرنا، نہ صرف یہ کہ حکمت عملی کے منافی ہے، بلکہ ملت کے وسائل اور توانائیوں کا غلط استعمال بھی ہے۔

الجزائر اور مصر میں جو ڈرامہ دہرایا گیا ہے اور جس طرح اسلامی جماعتوں کو انتخابی کامیابی کے باوجود کچل دیا گیا ہے، اس منظر کو دیکھنے کے بعد آنکھیں کھولنے کی ضرورت ہے اور اس طرح کی منصوبہ بندی کی ضرورت ہے جس سے مسلم معاشرہ کی نئی نسلوں کے دین وایمان کے تحفظ کی صورت پیدا ہو، اسلامی تہذیب پر عمل پیرا ہونے کے بارے میں ان کی باطنی حس بیدار سے بیدار تر ہو اور مادی تہذیب کے خلاف ان کی حمیتِ دین طاقتور ہو۔

یہ کام ایسا ہے جو وقت کی سب سے اہم ضرورت ہے اور دجالی تہذیب کے خلاف مسلم معاشرے میں مضبوط بند باندھنے کی صورت بھی یہی ہے۔ یعنی اسلام کے اعتقادی، نظریاتی، فکری اور تہذیبی محاذ کو مستحکم سے مستحکم کرنے کا کام دوسرے سارے کاموں پر بھاری ہے۔ اس کام کے نتیجہ میں دوسرے سارے محاذوں پر ازخود افراد کار مہیا ہوتے چلے جائیں گے۔ **(محمد موسیٰ بھٹو)**

گذشتہ چند سالوں میں انگریزی کا ایک لفظ مین اسٹریم (Stream Main) بہت زیادہ استعمال کیا جانے لگا ہے۔ ''مین'' کا لفظی ترجمہ سب سے بڑا، بنیادی یا سب سے اہم ہے اور اسٹریم ندی یا دریا کو کہتے ہیں۔ اس طرح انسانی تہذیب وتمدن کی بھی ایک مین اسٹریم ہوتی ہے، جو دوطریقوں سے اپنا راستہ متعین کرتی ہے۔ تاریخ میں ایک راستہ وہ ہے جو اللہ نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے دنیا کو بتلایا اور ابتدائے آفرینش سے لے کر سید الانبیاءﷺ تک اخلاق، اقدار، چال چلن، انسانی رویوں اور اللہ کے سامنے جوابدہی کے تصور سے دنیا کو ایک لائف اسٹائل یعنی طرز زندگی عطا کیا۔ یہ طرز زندگی یا الوہی لائف اسٹائل دراصل پہلی قسم کی ''مین اسٹریم'' ہے۔ دوسری ''مین اسٹریم'' وہ ہے جو اس الوہی ''مین اسٹریم'' یا لائف اسٹائل کی ضد اور مخالفت میں انسان خود ترتیب دیتا ہے۔ صدیوں سے انسانوں نے پیغمبروں کی مخالفت اس طرح کی کہ ان کے مقابلے میں اپنے ایک لائف اسٹائل کو جنم دیا اور اس کے تحفظ کے لیے لڑتے بھی رہے۔

حضرت لوط علیہ السلام کی قوم نے غیر فطری فعل کو اپنے لائف اسٹائل کا جزو لاینفک بنایا اور ان کی اکثریت نے عین جمہوری مزاج کے طور پر اسے اپنے لیے جائز قرار دیا۔ یہ ان کا مین اسٹریم یا قومی دھارا تھا۔ اسی طرح حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم نے کم تولنے کو ایک لائف اسٹائل کے طور پر اپنایا اور پوری قوم میں سے صرف چند لوگ ایسے تھے، جو اس مین اسٹریم سے علیحدہ اور حضرت شعیب علیہ السلام کا ساتھ دیتے تھے۔ نمرود، شداد، فرعون اور ہر اس فرد جس نے پیغمبروں کی مخالفت کی، ہمیشہ دنیا کو ایک مختلف لائف اسٹائل دیا اور پھر اس کے تحفظ کی لڑائی لڑتا رہا۔ یہ دوسرا طریقہ ہے دنیا کو ایک طرز زندگی

دینے کا۔ یہ دونوں طریقے ازل سے لے کر آج تک ایک دوسرے کی ضد رہے ہیں، لیکن جدید تہذیب کا کمال یہ ہے کہ اس نے اپنے لائف اسٹائل کو مین اسٹریم کا نام دے کر پوری دنیا کو اس بات پر مجبور کیا ہے کہ دیگر مذاہب جدید مین اسٹریم کا حصہ بن جائیں۔

ان کے نزدیک یہ ایک بین الاقوامی دھارا ہے، جس میں علاقائی اور قومی دھارے ضم ہوجائیں۔ انہیں تھوڑی دور علیحدہ چلنے کی اجازت ہے، لیکن ان کا رخ اور سمت بین الاقوامی دھارا یا مین اسٹریم کی طرف ہی ہونا چاہیے، ورنہ ہم بزور طاقت ان کا رخ بدل دیں گے اور ان کی طرف سے اس کا مظاہرہ بار بار کیا جاتا رہا۔ گیارہ ستمبر کے واقعے کے بعد دنیا میں دو طاقتیں اپنے دو لیڈروں کی زبانی اس جنگ کا اعلان کرتی نظر آتی ہیں۔ امریکا اور برطانیہ، جارج بش اور ٹونی بلیئر۔ ان دونوں نے ایک ہی بات کی کہ ''ہم اپنے لائف اسٹائل کے تحفظ کی جنگ لڑ رہے ہیں۔'' اس مین اسٹریم کے مقابلے میں کوئی افغانستان یا عراق میں نظر آیا تو تہہ وبالا کردیں گے اور اگر ہمارے ملکوں میں ہوا تو سیکیورٹی قوانین اس قدر سخت بنادیں گے کہ سانس لینا مشکل کردیں گے اور دنیا کے دیگر تمام ممالک کو مجبور کریں گے کہ وہ اپنے تمام طبقات کو اس مین اسٹریم اور بین الاقوامی دھارے کا حصہ بنائیں۔

اس بین الاقوامی دھارے اور لائف اسٹائل کو دو بنیادی ادارے آج کے دور میں جنم دیتے ہیں۔ ایک میڈیا اور دوسرا نظام تعلیم۔ میڈیا چونکہ مکمل طور پر ان کے کنٹرول میں ہے اور وہ ہر ملک میں اس کی مخصوص آزادی کا خود تحفظ کرواتے ہیں۔ لیکن دنیا کے ہر اس ملک میں جہاں اس لائف اسٹائل کے مخالف ایک واضح اکثریت موجود ہے، وہاں ان کے تعلیمی ماہرین آن دھمکتے ہیں۔ ان کے تعلیمی ادارے جا بجا کھل جاتے ہیں۔ وظائف کے انبار لگا دیے جاتے ہیں، تاکہ لوگ ان کی یونیورسٹیوں میں جاکر تعلیم حاصل کریں اور واپس آکر ان کے لائف اسٹائل کے وکیل بن جائیں۔ نرسری نظموں سے لے کر اے لیول اور او لیول کی کتابوں، یہاں تک کہ ملک کے علاقائی سلیبس میں بھی ایسے ماحول کو پیش کیا جاتا ہے، جو اس ''مین اسٹریم'' لائف اسٹائل سے مطابقت رکھتا ہو۔

انسانی تاریخ میں اس لائف اسٹائل کے مقابل ہمیشہ سے ہی ایک دوسرا لائف

اسٹائل رہا ہے، جسے الوہی ہدایت یافتہ طرز زندگی کہتے ہیں۔ لیکن گذشتہ تین سو سالہ تعلیمی نظام اور گذشتہ ایک سوسالہ معاشی اور عسکری برتری نے ایک نیا راستہ نکالا ہے کہ اس الوہی نظام کے پیروکاوں کو بھی اپنی مین اسٹریم کا حصہ بنایا جائے۔ پچاس کی دہائی میں رینڈ کارپوریشن نے ایک رپورٹ مرتب کی تھی کہ تمام دنیا میں مسلمان مذہبی گروہوں، تنظیموں اور پارٹیوں کو اگر مین اسٹریم سیاست یعنی الیکشن اور جمہوریت کا حصہ بنا دیا جائے تو ان میں جدید مغربی لائف اسٹائل کی مخالفت دم توڑ جائے گی۔ اگر وہ ایسا کریں گی بھی تو سسٹم کے اندر رہ کر کریں گی، جس پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ اس وقت سے اب تک اسلامی سیاسی پارٹیاں شکست در شکست کھاتی ہیں اور اگر جیتنے بھی لگی تو الجزائر اور مصر کی طرح انہیں طاقت سے کچل دیا جاتا ہے۔ لیکن انہیں اصل خطرہ اس نظام تعلیم سے ہے جو مدرسوں کی صورت آج تک اس روح کو قائم رکھے ہوئے ہے اور اس لائف اسٹائل کے تحفظ کی جنگ لڑ رہا ہے جو رسول اکرم ﷺ نے چودہ سو سال پہلے عطا کیا تھا۔ یوں تو عام لوگوں کو اس بات کا عادی کر دیا گیا ہے کہ تم بچوں کو مین اسٹریم تعلیم یعنی ایم اے، ایم بی اے، میڈیکل، انجینئرنگ وغیرہ پڑھاؤ، تاکہ دنیا میں کامیاب ہو اور اگر دل چاہے تو شروع میں ناظرہ قرآن پاک پڑھا کر دینی ذمے داری پوری کر دو۔ یوں اکثریت کے نزدیک مین اسٹریم تعلیم دنیا کی کامیابی کے لیے ہے اور آخرت کی کامیابی کے لیے تھوڑی بہت اضافی تعلیم کافی ہے۔ یہ وہی لائف اسٹائل ہے جو مغرب نے عیسائیت کو ریاست سے نکال کر سیکولر اخلاقیات نافذ کر کے عطا کیا تھا۔ جب کہ ہمارے اسلاف کا لائف اسٹائل یہ تھا کہ اصل تعلیم آخرت کی فلاح کے لیے ہے اور اس کے ساتھ دنیا کی فلاح کی تعلیم بھی پڑھنی چاہیے۔

یہی وجہ ہے کہ سات صدیوں تک مسلمانوں میں سے دنیا کے علوم کی سربراہی کرنے والے ایسے عالم پیدا ہوئے، جن کا طرز زندگی اللہ کے بنائے اصولوں کے مطابق تھا۔ بوعلی سینا سے لے کر ابن الہیثم اور جابر بن حیان تک جو سب فزکس، کیمسٹری اور میڈیسن کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں، اپنی طرز زندگی میں سچے اور کھرے مسلمان تھے، کیونکہ ان کے ہاں تعلیم میں ترجیح اول وہ تعلیم تھی، جو اللہ کے قرب اور آخرت میں سرخروئی

کا باعث بنے۔ لیکن گذشتہ چار سو سالوں سے مسلم دنیا پر مغربی قبضے نے ایک ایسے لائف اسٹائل کو جنم دیا ہے جس میں انسانی زندگی کی مین اسٹریم دنیاوی تعلیم ہوگئی ہے اور دینی علم کو چرچ کی طرح دینی مدرسوں تک محدود کر دیا۔ یورپ میں یہ تجربہ کامیاب تھا۔ پادری بپتسمہ دینے، شادی کرانے اور دفن کی رسومات تک محدود ہوگیا۔ یہاں بھی جب تک گورے کا اقتدار رہا، مولوی کو محدود رکھا گیا، لیکن اس کے باوجود ساری بغاوتیں اسی مدرسے کے مولوی نے کیں، پھانسیاں، جیلیں اور کالے پانی کی سزائیں اسی نے کاٹیں۔

اب یہ اپنے سخت جان رویے کی صورت پوری مغربی تہذیب کے لیے ایک خطرہ بن کر ابھرا ہے۔ پوری دنیا کے میڈیا کا رخ اسے بدنام کرنے کی جانب ہے۔ اس کے لیے ایک عجیب وغریب نعرہ بلند کیا جاتا ہے۔ انہیں مین اسٹریم میں لایا جائے۔ انہیں قومی، علاقائی اور بین الاقوامی دھارے کا حصہ بنایا جائے۔ ان تمام مدارس کو جدید نصاب تعلیم بھی ساتھ ساتھ پڑھانے پر مجبور کیا جائے۔ اس کے لیے لفظ یہ استعمال ہوتا ہے کہ انہیں مین اسٹریم میں لایا جائے، یعنی انسانی زندگی کی معراج، ترقی اور کامیابی کو صرف دنیا کی کامیابی اور ترقی مان لیا جائے اور آخرت کی کامیابی کو ایک اضافی کامیابی تصور کر کے تھوڑی بہت تعلیم دی جائے۔ یوں اس ساری دینی تعلیم کا رخ مین اسٹریم یا دھارے کی طرف مڑ جائے گا۔

جو لوگ مدرسے کے طالب علم کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنا چاہتے ہیں، تاکہ وہ دنیا میں کامیاب ہوں۔ وہ عام اسکولوں میں مذہبی تعلیم کا نام تک سننا گوارا نہیں کرتے۔ کیا اولیول، اے لیول یا میٹرک کے طالب علم کو آخرت کی کامیابی اور اس کے حصول کے علم اور عمل کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اپنے قومی دھارے یا مین اسٹریم اداروں میں دین کو اضافی حیثیت دینے کو بھی تیار نہیں اور مدارس کو قومی دھارے میں لانے کا عزم کیے ہیں۔ یہ ترقی، تہذیب اور دہشت گردی نہیں، بلکہ لائف اسٹائل کی جنگ ہے۔ یہ قومی، بین الاقوامی یا علاقائی دھارا نہیں، طرز زندگی ہے۔ یہ خسارے کا سودا ہے۔ دنیا میں کامیابی اور آخرت میں خسارے کا سودا۔ **(ماخوذ ''بیداری'' اگست ۲۰۱۵ء)**

موجود حالات میں

اہل پاکستان کے لئے بچاؤ کی صورت

آج ملت اسلامیہ جن مصائب اور مشکلات میں گھڑی ہوئی ہے، ان میں بڑھتی ہوئی دہشت گردی اور امن وامان کی غارت گری اور جان ومال کا خطرہ سب سے بنیادی مسئلہ ہے، سوال یہ ہے کہ ہمارے لئے زندگی کی راہیں تنگ کیوں ہوگئی ہیں؟

اس سلسلہ میں بعض دانشوروں کا کہنا ہے اور ان کی یہ بات بڑی حد تک صحیح ہے کہ عالم اسلام بالخصوص پاکستان کی ملت اسلامیہ بُری طرح عالمی شاہوکار کی زد میں ہے۔ عالمی شاہوکار، جس کی ڈور بین الاقوامی یہودیت کے ہاتھ میں ہے، وہ دنیا سے مذہب اور اس کی روح کو ختم کرکے، مادیت پرستی کی ہمہ گیر فضا قائم کرنا چاہتا ہے، تاکہ مسلم دنیا اپنی تہذیبی اقدار، جذبہ جہاد، حمیت دین اور اسلامی شریعت سے دست بردار ہوکر، اس کے بنائے ہوئے مادی نقشہ اور عالمگیریت کے سانچہ میں پوری طرح ڈھل سکے اور وہ دنیا کے حوالے سے اس کے شیطانی منصوبوں کی راہ میں حائل نہ ہو۔

اگر اس تجزیہ کو صحیح مانا جائے تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بعض مذہبی ودینی طبقات، مسلم امت کی تقسیم اور فرقیواریت کی لڑائی کو فروغ دینے اور اس میں اپنی توانائیاں صرف کرنے کے لئے کیوں استعمال ہوئے، نیز بعض دینی شخصیتیں جہاد کے نام پر ریاست اور ریاست کے اداروں سے تصادم اور قتل وغارت گری کی راہ پر کیوں گامزن ہوئیں؟

اس سوال کے کئی جواب ہو سکتے ہیں۔ یہ مختصر مضمون اس کا متحمل نہیں۔ تاہم اس جواب کے کچھ پہلو پیش کئے جاتے ہیں۔

پاکستان میں ریاستی سطح پر اسلام سے بغاوت اور تہذیب جدید کو غالب کرنے کی شروع سے جو روش اختیار کی گئی ہے، اس نے بعض مذہبی طبقات کی نفسیات میں ردعمل کو شامل کر دیا۔ عالمی شاہوکار نے ان کے اس ردعمل سے فائدہ اٹھا کر، ان کی اس طرح برین واشنگ کی کہ وہ اپنی سادگی کی وجہ سے عالمی کفر کی اس حکمت عملی کو سمجھنے میں ناکام

ہوئے، اور دیکھتے ہی دیکھتے انہیں بے پناہ وسائل ملنا شروع ہوگئے، ان کی عسکری نوعیت کی تربیت بھی ہونا شروع ہوئی، فرقیواریت کے لئے جنگ جو یانہ انداز بھی آنا شروع ہوا۔ بعض دینی طبقات نے اس کام کو دین کی اہم خدمت **سمجھکر**، بلکہ جہاد **سمجھکر** اس میں حصہ لینا شروع کیا۔

عالمی ساہوکار نے اس طریقہ سے ایک وار سے دو شکار کئے، ایک تو فرقیوارنہ جنگ شروع کروا کر ذہنی اور متحرک دینی قیادت کو یکے بعد دیگرے ختم کرنے کی کاوش کی اور سینکڑوں ہزاروں دینی کارکنوں کو مارا ماری کی راہ پر لگایا۔ دوم یہ کہ جہاد کے نام پر ریاست اور ریاست میں فعال کردار ادا کرنے والے افراد کو خصوصی نشانہ بنا کر، خانہ جنگی کی فضا پیدا کی۔

بعض دینی طبقات نہایت سادگی کے ساتھ عالمی ساہوکار کی اس حکمت عملی کا حصہ بنے، جس کی وجہ سے پاکستان بے پناہ مسائل کا شکار ہوا اور خونریزی اور بدامنی کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوا۔

اگر ہماری ملت کے افراد عالمی ساہوکار کے اس منصوبہ کو **سمجھکر**، اس کا حصہ بننے سے انکار کرتے تو یقیناً ہم اس المناک صورتحال سے بچ سکتے تھے، اب بھی موقعہ ہے، سنبھلنے کی ضرورت ہے، لیکن عالمی ساہوکار نے جہاد اور اپنے فرقہ کو مستحکم کرنے کے نام پر ہی نہیں، بلکہ قرضوں کے ذریعہ ہمارے حکمرانوں اور ہماری سول وفوجی نوکر شاہی کو بھی تعیش، دولت پرستی، اپنی پاکیزہ تہذیب، تہذیبی اقدار سے دوری اور مادیت پر فریفتگی کی راہ پر لگایا، چنانچہ ہر حکومت نے اپنے منظور نظر افراد کے لئے لوٹ مار اور ناجائز طریقوں سے دولت کی راہیں ہموار کیں اور قوانین کو آخری حد تک پامال کرکے، ریاستی اداروں کو اپنے ذاتی مفادات کے لئے استعمال کیا، ہمارے حکمران طبقات اور افسر شاہی کی یہ عادت ایسی مستحکم ہوئی ہے کہ وہ اب تک اس روش پر گامزن ہے۔ اس کی وجہ سے قوم کے لئے زندگی عذاب بن کر رہ گئی ہے، قوم کی اکثریت دو وقت کی روٹی کی محتاج ہوگئی ہے۔ یورپی ملکوں میں وزیراعظم تک کی یہ حالت ہوتی ہے کہ سرکاری فرائض کی سرانجامی کے علاوہ اس کے لئے سرکاری گاڑی کا استعمال روا نہیں ہوتا، جب کہ ہمارے ہاں وزیروں کو چھوڑ کر عام

سرکاری افسر تک کی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ کئی کئی گاڑیوں کے مالک ہیں۔

عالمی ساہوکار نے حکمرانوں اور سرکاری افسروں کے لئے تعیش اور قانون سے بے نیاز ہونے کی یہ زندگی اس لئے واکردی ہے، تاکہ وہ سود درسود کے قرضوں کی لعنت سے بلند نہ ہوسکیں اور قرضوں کے ذریعہ ملک کی جملہ پالیسیوں پر عالمی ساہوکار کا عمل دخل قائم وبرقرار رہ سکے۔

اس جائزہ سے اندازہ ہوگا کہ ہمارے بیشتر طبقات براہ راست یا بالواسطہ طور پر عالمی شاہوکار کے ہاتھوں کھیلتے رہے ہیں۔ عالمی ساہوکار، کہیں مذہبی جذبات بڑھا کر، جہاد کے نام پر ریاست کی قوت کو چیلنج دینے کے کام پر ابھارتا رہا ہے تو کہیں حب جاہ وحب مال کے جذبات اور خواہشات کو ابھا کر، حکمرانوں اور افسروں کو ایسی راہ پر گامزن کرتا رہا ہے، جس کا لازمی نتیجہ عالمی شاہوکار کی پالیسوں پر عمل پیرا ہونے اور ان کے غلبہ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

ہم سب کو عالمی ساہوکار کے پھیلائے ہوئے اس جال کو **سمجھکر**، اس سے بچنے اور اس سے نکلنے کی ضرورت ہے۔ دہشت گردی سے بچنے اور امن وامان کی فضا قائم کرنے اور ملک کے ہر شہری کو عزت کے ساتھ زندگی گذارنے کے مواقع فراہم کرنے کی راہ یہی ہے۔

ہم نماز میں سورہ فاتحہ میں روزانہ اللہ تعالیٰ سے **غیر المغضوب علیھم والضالین** کی دعا مانگتے ہیں۔ اور مغضوب اور گمراہ قوم یعنی یہود ونصاریٰ کی سازشوں کو **سمجھکر**، ان سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ دانائی اور ہمت وحوصلہ سے کام لیا جائے۔ **(ماخوذ ''بیداری'' جنوری ۲۰۱۵ء)**

انقلاب فرانس وانقلاب روس کے

جدید اسلامی فکر پر اثرات

اور اسلامی تحریک کے صحیح نقوش وخطوط

انقلاب فرانس نے مغرب کو جو ''تحفے'' دیئے، اس میں ریاستی واجتماعی نظام سے کلیسا ومذہب کی مکمل جدائی، خدا وحی، مذہب وآخرت جیسے عقیدوں کو عقل سے ماورٰی اور سائنسی تحقیق کے منافی سمجھکر، انہیں مسترد کرنے کے رجحانات، انسان، کائنات اور زندگی کے مسائل کو خالص سیکولرزم یعنی عقل کے ذریعہ حل کرنے کا نقطہ نگاہ، جمہوریت کے ذریعہ سرمایہ داری نظام کا تحفظ اور اس کا غلبہ، مادہ پرستی پر مبنی نظریات اور اس مادی تہذیب کو عسکری قوت، میڈیا، تعلیم وتربیت اور سامراجیت کے زور پر دنیا میں مسلط کرنے کی کاوشیں وغیرہ۔

انقلاب روس نے دنیا کو جو ''تحفے'' دیئے، اس میں الحاد ودہریت کے نظریات، کائنات کی خالص مادی تشریح، سارے محنت کش طبقات کو سرمایہ داری وجاگیرداری نظام کے خلاف برسر پیکار ہونے کے رجحانات، معاشی مساوات کے خوش نما نظریات، دنیا بھر میں کمیونزم کے خالص مادی نظریے پر قائم جماعتوں کے ذریعہ مارکسزم کے فروغ کی جدوجہد، اس سلسلہ میں دنیا بھر کے دانشوروں اور محنت کش تنظیموں کی ہر طرح سے سرپرستی کرنا وغیرہ شامل ہے۔

انقلاب فرانس اور انقلاب روس نے انسانیت کی سوچ میں خالص مادی اجزا شامل کرنے، اس کے روحانی جوہروں کی تباہی کے سلسلہ میں جو کردار ادا کیا، وہ انسانی تاریخ کا سب سے تاریک تر کردار ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ دونوں انقلاب، غیرشعوری طور پر عالم اسلام کے جدید اسلامی مفکروں پر بھی اثر انداز ہوئے۔ اور بیسویں صدی میں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ، احیائے اسلام اور غلبہ اسلام کی جو تحریکیں اٹھیں، ان کے پس منظر میں ان دونوں انقلابوں کے پیدا کردہ اثرات ونتائج کسی حد تک شامل رہے۔ اس طرح

جدید اسلامی فکر، فکری اہداف سے لے کر حکمت عملی کے معاملات تک میں ان انقلابوں سے تاثیر پذیر ہے۔

امت میں صدیوں سے اسلامی فکر کے بنیادی اہداف میں اللہ سے مستحکم تعلق کا پیدا ہونا، آخرت کی تیاری کی فکر کا غالب ہونا، اصلاح نفس کا ہونا، اپنی زندگیوں میں اسلامی شریعت کو نافذ کرنے کے لئے کوشاں ہونا، انسانی جوہروں سے بہرہ ور ہونا، اخلاق حسنہ کا حامل ہونا جیسے اہداف رہے ہیں۔

جب کہ جدید اسلامی فکر نے جدید مغربی اصطلاحات کے جواب میں اسلام کو نظام زندگی کی حیثیت دے کر، اسے ایک تحریک کی شکل دی، اس تحریک کے اصل اہداف اقتدار کا حصول، مادی ترقی، سرمایہ داری نظام کا خاتمہ اور اسلامی قوانین کا نفاذ جیسے اہداف شامل ہیں۔

اگرچہ اسلام کو نظام زندگی کی حیثیت سے پیش کرنا اور اسے تحریک کی شکل دینا، مغربی نظاموں کے جواب کے طور پر ایک ہنگامی ضرورت اور وقت کی مجبوری تھی، جو اسلامی تاریخ میں اسلامی فکر کی پیشکش میں پہلی مرتبہ استعمال ہوئی اور عام ہوئی، تاہم یہ ضرورت ایسی ہے، جو اسلامی اصطلاحوں سے متصادم بھی نہیں ہیں۔

سلف میں اسلامی تعلیمات کے بنیادی اہداف وہ تھے، جس کا اوپر ذکر ہوا، لیکن انقلاب فرانس وانقلاب روس کے نتیجہ میں دنیا میں جو علمی وفکری منہج سامنے آئے، انہوں نے جدید اسلامی مفکروں کو اسلام کے نئے اہداف متعین کرنے کی راہ پر لگایا، جس میں نظام کی تبدیلی، سرمایہ داریت کا مقابلہ، مادی ترقی اور اسلامی قوانین کا غلبہ، بنیادی نصب العینی اہداف مقرر ہوئے اور ان اہداف کے لئے تحریکوں، جماعتوں اور اداروں کا وجود عمل میں آیا، اور توانائیاں صرف ہونے لگیں۔ اس طرح جدید اسلامی فکر کی ترتیب میں نصب العین مادی ترقی، سرمایہ داری کے خلاف جدوجہد، معاشی مساوات پر مشتمل نظام کا قیام، اسلامی قوانین کے غلبہ کے لئے جدوجہد اور ریاستی نظام کی تبدیلی کا کام، بذریعہ جمہوریت یا بذریعہ انقلاب قرار پائی۔ اس فکر میں معاشرہ کی اسلامی خطوط پر تعلیم وتربیت کا کام ابتدائی نصب العین کے مددگار کی حیثیت سے شامل ہوا، یعنی اسے فیصلہ کن اہمیت کی بجائے نصب العین کے حصول کے لئے لازمی ذریعہ کی حیثیت دی گئی۔

اس فکر میں افراد کی ذاتی اصلاح کے کام کو تیسرے نمبر کی حیثیت دی گئی۔ بلکہ زیادہ بہتر طور پر ذاتی اصلاح کے کام کو نصب العین کے مقابلہ میں ذیلی حیثیت دی گئی اور یہ نقطہ نگاہ اختیار کیا گیا کہ فرد کی ذاتی اصلاح کا کام اس کا انفرادی نوعیت کا کام ہے۔ اسلامی تحریک کا، فرد کی اصلاح نفس کے کام سے اس سے زیادہ تعلق نہیں ہے کہ فرد وافراد کو توجہ دلائی جاتی رہے گی کہ وہ اپنی اصلاح بھی کرتا رہے، مگر وہ خود اپنی تحریک سے وابستہ افراد کی اصلاح نفس اور تہذیب نفس کے کام کو باقائدہ اپنی تنظیم کا حصہ نہیں بنائے گی اور اس کے لئے مربوط پروگرام تشکیل نہ دے گی، اگر دے گی بھی تو وہ وعظ ونصیحت، تقاریر، لٹریچر کے مطالعہ کی حد تک ہوگا۔ اللہ سے محبت کے استحکام کے کام کو تحریک غیر ضروری کام سمجھے گی۔

جدید اسلامی مفکروں کے بارے میں اگر یہ کہا جائے تو شاید غلط نہ ہو کہ ان کی ابتدائی ذہنی نشوونما جدید نظریات پر مشتمل لٹریچر اور جدید تعلیمی نظام کے زیر اثر یا اس کے پس منظر میں ہوئی، اس لٹریچر کے مطالعہ یا تعلیمی پس منظر سے ان کا ذہن اور تحت الشعور، باطن کی تبدیلی کی بجائے خارجی تبدیلی یعنی نظام کی تبدیلی کے کام کو نصب العینی اور فیصلہ کن اہمیت دے چکا تھا، جب تحت الشعور میں ایک ہدف متعین ہو چکا تو اس کے بعد جب ان مفکروں نے اپنی عقل اور ذہانت کی مدد سے قرآن پر غور وفکر کیا تو ان پر قرآن سے دین کا یہی ہدف واضح ہوا۔ چنانچہ اسی ہدف کے لئے انہوں نے لٹریچر تشکیل دیا، تحریکیں برپا ہوئیں اور توانائیاں صرف ہوئیں۔

چونکہ جدید مغربی تعلیمی اداروں کے زیر اثر اسلام کو نظام زندگی اور تحریک کی حیثیت سے سمجھنے کا ذہنی ماحول اور فضا پیدا ہو چکی تھی، نیز مغربی سامراج کے غلبہ کے نتیجہ میں ان سے آزادی کا جذبہ اور جدیدیت کے ذہنی پس منظر میں اسلام کو سمجھنے کا رجحان بھی موجود تھا، اس لئے جدید طبقات میں جدید اسلامی فکر کو پذیرائی حاصل ہوئی۔

یہ اعتراف کرنا ضروری ہے کہ جدید اسلامی مفکروں نے دین کا جو نیا نصب العین پیش کیا، اس کے مضمرات اپنی جگہ، لیکن اس فکر نے مغربی نظریات اور مغربی تہذیب کے خلاف جدید تعلیم یافتہ طبقات میں اسلامی شعور اجاگر کیا، نفاذ اسلامی کی جدوجہد کو ہدف قرار دے کر تہذیب جدید کے خلاف جذبات نفرت پیدا کئے، نیز جدید تعلیم ونظریات کے

حوالے سے الحاد ودہریت کی بڑھتی ہوئی تحریک کی روک تھام کی اور ہزارہا سے زیادہ ذہین افراد کو ملحدانہ فکر سے بچایا اور اسلام کے حوالے سے ان کو ایک ہدف دے کر انہیں کام سے لگایا۔ ان میں سے ایک طبقہ کی نسبتا قابل ذکر حد تک اصلاح بھی ہوئی، اس لئے کہ اسلام سے فکری وجذباتی وابستگی کے بعد جب اسلام کے لئے ان کے تحرک میں اضافہ ہوا، توانائیوں کا استعمال ہوا تو اللہ نے ان میں سے کافی افراد کی اصلاح کے راستے بھی کھول دیئے، آخر دین کے لئے وقت اور مال کے استعمال سے بھی اللہ کا فضل شامل ہوتا ہی ہے۔ ساتھ ساتھ افراد معاشرہ میں مغربی سامراج کی سازشوں کو سمجھنے اور اس سے مقابلہ کا ذہن بھی پیدا ہوا اور جدوجہد کا رخ اس سمت بھی ہونے لگا۔

(۲)

تاہم بہرحال یہ بھی حقیقت ہے کہ جدید اسلامی فکر عام طور پر عقلی سرحدوں سے آگے بڑھکر دل کی گہرائیوں تک پہنچنے اور اللہ کی محبت وعشق کے ذریعہ نفسی قوتوں کو پامال کرنے کے کام کو نہ صرف غیرضروری کام سمجھتا ہے، بلکہ اسے دین کے اصل نصب العین سے عدم ادراک کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔

جدید اسلامی فکر نے ایک اعتبار سے تو انقلاب فرانس وانقلاب روس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے الحادی نظریات اور سیکولرزم کے سامنے بند باندھا ہے اور نوجوان نسل کو ان نظریات کے سحر سے نکالا ہے، لیکن ساتھ ساتھ اس فکر نے جدیدیت سے غیرشعوری پر متاثر ہوکر، خارجی زندگی میں تبدیلی یعنی نظام کی تبدیلی کے کام کو نصب العینی کام کی حیثیت دے کر، نفس کی طاقتور حیوانی وجبلی قوتوں کے ادراک وشعور، تہذیب نفس اور اپنی اصلاح کے ارتقائی مراحل جیسے اہم کام سے بے اعتنائی کی فضا بھی پیدا کی ہے، جس کا ایک نتیجہ جو ظاہر ہوا ہے، وہ یہ ہے کہ اسلامی تحریکیں لاکھوں افراد کو وقتی طور پر اپنے قریب لانے میں تو کامیاب ہوئیں، لیکن اصلاح نفس کے کام کو فیصلہ کن اہمیت نہ دینے اور اس کے لئے واضح پروگرام نہ ہونے کی وجہ سے وہ انہیں زیادہ دیر تک سنبھال نہ سکیں اور اور مادیت کے اثرات میں بہنے سے بچانے میں کامیاب نہ ہوسکیں، ''خاکسار'' تحریک نے اسلام کے غلبہ کے نام پر لاکھوں افراد کو جمع کیا، لیکن اس کا حشر یہی ہوا، اس کے بعد بھی

دوسری تحریکوں سے ہزاروں افراد نکلتے چلے گئے اور اب تک یہی صورتحال جاری ہے۔

یہ سب اس بات کا نتیجہ ہے کہ انقلاب فرانس وانقلاب روس نے جس مادی تہذیب کو فروغ دیا ہے، اس مادی تہذیب کی سنگینی کو سمجھکر، اس کے مقابلہ کے لئے علمی وفکری محاذ کے ساتھ داخلی محاذ کے کام کو فیصلہ کن اہمیت نہیں دی گئی، داخلی محاذ کو مستحکم کئے بغیر محض عقلی اصلاح پائیدار ثابت نہیں ہوتی، بالخصوص جب مادیت پرستی کا سیلاب طاقتور صورت میں موجود ہو تو اس وقت فکری اور نظریاتی تبدیلی کے ہمراہ باطن کی اصلاح اور باطن میں موجود طاقتور حیوانی قوتوں کی تہذیب کا عمل ناگزیر ہے۔

اس کے بغیر کوئی بھی اسلامی تحریک کامیاب ہو سکے، معاشرہ کو پوری طرح تبدیل کر سکے، اسلامی معاشرہ تشکیل دے کر ریاست پر اسلامی نظام کو غالب کر سکے، ممکن نہیں۔

(۳)

انقلاب فرانس اور انقلاب روس خالص مادی فکر اور مادی نظریات کا نتیجہ تھے اور پیٹ، جنس، روٹی اور دولت ہی ان کا محور ومرکز تھے، اس لئے ان دونوں انقلابات کے نتیجہ میں مغرب ہی نہیں، بلکہ پوری انسانیت پر مادی نظریات کی گرفت مضبوط ہوئی، چونکہ سارے علوم اور تحقیق وتلاش کے سارے شعبوں، تعلیم وتربیت اور ریاست کے سارے اداروں میں انسان وکائنات کے مادی ہونے کے نظریات راسخ کردیئے گئے، اس لئے ان نظریات کے نتیجہ میں انسان کے فطری جذبات ومیلانات اور روحانی وپاکیزہ اخلاقی قدروں اور محبت ورحم کے جذبات نہ صرف بُری طرح پامال ہوئے، بلکہ ان پاکیزہ میلانات وجذبات پر درندگی اور حیوانیت کے اجزا طاقتور سے طاقتور تر ہوئے اور انسان کے سارے معاملات کو ترقی یافتہ حیوان کے نقطہ نگاہ سے دیکھنے، اور سمجھنے کی رَو بڑھی۔

اس کے برعکس اسلام کی بنیاد طاقتور ایمانی عقائد، روحانی قوتوں کی بیداری وترقی، نفسی قوتوں کی پامالی، اللہ کی محبت کے جذبات کے فروغ، اس محبت کے زیر اثر انسانوں سے محبت کی روش، دولت کو زیادہ حیثیت نہ دینے اور تہذیب نفس اور ضبط نفس پر زور، ساری زندگی، اللہ کی رضامندی کے تحت گذارنے کے عہد، اسلامی شریعت کو دستور العمل بنانے جیسی چیزوں پر رکھی گئی ہے، جدید اسلامی فکر کے حاملین چونکہ اللہ کی محبت کے زیر اثر

انسانی نفس کی طاقتور اور خوفناک قوتوں کے ادراک سے قاصر تھے، اس لئے انہوں نے اپنی فکر میں مذکورہ اسلامی فکر کے ان بنیادی اجزاء کو ضمنی حیثیت دی اور افراد کو اندر سے تبدیل کئے بغیر نظام کی تبدیلی پر ساری علمی وفکری قوتیں صرف کر ڈالی۔ دوسرے الفاظ میں انہوں نے اپنی فکر کی بنیاد خارجی زندگی میں تبدیلی کے مرکزی نکتہ پر رکھی، یہ سب نتیجہ تھا سلف کے قرآن وسنت کے نتیجۂ فکر سے صرف نظری، جدیدیت سے تاثیر پذیری، نئے دور کے انقلابوں کی طرح اسلام کو بھی انقلابی نظام زندگی کی حیثیت سے پیش کرنے کی خواہش اور عالمی سامراج سے مقابلہ کے لئے معاشرہ کو ذہنی اور خارجی طور پر بیدار کرنے کی روش کا۔

اس کی وجہ سے افراد میں اسلام کے حوالے سے شعور تو پیدا ہوا، اسلام کے لئے تحرک بھی پیدا ہوا، قربانی کے ایک حد تک جذبات بھی ابھرے، لیکن پاکیزہ اخلاقی وروحانی تربیت کے فقدان اور انسانی نفس کی گہرائیوں اور باطن میں موجود طاقتور بتوں سے ناآشنائی کی وجہ سے جدید اسلامی فکر اپنے متعلقین کی تربیت نہ کر سکا، ان میں تحمل، رواداری، جذباتِ محبت کو فروغ نہ دے سکا، اس فکر نے تنظیمی قوائد وضوابط اور فکر محض سے خوفناک نفسی قوتوں پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی، جو ظاہر ہے ممکن نہیں۔

اسلام کے بنیادی نصب العینی پیغام کو سمجھنے کے لئے ازسرنو قرآن پر غور وفکر کی ضرورت نہیں تھی، بلکہ اس کے لئے تو سلف کے اجماع پر اعتماد ضروری تھا، اور اسلام کے ان کے متعین کردہ بنیادی نصب العینی فکر کو لے کر دور جدید کے سب سے بڑے چیلنج کی حیثیت سے انقلاب فرانس وانقلاب روس کے نتیجہ میں پیدا شدہ طاغوتی نظریات، مادہ پرست تہذیب اور طاغوتی قوتوں کے مقابلہ اور اسلام کی جدید علمی اسلوب میں پیشکش پر حکمت سے کام ہوتا۔ اگر ایسا ہوتا تو جدید اسلامی فکر، افراد کی بہتر اور پاکیزہ بنیادوں پر تربیت کے کام میں بھی بڑی حد تک کامیاب ہوتا تو جدیدیت کے سیلاب کے مقابلہ کی بھی مؤثر صورت پیدا ہوتی، ساتھ ساتھ سلف کے اسلامی فکر کا صحیح نصب العینی تسلسل بھی قائم ہوتا۔ ایک بڑا فائدہ جو ہوتا، وہ یہ ہے کہ سارے دینی ومذہبی طبقات سے مفاہمت بلکہ بھرپور تعاون کی راہیں پیدا ہوتی۔

(۴)

یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ ہم اسلام کے لئے معاشرہ میں ایک ایسی طاقتور تحریک کو انتہائی ناگزیر سمجھتے ہیں، جو ہمہ جہتی سطح پر معاشرہ کو تبدیل کرکے، ریاستی نظام کی اسلامی بنیادوں پر تعمیر وتشکیل کا کام کر سکے، چونکہ ریاستی سطح پر اسلام کے نفاذ کے کام سے اسلام کے بہت سارے کام اور مصلحتیں وابستہ ہیں، اس لئے اس کام کی غیرمعمولی اہمیت ہے، یہ کام دین کا نصب العینی کام نہ ہونے کے باوجود دین کے بہت سارے کاموں کی سرانجامی کا ذریعہ ہے اور خارجی طاغوت سے مقابلہ کی بھی مؤثر صورت ہے۔ لیکن اس کام کی جو ترتیب ہے، وہ فرد وافراد کی اصلاح کے لئے ہمہ گیر پروگرام اور اسلامی بنیادوں پر معاشرہ کی تشکیل سے شروع ہوتا ہے۔

ان دونوں کاموں کا لازمی نتیجہ ریاستی نظام کی اسلامی بنیادوں پر تشکیل ہی کی صورت میں ظاہر ہوگا، اس لئے کہ معاشرہ میں دینی حمیت کے حامل انسانوں کی قابل ذکر حد تک تیاری، ریاست کے سارے اداروں پر اثر انداز ہونے کی صورت میں ہی ظاہر ہوسکتی ہے۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ معاشرہ تو اسلامی بنیادوں پر تبدیل ہوجائے، اور ریاست، معاشرہ کی اس تبدیلی کے اثرات سے محروم رہ جائے۔ لیکن یہ کام صبر آزما جدوجہد کا متقاضی ہے اور بہتر صلاحیتوں کے حامل افراد کا بھی۔ اگر معاشرہ میں دینی حمیت اور اسلامی نظریاتی شعور کے حامل تربیت یافتہ افراد کی قابل ذکر ٹیم تیار ہوجائے، جو ہر طرح کے جماعتی وگروہی تعصّبات وآلودگیوں سے بلند ہو اور جو صرف اللہ کی رضامندی کی خاطر اسلام کی سربلندی کا حوصلہ وعزم رکھتے ہوں اور اس کام میں مستقل مزاجی سے اپنی ساری توانائیوں کے استعمال کے لئے تیار ہوں تو افراد کی یہی طاقتور ٹیم ریاستی نظام تک اپنے گہرے اثرات منتقل کرکے اس کے نظام میں بہتری کا مؤثر ذریعہ بن سکتی ہے۔

معاشرہ کا سب سے بڑا المیہ یہی ہے (جس سے دوسرے سارے المیوں نے جنم لیا ہے اور سارا فساد واقع ہوا ہے) کہ اس طرح کی طاقتور اسلامی تحریک معاشرہ میں موجود نہیں۔

(۵)

مادی نظریات اور مغربی تہذیب کے علمبرداروں نے آج انسان پر سب سے بڑا جو ظلم کیا ہے، وہ یہ ہے کہ اس کے حیوانی جذبات کو آخری حد تک برانگیختہ کر دیا ہے اور اسے خوشحال مادی زندگی سے آگے بڑھکر اور اس سے بلند ہو کر پاکیزہ مقصد کے لئے زندگی گذارنے کے تصورات اور عزم وحوصلہ سے محروم کر دیا ہے۔ پیٹ، جنس اور دولت کے علاوہ زندگی کا کوئی مقصد باقی نہ رہا ہے، مسلم امت اور اسلامی تحریکیں بھی ان لہروں کی زد میں ہے۔ انسانیت اور خود مسلم معاشرے کو اس طوفانِ بلا خیز سے نکالنے کی واحد صورت ایک ہی ہے کہ انسانی نفس کی حیرت انگیز قوتوں کو سمجھکر، اسے مطیع کرنے، مہذب بنانے، بتانِ نفس کی عبادت سے انکار کرنے اور اس سے بغاوت کی تحریک کو منظّم کیا جائے۔ انسانی تاریخ میں بتانِ نفس کی پرستش کی جو ہمہ گیر تحریک، مغربی تہذیب کے زیر اثر اس دور میں طاقتور ہوئی ہے، پوری انسانی تحریک اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔

المیہ یہ ہے کہ اس دور میں مادی تہذیب کے غلبہ اور مادی زندگی کے ہمہ گیر وہمہ جہت مناظر اور مادی نظریات کے فروغ کی وجہ سے انسانی نفس کی ہولناک طاقتوں، اس کی فریب کاریوں اور اس کی سنگینی کو سمجھنے کا احساس ہی سلب ہوگیا ہے۔ جب بھی علمی سطح پر نفسی قوتوں کو مفتوح کرنے کی بات ہوتی ہے تو اسے یا تو بے وزن سمجھکر نظر انداز کر دیا جاتا ہے یا اسے گوشہ نشین افراد کا مخصوص مشغلہ ومسئلہ سمجھکر، اس سے صرف نظر کر دیا جاتا ہے۔

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ آج انسانیت کی کشتی جس ہولناک طوفان سے دوچار ہے، وہ نفس پرستی کی قوتوں کا ہمہ جہتی طوفان ہے۔ مغربی تہذیب اس نفس پرستی کے طوفان کا طاقتور ذریعہ اور عامل ہے۔

(۶)

مسلم امت کی نشاۃ ثانیہ کی تحریک، مغربی تہذیب کے طوفان کے سامنے بند باندھنے کی تحریک، معاشرہ کو اسلام اور اسلامی مقاصد کے لئے کارآمد بنانے کی تحریک، ریاست کی اسلامی بنیادوں پر تبدیلی کی تحریک، ان سارے کاموں کا دارو مدار اس بات

سے وابستہ ہے کہ معاشرہ میں ایسی طاقتور تحریک پیدا ہو، جو اسلامی نظریہ پر یقین رکھنے کے ساتھ ساتھ آتش عشق (اللہ کی والہانہ محبت) کے ذریعہ نفسی قوتوں کو جلانے یا انہیں مفتوح کرنے کی راہ پر گامزن ہو، انسانی نفس میں موجود درندے اللہ سے والہانہ محبت کی بنیاد پر شروع کی جانے والی تحریک کے بغیر مطیع ہوسکیں، اس کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ قرآن نے بھی یہ بات واضح فرمائی ہے کہ اہل ایمان کو اللہ سے نہایت شدید محبت ہے۔

یعنی اللہ سے شدید محبت کی تحریک کے بغیر معبودانِ باطل اور بتانِ نفس سے پوری طرح نجات وبچاؤ کی کوئی صورت موجود نہیں۔

(۷)

انقلاب فرانس اور انقلاب روس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی مادہ پرستی کی ہمہ گیر فضا سے بچاؤ کے لئے ہمارے لئے بہتر صورت یہی ہے کہ معاشرہ میں عقل وشعور کے ساتھ ساتھ دل کی صلاحیتوں کی بیداری اور نفسی قوتوں پر فتحیابی حاصل کرنے کی تحریک چلائی جائے۔ اور معاشرہ سے باصلاحیت افراد کی ایسی ٹیم منظّم کرکے، ان کی پاکیزہ تربیت کا انتظام کیا جائے، جس پر اللہ کی وحدانیت کا رنگ غالب ہو۔ جو داخلی وخارجی باطل سے مقابلہ کے کام کو زندگی کا ہدف سمجھنے لگیں، اس طرح کی تحریک ہی وقت کی سب سے اہم ضرورت ہے، بالخصوص انقلاب فرانس کے نتیجہ میں سرمایہ کے ارتکاز سے عالمی سرمایہ دار کو اپنے مادی مفادات کی خاطر انسانیت کو اخلاقی انارکی میں جھونکنے اور اسے مادی لذتوں کے لئے مجنون وار بنانے کی جو قوت حاصل ہوگئی ہے، اس کی اس قوت کو چیلنج کریں اور اس کا مقابلہ کریں، مقابلہ کی یہ طاقت درویش صفت، روشن ضمیر اور روشن دماغ اسلامی کارکنوں کی بڑے پیمانہ پر تیاری کے بغیر اسلامی تحریک کو حاصل ہو سکے، ممکن نہیں، جب عرصہ تک اس طرح کے افراد کی تیاری میں توانائیاں اور وقت خرچ ہوگا اور حق وصداقت کی تحریک اپنے سارے انسانی جوہروں سے سامنے آئے گی تو مادی قوتوں کے لئے فرار کے بغیر چارہ کار نہ ہوگا۔

اس وقت **وقل جاء الحق وزهق الباطل ان الباطل كان زهوقا.** کا منظر غالب ہوگا۔

اس کے لئے پہلی چیز جس کی ضرورت ہے، وہ اللہ کے ساتھ شدید محبت جسے محبوب

حقیقی کے ساتھ والہانہ عشق بھی کہہ سکتے ہیں اس کام کا ادراکِ کامل ہونا ضروری ہے، اس کے لئے دل ودماغ کی مکمل آمادگی ناگزیر ہے اور آتش عشق میں داخل ہوکر، نفسی قوتوں کو مہذب بنانے کی راہ اختیار کرنے کا لائحہ عمل شعوری طور پر اختیار کرنا پڑے گا۔

دوسری چیز جو ضروری ہے، وہ حوصلہ، صبر اور استقامت ہے۔ طویل عرصہ تک اسلامی تحریک کے کارکنوں کو آتش عشق (اللہ کی والہانہ محبت) میں جلاکر پختہ سے پختہ تر کرنا ہے، جس طرح کچی اینٹوں کی بنیاد پر کوئی بھی مستحکم عمارت کھڑی نہیں ہوسکتی، یہی صورت یہاں بھی ہے کہ اسلامی تحریک کے کارکنوں کا آتش عشق کی بھٹی میں جلنا ضروری ہے۔ اس عمل سے گزرنے کے بعد ہی یہ منظر نظر آئے گا کہ اسلامی تحریک کے آٹھ دس لاکھ کارکن عالمی سرمایہ دار اور مادہ پرست تہذیب کی فوج ظفر موج پر غالب ہوتی چلی جائے گی۔

تیسری چیز جس کی ضرورت ہے، وہ یہ ہے کہ اسلامی تحریک کو اپنے آپ کو براہ راست سیاسی محاذ پر آکر سیاسی حریف کے طور پر سامنے نہیں آنا، یہ کام اس تحریک کے ہمہ جہتی وہمہ گیر کام کے نتیجہ میں اس تحریک سے متاثر افراد ازخود شروع کردیں گے۔ جس طرح ترکی میں ہوا ہے کہ ترکی کی موجودہ سیاسی جماعت جو دس سال سے حکمران رہی ہے، جس کو مغرب اپنے لئے خطرہ سمجھتا ہے۔ یہ اصل اسلامی تحریک نہیں ہے، بلکہ اصل اسلامی تحریک پس منظر میں وہ درویش اور اللہ کی محبت کے حامل افراد کی تحریک ہے، جو ستر، اسی سال سے ترکی میں اسلامی نشاۃ ثانیہ کا کام کررہی ہے، سیاسی میدان میں تبدیلی اس تحریک کا ایک حصہ ہے یا اس کا نتیجہ ہے۔

چوتھی چیز جس کی ضرورت ہے، وہ وقت کے ہاتھ پر نبض رکھتے رہنا ہے کہ کفر کی عالمی قوت کی حکمت عملی کیا ہے، اس حکمت عملی کے مقابلہ میں معاشرہ کو تبدیل کرنے کے سلسلہ میں ہماری حکمت عملی کیا ہونی چاہئے۔

لیکن ان ساری چیزوں سے بھی اولین بات یہ ہے کہ اسلامی تحریک قرآن وسنت اور سیرت پاک کو بنیاد بنانے کے ساتھ ساتھ اسلام کے بنیادی اہداف اور فرائض وواجبات کے معاملات میں سلف کے اسلامی فکر سے تجاوز نہیں کرے گی، البتہ نئے معاملات میں وہ غوروفکر سے کام لے کر راہیں نکالے گی۔

اسلامی تحریک ہرصورت میں مسلم امت کی وحدت کو پیش نظر رکھے گی، نئے گروہ کو

(جو امت پن سے ہٹ کر ہو،) جنم ہرگز نہیں دے گی۔ اسلامی تحریک ہرطرح کے تعصّبات سے پاک ہوگی۔ اسلامی تحریک کا اہم کام جدید تعلیم یافتہ افراد کو جدیدیت کے سارے فتنوں سے بچاکر، اس کی ذہنی، اخلاقی وروحانی تربیت ہوگی۔

اسلامی تحریک ذہنی تربیت کے کام کو بھی بنیادی اہمیت دے گی۔ مادیت کی فلسفیانہ بنیادوں اور اس کے نظریات پر علمی وتنقیدی کام کو ترجیح دے گی، اس مقصد کے لئے علمی اداروں اور تعلیمی وتربیتی اداروں پر زیادہ زور صرف ہوگا۔

اسلامی تحریک کی مزید خصوصیات کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے۔

- اسلامی تحریک کے کارکن آپس میں ایک دوسرے سے والہانہ محبت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ دکھ سکھ میں ایک دوسرے کے کام آتے ہیں، وہ اپنے غریب ساتھیوں کو اپنی اضافی دولت میں شریک کار بناتے ہیں، تاکہ ان کی معاشی پریشانیوں میں کمی واقع ہو۔
- اسلامی تحریک کی قیادت اور اس کے کارکن ہرطرح کی تنقید سننے کے معاملہ میں روادار ہوتے ہیں، بالخصوص اخلاص، اور خیرخواہی سے کی جانے والی تنقید کو وہ دل میں جگہ دیتے ہیں اور اس سلسلہ میں وہ وسیع ظرف ہوتے ہیں، جس سے ان پر اپنی کمزوریوں اور حکمت عملی کے نقائص واضح ہوتے رہتے ہیں، اس طرح اپنی غلطیوں کی اصلاح کرکے، وہ آگے بڑھنے کے لئے کوشاں ہوتے ہیں۔
- اسلامی تحریک کے معاملات باہمی مشاورت سے طے ہوتے ہیں، ان کی پالیسیوں میں کسی ایک فرد کی رائے مسلط نہیں ہوتی، بلکہ ذہین وسمجھدار ومخلص افراد پر مشتمل شوریٰ آزادانہ غوروفکر کے ساتھ پالیسیاں طے کرتی ہے۔ اور وہ **ومشاورھم فی الامر** کے قرآنی اصول پر گامزن ہوتی ہے۔
- اسلامی تحریک کی قیادت ولیڈر شپ کسی جداگانہ امتیازی مقام کی حامل نہیں ہوتی، اس کی معاشی ومعاشرتی حیثیت زیادہ بلند نہیں ہوتی، وہ سادگی کا نمونہ ہوتی ہے۔ اور کارکنوں کو ہر وقت دستیاب ہوتی ہے۔
- اسلامی تحریک اپنی قوت، اپنی صلاحیتوں اور اپنی استعداد سے زیادہ کام ہاتھ میں نہیں لیتی، نہ وہ اپنے دائرہ کار سے باہر کا کام ہاتھ میں لیتی ہے، مثلاً اس کے پاس پورے ملک سے دوچار ہزار کی افرادی قوت ہوتی ہے تو وہ اس افرادی قوت کے ساتھ پورے

ملک کے حالات اور ملک کی قسمت بدلنے کا کام ہرگز ہاتھ میں نہیں لیتی، بلکہ صبر واستقامت سے مسلسل کام کرتے رہنے سے جوں جوں اسے معاشرہ سے قابل ذکر افرادی قوت ملتی جاتی ہے، وہ حکمت کے ساتھ اپنے دائرہ کار کو بڑھاتی رہتی ہے۔ وہ دوہزار من اٹھانے والے کارکنوں پر لاکھوں من وزن ڈالنے کی حماقت نہیں کرتی۔

• اسلامی تحریک اپنی حکمت عملی اور پالیسیوں میں غوروفکر کا دوروازہ بند نہیں کرتی۔ اور غلط حکمت عملی کے واضح ہوجانے کے بعد اس پر بضد نہیں ہوتی، بلکہ خوداحتسابی سے کام لیتے ہوئے کھلے دل سے اس کا اعتراف کرتی ہے۔ اور اس سے بہتر حکمت عملی اختیار کرکے، وسعت فکر ووسعت ظرفی کا مظاہرہ کرتی ہے۔

• اسلامی تحریک وقتی اور ہنگامی سیاست میں اپنے وقت اور توانائیوں کے استعمال کی متحمل نہیں ہوتی۔ اس کی بیشتر صلاحیتیں کارکنوں کی تربیت اور معاشرہ کی اسلامی تشکیل کے کاموں میں صرف ہوتی ہیں۔ اس کے مزاج میں اللہ سے ملاقات اور آخرت میں اس کے سامنے جواب دہی کا احساس رچا بسا ہوتا ہے، اس لئے اسلامی کارکن فضولیات، لایعنی کاموں وباتوں، اور ہنگامی سیاسی تبصروں میں وقت کے ضیاع کے متحمل نہیں ہوتے۔

• اسلامی تحریک اور اس کے کارکن ملت کے مسائل کو اپنے مسائل سمجھتی ہے اور وہ ملت اسلامیہ کے لئے مضطرب رہتی ہے اور اپنے وسائل اور صلاحیتوں کے مطابق ملت کے مظلوم طبقات اور مظلوم مسلمانوں کی مدد بھی کرتی رہتی ہے۔ اس معاملہ میں اس کے سامنے یہ حدیث رسول ہوتی ہے کہ جسے ملت کے مسائل کی فکر نہیں، وہ ہم میں سے نہیں۔

• اسلامی تحریک کی قیادت اور اس کے کارکن، پروپیگنڈہ، پبلسٹی، سستی شہرت، خودنمائی اور نام وری جیسی چیزوں سے دور رہتے ہیں، البتہ خود احتسابی کے ساتھ حالات ومسائل کے معاملہ میں اخبارات ومیڈیا میں اپنے موقف کے اظہار سے وہ دریغ نہیں کرتے۔

• اسلامی تحریک کے کارکن اپنے حلقہ سے باہر کی دینی ومذہبی وعلمی شخصیتوں کا احترام خاطر ملحوظ رکھتے ہیں اور ان سے عقیدت کا تعلق قائم رکھتے ہیں۔

• اسلامی تحریک کے پاس تھنک ٹینک کا انتظام ہوتا ہے، جو اپنی دانش کو استعمال کرتے ہوئے امت کو درپیش چیلنج، اس سے نمٹنے کے لئے حکمت عملی، عالمی کفر کی اسلام اور ملت کے حوالے سے نئی حکمت عملی اور معاشرہ میں اسلامی تحریک کے نفوذ کے لئے نئی نئی

راہوں کے تعین جیسے معاملات میں اسے مشورے اور خطوط متعین کردیتی ہے، ان مشوروں اور خطوط پر غوروفکر کرکے، اسلامی تحریک اپنے دائرہ کار میں رہتے ہوئے ان سے بھرپور استفادہ کرتی ہے۔

• اسلامی تحریک ایسی فکر اور ایسے فکری خطوط سے احتراز کرتی ہے، جس سے اس کے کارکنوں یا معاشرہ میں مسلم ریاست کے خلاف خروج کی صورت پیدا ہو، اس لئے کہ یہ خروج ایسے فساد کو جنم دے گا، جس سے قتل وغارت کی فضا عام ہوگی اور مسلم ریاست ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگی۔

• اسلامی تحریک کفر کی مقامی وعالمی قوتوں کے علاوہ سب سے خیرسگالی کا مظاہرہ کرے گی۔ اور سب کے ساتھ رواداری کی راہ پر گامزن ہوگی۔

• اسلامی تحریک کو حکومت کی غیراسلامی اور غلط پالیسیوں پر اخلاص ودردمندی سے تنقید کرنے کی ضرور کوشش کرتے رہنا چاہئے، لیکن عملی سیاست میں شریک ہوکر، اسے محاذ آرائی کی راہ پر گامزن ہونے سے ہرممکن حد تک بچنا چاہئے۔

• اسلامی تحریک الحب للہ والبغض للہ کے اصول پر گامزن ہوتی ہے اور اس کی دوستی ودشمنی محض اللہ کے لئے ہوتی ہے۔

• ہر باطل اور ہر طاغوت کے خلاف جہاد اسلامی تحریک کا ہدف ہوگا، لیکن اس جہاد کی نوعیت علمی، نظریاتی، دعوتی، تعلیمی وتربیتی اداروں کے استحکام کے جہاد کی ہوگی، جب تک افرادِ معاشرہ کی قابل ذکر تعداد اسلام سے ہمہ آہنگ نہیں ہوتی، تب تک اسلامی تحریک کے دوسرے اور تیسرے مرحلے کے کام کا شروع ہونا، حکمت کے سخت منافی ہوگا۔

• اسلامی تحریک کا علمی اور نظریاتی محاذ مستحکم ہوگا۔ خلاف اسلام نظریات کی علمی تردید اور اسلام کو جدید اسلوب میں پیشکش کے سلسلہ میں اس کے باصلاحیت افراد زیادہ سے زیادہ متحرک ہوں گے، تاکہ جدیدیت سے علمی طور پر مرعوبیت کی صورتیں مسدود ہوں اور اسلامی فکر پر اعتماد کی صورت پیدا ہوتی جائے۔

• اعلائے کلمۃ اللہ اور غلبہ دین، اسلامی تحریک کے اہداف میں شامل ہوگا۔ لیکن اس کی ترتیب کارکنوں کی بہتر اسلامی تربیت، ان کے تزکیہ کے خصوصی اہتمام، تعلق باللہ کے استحکام، دنیا کے مقابلہ میں آخرت کی زندگی کے فکر کے غلبہ، افراد معاشرہ کی اسلامی خطوط پر تربیت کے لئے بڑے پیمانہ پر کاموں میں توانائیاں صرف کرنا ناگزیر ہے۔

ان دعوتی مراحل سے گزرنے کے بعد ہی ریاستی سطح پر اعلائے کلمۃ اللہ اور غلبہ دین کی راہیں ہموار ہوسکتی ہیں اور اس کے لئے سیاسی محاذ میں کام کے لئے راہوں کی ہمواری کی صورت بھی پیدا ہوسکتی ہے۔

- اسلامی تحریک کے فکر کی اسلامی بنیادیں وہی ہوں گی، جو سلف صالحین کی پیش کردہ ہیں، جس میں عبادت وعبدیت کے رنگ کا استحکام دین کے مقاصد میں شامل ہے۔

جدید اسلامی فکر کا یہ نقطہ نظر کہ نماز، حج، روزہ زکوٰۃ اور ذکر وفکر وغیرہ، یہ ساری چیزیں بڑے جہاد کی تیاری کا ذریعہ ہیں۔ وہ جہاد حکومت الٰہیہ کے لئے جدوجہد کا جہاد ہے۔ اس فکر سے عبادت وعبدیت کا رنگ مستحکم ہو، سیرت وکردار میں پاکیزگی پیدا ہو، تزکیہ نفس اور تہذیب نفس کی صورت پیدا ہو، صبر، بُردباری، رواداری، توکل، قناعت، اور زہد جیسے اوصاف حمیدہ پیدا ہوں، کارکنوں کے باہمی تعلقات میں للھیت کا رنگ غالب ہو، حقیقی حمیت دین پیدا ہوکر اپنی ساری توانائیاں اللہ کی رضامندی کی جدوجہد میں صرف ہوں، ممکن نہیں، اس لئے اسلامی تحریک کے صحیح فکری اہداف سلف صالحین اور علمائے ربانیین کے فکر سے ہی ماخوذ ہوں گے۔ اور اس سلسلہ میں جدید اسلامی فکر پر نظر ثانی کی ضرورت ہوگی۔ اور اس فکری سانچہ سے اوپر اٹھکر، تزکیہ اور تعلق باللہ جیسے کاموں کو فیصلہ کن اہمیت دینا ہوگی۔

مستقبل قریب کی اسلامی تحریک کے یہ وہ چند اہم اور بنیادی خطوط ہیں، جو پیش کئے گئے ہیں، ان خطوط سے موجودہ اسلامی تحریکوں کا استفادہ کرنا، اس لئے مشکل نظر آتا ہے کہ یہ تحریکیں کسی بھی ایک مفکر کی فکر کی بنیاد پر قائم ہیں، اس فکر میں سلف صالحین کی اسلامی نصب العینی فکر سے استفادہ کم سے کم ہے اور پھر یہ مفکرین آتش عشق میں جل کر نفسی قوتوں کو مفتوح کرنے کے بتدریج مراحل سے گزرنے کی راہ سے آشنا نہیں۔ البتہ عقل، علم اور طویل تجربات ومشاہدات کے ذریعہ وہ بالواسطہ طور پر نفسی قوتوں کے ایک حد تک فہم تک پہنچے ہیں۔

نئے دور کے چیلنج سے مقابلہ اور اسلامی تحریک کے سلسلہ میں یہ خطوط ونقوش جو پیش کئے گئے ہیں، وہ جدیدیت کے وسیع مطالعہ، سلف کی فکر اور ان کے اداروں سے بھرپور استفادہ اور جدید تنظیموں وتحریکوں کے قریبی مشاہدہ کا حاصل ہیں۔

معاشرہ کو درپیش چیلنج

اور اس سے عہدہ برآ ہونے کی صورت

(''دارالعرفان'' کے تحت واہ کینٹ ۔ راولپنڈی میں منعقدہ اہل علم واہل دانش اور دینی تنظیموں کے ذمہ داروں کی نشست کے لئے لکھا گیا مقالہ)

میں حضرت مولانا احسان الحق الحسینی صاحب کا تہہ دل سے ممنوں ہوں کہ انہوں نے مجھے اہل علم، اہل دانش اور مختلف دینی تنظیموں کے ذمہ داروں کے سامنے اپنے درد دل کو رکھنے کا موقعہ عنایت فرمایا۔

موجودہ دور میں مولانا احسان الحق الحسینی صاحب، طبقہ مشائخ میں اس اعتبار سے منفرد حیثیت کے حامل ہیں اور دوسرے مشائخ کے لئے قابل تقلید بھی، کہ وہ امت کے ہر مکتبہ فکر کے اہل علم اور ان کے ذمہ داروں سے قربت کا تعلق رکھتے ہیں اور ان سے دل سے محبت رکھتے ہیں اور ساری دینی جماعتوں وتنظیموں کے کام کی قدر کرتے ہیں، نیز وہ اپنے مریدوں کے حلقہ میں بند رہنے کے بجائے مختلف دبستہائے فکر سے وابستہ شخصیتوں سے دوستانہ نوعیت کے تعلقات رکھتے ہیں۔ اور دوسروں سے خیر کے اجزاء حاصل کرنے میں بخل وتنگی سے کام نہیں لیتے۔

برصغیر ہند میں اس دور میں طبقہ مشائخ وعلماء میں اس روایت کو فروغ دینے میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ کا کردار سب سے زیادہ اہم اور فیصلہ کن ہے۔

آج ہم جس دور میں رہ رہے ہیں، وہ اس اعتبار سے قیامت خیز دور ہے کہ ایک طرف ہماری نسلیں مادیت پرستی کے عالمگیر نظریات کی زد میں ہیں تو دوسری طرف تہذیب جدید نے انسانی اقدار اور تہذیب ومذہب کے ہزاروں سالوں کے قیمتی ورثے کو بے وقعت بنا دیا ہے اور ہماری جدید نسلیں جدید تعلیمی اداروں سے ایک ہی جذبہ وجنوں لے کر نکلتی ہیں کہ ان کی مادی زندگی حسین سے حسین تر ہوجائے اور انہیں دوسروں

پر برتری حاصل ہو، اور مادی آسائش کا ہر وہ سامان جو نئی نئی کمپنیاں بناتی ہیں، وہ ان کے ہاں موجود ہو، نیز معاشرہ کے ذہین افراد کی زندگی کا نصب العین کروڑ پتی اور ارب پتی بننے کے علاوہ اور کوئی ہدف باقی نہ رہا ہے۔

عالمی پس منظر میں اگر ہم اپنے معاشرہ کے حالات کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ اس وقت دنیا کے ہر ملک اور خود ہمارے اپنے ملک میں ایک ہی جنگ برپا ہے وہ دین ولا دینیت اور مذہب ولا مذہبیت کی جنگ ہے۔ عالمی سرمایہ دار اور ان کے ہمہ نوا مقامی ساتھی جو میڈیا سرمایے اور نظام تعلیم پر قابض ہیں، ان کی ساری کوشش یہ ہے کہ مذہب کے اثرات کا قلع قمع ہو، تاکہ ان کی سرمایہ داری کی صنعت جو نفسی قوتوں کو مشتعل اور بے قابو کرنے سے وابستہ ہے۔ اس صنعت کو فروغ حاصل ہو۔

مسلم معاشرہ کو درپیش یہ چیلنج ایسا ہے، جس نے انسانی اقدار اور پاکیزہ تہذیب کے حوالے سے وعظ ونصیحت کی باتیں سننے اور ان کے اثرات کو قبول کرنے سے محروم کر دیا ہے، اس لئے کہ جب عالمگیر سطح سے لے کر معاشرہ کی سطح تک، گھر ولی تربیت سے لے کر تعلیمی اداروں اور بازار کی سطح تک کے تربیت کے اثرات خالص مادی نوعیت کے ہوں گے، اس تربیت میں جعل سازی، دھوکہ دہی اور فریب کاری سے انسانی جوہروں کی قیمت پر مالی طور پر بڑا بننے کے جنوں کی روش غالب ہو تو اس سے معیشت ومعاشرت، سیاست، اور اجتماعی زندگی میں جو بھی فساد برپا ہو، وہ کم ہے۔

ہمارے ہاں موجودہ مغربی نظام تعلیم نے ہم پر جو ظلم ڈھایا ہے، اس کا یہ پہلو بہت ہی المناک ہے کہ اس نظام تعلیم سے نکلنے والا ہر فرد وہ چاہے سیاستداں ہو یا تاجر وسرمائیدار، وہ ڈاکٹر ہو یا انجنیئر، یا ٹیکنیکل ماہر، ان سب کی کی کاوش یہ ہوتی ہے کہ جائز وناجائز ہر طریقہ سے دولت کا رخ ان کی طرف ہو، یہ دولت قومی خزانہ پر لوٹ مار کے ذریعہ حاصل ہو، یا عالمی سرمائیدار سے سازباز کرکے، اس کے مقاصد کے لئے استعمال کے ذریعہ، عام لوگوں سے معائنہ اور آپریشن کی فیس اور ٹیسٹوں کی رپورٹوں کے بہانے ان کا خون پسینہ نچوڑ کر حاصل ہو یا رشوت اور کمیشن کے ذریعہ۔ بس انہیں تو ہر قیمت پر دولت حاصل ہو، انسانیت پامال ہوتی ہو تو اس سے انہیں کوئی غرض نہیں، اس نظام نے سنگ دلی اور قساوت قلبی کی نئی مثالیں قائم کردی ہیں، اور معاشرہ ان مثالوں سے بھرا ہوا ہے۔

مزاج، نفسیات اور ذہنیت میں برپا شدہ اس فساد نے ہمارے معاشرہ کو اخلاقی اعتبار سے تباہی کے دہانے کھڑا کر دیا ہے۔

معاشرہ کو درپیش ایک اور چیلنج جو جدیدیت کا سب سے بُرا تحفہ ہے، (جس کا اوپر اشارہ ہوا ہے) وہ خدا، انسان، کائنات اور زندگی کے بارے میں سیکولرزم اور عقلیت پر مشتمل جدید نظریات ہیں، جس نے ہماری ذہین نسلوں کو بُری طرح متاثر کیا ہے، قومی سطح پر سیکولر اور ترقی پسند دانشوروں کا ایک مؤثر حلقہ ہے، جو اس فکر کو فروغ دیتا رہا ہے کہ انسانی مسائل کے حل کے لئے خدا، وحی اور رسالت کی طرف دیکھنے کی بجائے عقلیت (جسے سیکولر طرز فکر کا نام دیا جاتا ہے) ہمارے لئے کافی ہے، جس طرح اہل مغرب نے اجتماعی زندگی سے مذہب کو نکال کر سیکولرزم کے ذریعہ ترقی کی منازل طے کی ہیں، ہماری ترقی وکامیابی کا معراج بھی سیکولرزم ہی ہے۔

اس سیکولرزم اور ترقی پسندی کی سب سے خطرناک صورت سندھ وبلوچستان کے ذہین طبقات میں نظر آتی ہے کہ وہ مادیت پرستی کے جدید نظریات ہضم کرکے، سرے سے دین وایمان کے بنیادی عقائد ہی سے دستبردار ہو چکے ہیں، ہمارے ہاں سندھ میں ایک درجن سے زیادہ تنظیمیں ہیں، جن سب کا ہدف قوم پرستی، عقلیت پسندی اور دین ومذہب اور اس کے عقائد سے آزاد سیکولرزم، جدلیاتی مادیت کا نظریہ اور انسان، حیوان کی ترقی یافتہ صورت ہے، جیسے نظریات ہیں۔ ہمارے ہاں سندھ میں پچھلے اَسی (۸۰) سال سے ان نظریات کے فروغ کے لئے کام ہو رہا ہے اور مختلف نظریاتی تنظیموں نے انسان، کائنات اور تخلیق کائنات کے مادی ہونے کے موضوع پر ایسا لٹریچر تیار کرکے، اپنے کارکنوں کے نصاب میں رکھا ہے، جس سے ہزارہا ذہین افراد مادیت پرست نظریات کے سانچہ میں ڈھل چکے ہیں۔ اس وقت سندھی میڈیا پر مکمل طور پر ان نظریات کے حامل افراد کا قبضہ ہے۔

مختصرا یہ ہے وہ چیلنج، جو اس وقت مسلم معاشرہ کو درپیش ہے۔ اس چیلنج کی نوعیت کو سمجھنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اس کے بغیر اپنی نسلوں کو مغرب کی مادہ پرست قوموں کی طرح مادیت پرستی کے سیلاب میں بہنے سے بچانا مشکل ہے۔ ہماری نظر میں اس چیلنج سے عہدہ برآ ہونے کی صورت کا پیدا ہونا بہت زیادہ دشوار نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ

دین سے وابستہ اہل علم حلقے اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی کی فکر کریں اور صحیح سمت اور صحیح خطوط پر کام شروع کریں۔

اس سلسلہ میں پہلی چیز جس کی ضرورت ہے، وہ یہ ہے کہ ہم اپنے دائراتی خولوں سے بلند ہوکر، مسلم امت کو امت پن کی حیثیت سے دیکھیں اور امت کے مسائل کو اپنے مسائل سمجھیں، جب امت، دینی، اخلاقی اور روحانی طور پر موت وزندگی کے مسائل سے دوچار ہو، ایسے حالات میں اپنے جماعتی گروہوں اور دائراتی خولوں کے علاوہ سب کے دین وایمان کو مشکوک یا کم تر سمجھنے کی روش ایسی ہے، جو حکمت کے سراسر منافی ہے۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ ہمیں دردمند مسلمان کی حیثیت مسلم امت سے بھی آگے بڑھکر، پوری انسانیت کی فکر اور درد کا حامل ہونا چاہئے کہ کسی طرح انسانیت تک توحید ورسالت کا پیغام پہنچ سکے، تاکہ انسانیت کے لئے دنیا وآخرت میں نجات وبہتری کی صورت پیدا ہو سکے۔

دوسری چیز، جو دین سے وابستہ اہل علم کے لئے سخت ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ پچھلے دوسو سال سے علوم نے جو ترقی کی ہے، اس عرصہ میں انسانی ذہن نے جو ارتقا کی ہے اور جن علوم کی بنیاد پر جدید تعلیمی اداروں میں ذہنوں کی نشوونما ہوتی ہے، ان علوم ونظریات اور اس کے پس منظر اور اس کے تجزیاتی مطالعہ کی ضرورت ہے، تاکہ جدید تعلیمی اداروں سے ہر سال لاکھوں کی تعداد میں نکلنے والے جدید افراد کو ہم ان کی ذہنی استعداد کے مطابق ان سے تبادلہ خیال کرنے کی صلاحیت کے حامل ہوں اور ان تک دین کے بنیادی حقائق ان کی زبان واسلوب کے تحت ان کے سامنے پیش کرسکیں اور جمعہ کے تقریروں اور درس قرآن کے حلقوں میں یہ اسلوب بیان عام ہو سکے۔ اس سلسلہ میں عالم اسلام میں پچھلے ڈیڑھ سو سال سے جدید اسلامی مفکروں کی طرف سے جو کام ہوا ہے، دیندار اہل علم کے لئے اس کام سے استفادہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔

معاشرہ کو درپیش چیلنج سے عہدہ برآ ہونے کے لئے تیسری چیز، جس کی سب سے زیادہ ضرورت ہے، (جسے مجھے سب سے پہلے پیش کرنا چاہئے تھا) وہ علمائے ربانی، اہل اللہ اور صاحبان دل کی صحبت سے تزکیہ نفس، تہذیب نفس اور باطنی رزائل کی اصلاح اور اخلاق کی پاکیزگی کا عمل ہے، جس کے بغیر معاشرہ کو درپیش چیلنج سے عہدہ برآ ہونے کی صورت کا پیدا ہونا غیر معمولی طور پر دشوار ہے، اس لئے کہ انسانی تاریخ کے آغاز سے

اب تک معاشرہ میں جو فساد برپا ہوتا رہا ہے، وہ سب کا سب نفس کی کارستانی کا نتیجہ رہا ہے۔ یہ نفس اور نفسی قوت ہی ہے جو فرد وافراد کو دعوائے الوہیت کی راہ اختیار کرنے، دوسروں پر برتری حاصل کرنے، علم، ذہانت اور دولت اور اقتدار کو لامحدود دولت واقتدار وشہرت کے حصول کی راہ پر گامزن کرنے پر اکساتا رہا ہے۔ اسی نفسی کی اصلاح وتہذیب کے لئے اللہ تعالیٰ ہر دور میں نبی ورسول مبعوث فرماتے رہے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا جارہا ہے، ''**اذْهَبْ إِلَى فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَى فَقُلْ هَل لَّكَ إِلَى أَن تَزَكَّى**'' فرعون کی طرف جاؤ کہ وہ سرکش ہوگیا ہے۔ پس اسے کہو کہ کیا تو چاہتا ہے کہ تیرا تزکیہ ہو. اس آیت کی رو سے حضرت موسیٰ علیہ السلام تزکیہ کی دعوت لے کر فرعون کے پاس تشریف لائے تھے۔ اگرچہ قرآن کی دوسری آیت سے یہ بھی ہوتا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے تزکیے کی راہ اختیار کرنے سے ناامیدی ہوئی تو آپ نے اسے کہا کہ بنی اسرائیل کو میرے حوالہ کردو تاکہ ان کے تزکیہ واصلاح کی صورت پیدا ہو۔

قرآن میں تزکیہ کو رسول اللہ ﷺ کے مقاصد بعثت میں شامل فرمایا گیا ہے۔ **كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولاً مِّنكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ.**

(جس طرح تم لوگوں میں ہم نے تم ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو تم کو ہماری آیات پڑھکر سناتے ہیں اور تمہارا تزکیہ کرتے ہیں اور تمہیں کتاب اور حکمت کی باتیں بتاتے ہیں)۔

اس طرح کی چار قرآنی آیتیں ہیں، جن میں آپ ﷺ کی ایک حیثیت مزکی و مربی والی بیان فرمائی گئی ہے۔ رسالت کے خاتمہ کے بعد تزکیہ کا یہ کام صحابہ کرام کی طرف منتقل ہوا، اس کے بعد تابعین وتبع تابعین کی طرف، بعد ازاں علمائے ربانی اور اہل اللہ ہر دور میں لوگوں کے تزکیہ کا فریضہ سرانجام دیتے رہے۔ امت کا تسلسل یہی ہے کہ محض ظاہری علوم کے حصول پر اکتفا نہیں کیا گیا، بلکہ ظاہری علوم کے بعد طالب برسوں تک اہل اللہ کی صحبت میں رہ کر باطنی اصلاح اور تہذیب نفس کے لئے مجاہدے کرتے رہے ہیں۔

اہل اللہ کی صحبت دراصل معرفت نفس ومعرفت رب کا سب سے بہتر اور مؤثر ذریعہ ہے۔ اور معرفت کے بغیر علم وذہانت اور دعوتی کام خطرات سے خالی نہیں۔ قرآن، گمراہ

قوموں کے ذکر میں یہ بات واضح کرتا ہے کہ ان کے پاس علم کی کمی نہیں تھی، وہ حق کو سمجھ چکے تھے، لیکن ظلم اور تکبر کی وجہ سے انہوں نے انبیاء کرام سے سرکشی کا راستہ اختیار کیا۔

فرعونیوں کے بارے میں آتا ہے۔

وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنفُسُهُمْ ظُلْماً وَعُلُوّاً ۔ انہوں نے اس کا (یعنی حق کا) انکار کیا ظلم اور تکبر کی وجہ سے، حالانکہ ان کے دلوں میں اس کے حق ہونے کا یقین پیدا ہو چکا تھا۔ قرآن میں اہل کتاب کے بارے میں بھی اس طرح کی متعدد آیات موجود ہیں۔

ایک دوسری آیت اس طرح ہے۔

وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيراً مِّنْهُم مَّا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ طُغْيَاناً وَكُفْراً. (المائدہ آیت ۶۴)

(اور جو کلام تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل ہوا ہے، اس سے ان میں سے اکثر لوگوں (یعنی اہل کتاب) کی سرکشی اور کفر میں اضافہ ہوگا)۔

أَفَكُلَّمَا جَاءكُمْ رَسُولٌ بِمَا لاَ تَهْوَى أَنفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيقاً كَذَّبْتُمْ وَفَرِيقاً تَقْتُلُونَ . (کیا جب کبھی کوئی پیغمبر تمہارے پاس ایسے احکام لائے جن کو تمہارا دل نہ چاہتا تھا تم نے تکبر کرنا شروع کر دیا، سو بعضوں کو تو تم نے جھٹلایا اور بعضوں کو قتل ہی کر ڈالتے تھے)۔

ہم ہر نماز میں اللہ سے **اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنعَمتَ عَلَيْهِمْ.** کی دعا مانگتے ہیں۔ یعنی ہمیں سیدھا راستہ دکھا، ان لوگوں کا راستہ جو انعام یافتہ ہیں۔ ''معارف القرآن'' میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ نے اس آیت کی بہت عمدہ تشریح فرمائی ہے لکھتے ہیں:

''یہاں ایک بات قابلِ غور ہے اور اس میں غور کرنے سے ایک بڑے علم کا دروازہ کھلتا ہے، وہ یہ کہ صراط مستقیم کی تعیین کے لیے بظاہر صاف بات یہ تھی کہ صراط الرسول یا صراط القرآن فرما دیا جاتا، جو مختصر بھی تھا اور واضح بھی، کیوں کہ پورا قرآن درحقیقت صراطِ مستقیم کی تشریح ہے، اور پوری تعلیمات رسولؐ اسی کی تفصیل، لیکن قرآن کی اس مختصر سورۃ میں اختصار اور وضاحت کے اس پہلو کو چھوڑ کر صراط مستقیم کی تعیین فرمایا کہ اگر سیدھا راستہ چاہتے ہو تو ان لوگوں کو تلاش کرو اور ان کے طریق کو اختیار کرو، قرآنِ کریم نے اس جگہ نہ یہ فرمایا کہ قرآن کا راستہ اختیار کرو، کیوں کہ محض کتاب، انسانی تربیت کے لئے

کافی نہیں، اور نہ یہ فرمایا کہ رسولؐ کا راستہ اختیار کرو، کیوں کہ رسول کریم ﷺ کی بقا اس دنیا میں دائمی نہیں، اور آپؐ کے بعد کوئی دوسرا رسول اور نبی نہیں، اس لیے صراطِ مستقیم جن لوگوں کے ذریعہ حاصل ہوسکتا ہے، ان میں نبیین کے علاوہ ایسے حضرات بھی شامل کر دیے گئے، جو تا قیامت ہمیشہ موجود رہیں گے، مثلاً صدیقین، شہداء، اور صالحین۔

خلاصہ یہ ہے کہ سیدھا راستہ معلوم کرنے کے لیے حق تعالیٰ نے کچھ رجال اور انسانوں کا پتا دیا ہے، کسی کتاب کا حوالہ نہیں، ایک حدیث میں ہے کہ جب رسول کریم ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو خبر دی کہ پچھلی امتوں کی طرح میری امت بھی ستر فرقوں میں بٹ جائے گی، اور صرف ایک جماعت ان میں حق پر ہوگی، تو صحابۂ کرام نے دریافت کیا کہ وہ کون سی جماعت ہے؟ اس پر بھی آنحضرت ﷺ نے جو جواب دیا ہے، اس میں بھی کچھ رجال اللہ ہی کا پتا دیا گیا ہے، فرمایا: ''**ما انا وعلیه اصحابی**'' یعنی حق پر وہ جماعت ہوگی جو میرے اور میرے صحابہؓ کے طرز پر ہو۔

اس خاص طرز میں شاید اس کی طرف اشارہ ہو کہ انسان کی تعلیم وتربیت محض کتابوں اور روایتوں سے نہیں ہوسکتی، بلکہ رجالِ ماہرین کی صحبت اور ان سے سیکھ کر ہی حاصل ہوتی ہے، یعنی درحقیقت انسان کا معلم اور مُربی انسان ہی ہوسکتا ہے، محض کتاب، معلم اور مربی نہیں ہوسکتی۔ بقول اکبر الٰہ آبادی مرحوم۔

کورس تو لفظ ہی سکھاتے ہیں　　آدمی، آدمی بناتے ہیں

(معارف القرآن، جلد اول صفحہ ۹۲۔۹۳)

انسانی شخصیت کے بارے میں اس نکتہ کو سمجھنا ازحد ضروری ہے کہ اس میں حجابات کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ موجود ہے، بڑے پن کا حجاب، جذبہ شہرت ونام ونمود کا حجاب، حرص وہوس کا حجاب، حسد اور ضد کا حجاب، نفس کے یرغمال شدہ عقل کا حجاب، سلف کے دینی فہم پر عدم اعتماد کا حجاب، اہل حق اور اہل فضل کی تحقیر کا حجاب، علم وذہانت کا حجاب، خودرائی کا حجاب، اپنے عابد، زائد اور خادم دین ہونے کا حجاب، مکروفریب کا حجاب، سستی وغفلت کا حجاب، منفی عادتوں کے استحکام کا حجاب، دل اور روح کی صدا کا صحیح جواب نہ دینے کا حجاب، فطرت کی آواز کو ٹالتے رہنے کا حجاب، اندر کے

مفتی سے بے نیازی کا حجاب وغیرہ، ان میں سے ہر حجاب ایسا ہے جو فرد و افراد کو غیر متوازن بنانے اور انہیں دعویٰ کی راہ پر گامزن کرنے کے لئے کافی ثابت ہوتا ہے، ان حجابات کی نوعیت کو سمجھکر، ان سے بلند ہوکر، للھیت و بے نفسی کے ساتھ زندگی گذارنا اور دین کو درپیش چیلنج کے مقابلہ کے کام کو نفسی آمیزشوں سے بچ کر، محض اللہ کے لئے سرانجام دینا، یہ اہل اللہ کی صحبت کے بغیر انتہائی دشوار ہے۔ اگرچہ اپنی ذاتی کوششوں سے بعض حجابات سے اوپر اٹھنے اور ان سے بچنے کی صورت پیدا ہوسکتی ہے، تاہم دعویٰ، خودنمائی اور حرص وہوس جیسے حجابات سے بچنا دشوار تر ہے۔ بلکہ ان بیماریوں کا ادراک وشعور ہونا ہی مشکل ہے، اہل اللہ کی صحبت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ طالب، جب اپنا دل ان کے حوالے کرتا ہے تو ان کے دل میں اچانک اخلاص، یقین، بے نفسی، اور للھیت کی شعائیں داخل ہونا شروع ہوجاتی ہیں (جو ایمان واخلاص کی ظاہری حالت پر غالب آجاتی ہیں) جس سے ان میں نئی معنوی اور حقیقی زندگی کی تخلیق کا عمل شروع ہوتا ہے۔ صحبت کا عمل جوں جوں آگے بڑھتا رہتا ہے، اس نئی تخلیقی زندگی میں ارتقا کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

اس نئی تخلیقی زندگی کے کچھ اجزاء یہ ہیں:

ذکر سے مناسبت کا تعلق بڑھنے لگتا ہے۔ باطنی خرابیوں سے بچنے کے سلسلہ میں حساسیت تیز سے تیز تر ہونے لگتی ہے۔ اپنی ذات سے دوسروں کو اذیت نہ دینے کی طالب کی کوششوں اور تحرک میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ دولت ودنیا کے حوالے سے دل سرد ہونے لگتا ہے، آخرت کی تیاری کی فکر غالب ہونے لگتی ہے۔ محبت، رواداری، برداشت اور معرفت کے اجزاء بڑھنے لگتے ہیں، اعمال میں حسن کی صورت پیدا ہوتی رہتی ہے۔ دوسروں کی نازیبا حرکتوں کو یک طرفہ طور پر معاف کرنے کا احساس پیدا ہونے لگتا ہے۔ ردعمل، احساس کمتری واحساس برتری سے بچاؤ کی صورت پیدا ہوتی ہے، نفس پرستی کی قوتوں کے خلاف جدوجہد کا عمل تیز ہونے لگتا ہے۔ جو وقت ذکر وفکر اور ضروری معاشی جدوجہد کے بعد بچتا ہے، اس کے ایک ایک لمحہ کے صحیح استعمال کی فکرمندی غالب ہوجاتی ہے اور حمیت دین پیدا ہوجاتی ہے۔

یہ اور اس طرح کی بہت ساری صفات ہیں، جو اہل اللہ کی صحبت کے نتیجہ میں حقیقی طالبوں میں پیدا ہونے لگتی ہیں۔

اگرچہ موجودہ دور میں دوسرے اداروں اور شعبوں کی طرح تصوف میں بھی خرابیاں پیدا ہوچکی ہیں، نام نہاد صوفیوں نے تصوف کو دکانداری کی صورت دی ہے، لیکن اللہ کی محبت کے رازداں حقیقی درویش قیامت تک موجود رہیں گے، یہ اللہ کی سنت ہے اور اس کا وعدہ ہے. حقیقی طلب اور تلاش سے ان تک آسانی سے رسائی حاصل ہوسکتی ہے۔

موجودہ دور میں معاشرہ کو مادیت پرستی کی عالمگیر لہر سے بچانے میں ناکامی کا ایک بنیادی سبب یہ ہے کہ دین سے وابستہ طبقات بالخصوص جدید طبقات اور علمائے کرام نفس پرستی کی ہولناک داخلی قوتوں کی سنگینی کو سمجھکر، ان کی اصلاح کی فکر سے بے نیاز ہوکر، محض ظاہری علم، ذہانت اور قیل وقال سے جدیدیت کی طوفان خیزیوں کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں، جو ظاہر ہے ممکن نہیں، اللہ کی یہ سنت ہے کہ نفس پرستی کی خارجی اور بیرونی قوتوں کے مقابلہ سے پہلے نفس پرستی کی داخلی قوتوں کا مقابلہ ناگزیر ہے۔ دوسری صورت میں فرد وافراد، نفس پرستی کی داخلی قوتوں اور ان کے حملوں کا شکار ہوئے بغیر رہ سکیں، مشکل ہے۔

ہماری تاریخ یہ ہے کہ سلف سے خلف تک نے اسلام کے تسلسل کو قائم رکھا اور اسے ہم تک پہنچانے میں کامیاب رہے۔ جب کہ ہم، اسلام کے تسلسل کو قائم رکھنے اور نئی نسلوں تک اسے پہنچانے میں ناکام ہیں۔ اس کا بنیادی سبب ایک ہی ہے، وہ یہ ہے کہ صدیوں تک معاشرہ، اہل اللہ کی صحبت کے معاملہ میں حساس تھا، اس لئے وہ اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود اخلاقی وروحانی اعتبار سے طاقتور تھا اور بڑائی کے خلاف معاشرہ کی اجتماعی حس غالب تھی۔ جب کہ مسلم تاریخ میں پہلی مرتبہ جدیدیت کے طاقتور رجحانات کے زیر اثر یہ رجحان فروغ پذیر ہوا ہے کہ ظاہری علم ہی سب کچھ ہے، نیز تزکیہ کے لئے مزکی کی کوئی ضرورت درپیش نہیں ہے۔ اس میلان کے غلبہ کی وجہ سے اصلاح کے لئے ہونے والی ساری کاوشیں نئے نئے مسائل ومشکلات کا شکار ہیں اور حقیقی درویشوں کی خانقاہیں خالی ہیں۔

تزکیے اور باطنی اصلاح کے سلسلہ میں قرآن وسنت کی تعلیمات اور سلف کے تسلسل کے پیش نظر ہمیں جدیدیت کی طرف سے پیدا کردہ خودرائی اور ظاہری علم ہی کو حرف آخر

سمجھنے کے نکتہ نگاہ پر نظر ثانی کرنی ہوگی۔

موجودہ دور میں ہولناک عالمگیر اور طاقتور فتنوں کے مقابلہ کے لئے طاقتور ایمان اور غیر معمولی اخلاقی وروحانی قوتوں کی ضرورت ہے، جو تزکیہ کے عمل کے ذریعہ ہی حاصل ہوسکتی ہیں اور تزکیہ کے عمل کا تعلق کتاب اور علم سے نہیں، بلکہ اس کا تعلق مزکی ومربی کی شخصیت سے ہے۔ مربی ومزکی، جو زندگی کا قابل ذکر حصہ، اہل اللہ کی صحبت کے ذریعہ نفس پرستی کے خوفناک درندوں کا مقابلہ کرکے، انہیں مات دینے میں کامیاب ہوا ہے، ان کی مسلسل صحبت سے ہی طالب، انسانی اوصاف اور انسانی جوہروں سے بہرہ ور ہوکر، اپنے لئے، معاشرہ کے لئے اور اہل اسلام کے لئے خیروبرکت کا باعث بن سکتا ہے۔

اس سلسلہ میں حضرت مجدد الف ثانی نے سلف کے احساسات اور ان کی فکر کی ترجمانی کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے، وہ ہمارے لئے لمحہ فکریہ ہے۔

ایک خط میں فرماتے ہیں۔

''درویشوں سے یہ بے نیازی سرکشی کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ حضرت خواجہ نقشبند قدس اللہ سرہ نے فرمایا ہے'' پہلے اہل اللہ کے سامنے نیازمندی کا اظہار ہو، اس کے بعد ان کی طرف سے دل کے درست کرنے کی تدبیر ہوگی'' پس توجہ حاصل کرنے کے لئے طالب کی نیازمندی وعاجزی شرط ہے۔ (مکتوب ۱۵۷ دفتر اول)

دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

ایک عزیز فرماتے ہیں: الٰہی، یہ کیا ماجرا ہے جو تو نے اپنے دوستوں کے ساتھ کیا ہے کہ جو ان درویشوں کو پہنچان لے، وہ تجھ کو پالیتا ہے اور جب تک تجھ کو نہیں پاتا، ان کو نہیں پہنچانتا۔ (مکتوب ۱۵۷ دفتر اول)

آخر میں معافی کا خواہاں ہوں کہ آپ جیسی صاحبان علم شخصیتوں کے سامنے اپنی حیثیت سے بہت بڑھکر باتیں کیں۔ اللہ ہمیں اخلاص کے ساتھ اپنے دین کے تحفظ وبقا اور معاشرے کی اسلامی خطوط پر تعمیر کے کام کی سعادت نصیب فرمائے۔

(آمین) **(ماخوذ ''بیداری'' مئی ۲۰۱۵ء)**

قرآن سے اخذ فیض کی صلاحیت کی صورت

(نفس امارہ کے مطالعہ کی روشنی میں)

(ہفتہ وار اصلاحی وتربیتی نشست میں پڑھا گیا مقالہ)

قرآن کی ایک حیثیت یہ ہے کہ وہ اللہ سے ملاقات اور جنت و دوزخ کے مناظر سامنے لاتا ہے۔ اور ان مناظر میں مستغرق کرکے بندہ مؤمن کو اِس دنیا سے زیادہ اُس دنیا کا فرد بنا دیتا ہے اور اس پر اللہ سے ملاقات کے استحضار اور جنت میں داخلہ ودوزخ سے بچنے کی تیاری کی فکر غالب کر دیتا ہے، لیکن چونکہ عام طور پر فرد پر نفس کی قوت حاوی ہوتی ہے، اور نفس، مادی دنیا پر ٹوٹ پڑنے اور خواہشات کا غلام ہوتا ہے اور وہ یہی رنگ دل کی طرف منتقل کرکے دل کو بھی اپنی خواہشات کا اسیر اور اسی مزاج کا حامل بنا دیتا ہے۔

اس لئے دل، نفس کے زیر اثر قرآن کے ان مناظر کو جھٹکا دیتا ہے، اس طرح فرد پر قرآن کے جنت و دوزخ کے وہ اثرات پڑنے نہیں پاتے، جو قرآن پیدا کرنا چاہتا ہے۔ ذکر کا کام یہ ہے کہ وہ انوار ذکر سے دل کو نفس کی یرغمالی سے آزادی دلاکر، اس کے آئینہ کو صاف وشفاف بنانے کا کردار ادا کرتا ہے، جب دل پاکیزہ ہونے لگتا ہے تو اللہ سے ملاقات اور دوزخ وجنت کے قرآنی مناظر کے عکس دل پر ثبت ہونے لگتے ہیں، اس طرح اللہ، بندہ مومن کا مقصود ہوجاتا ہے اور وہ دل کا غنی ہوجاتا ہے۔ پھر دنیا کا غنی ہوجانے کی اس کی حسرتیں کالعدم ہوجاتی ہیں۔ اور اس کے پاس اللہ سے ملاقات کے استحضار کے منظر کو غالب سے غالب تر کرنے اور دوسروں کو اس راہ کی طرف بلانے کے لئے کافی وقت موجود ہوتا ہے۔

اُس وقت جب بندہ مؤمن قرآن کی تلاوت کرتا ہے تو اس میں کھو جاتا ہے۔ اور اس کے اثرات ورموز اس پر اس طرح وارد ہونے لگتے ہیں کہ وہ سراپا صاحب حال بن جاتا ہے۔ اور قرآن کی تاثیری قوت سے سراپا سوز بن جاتا ہے۔ اس صورت میں جب وہ

قرآن پڑھتا ہے اور اس میں اللہ کے عتاب اور سزا کی وعیدیں سنتا ہے تو وہ ان وعیدوں کو اپنی ذات پر لاگو سمجھنے لگتا ہے، اس لئے کہ نفیٔ ذات کی وجہ سے اسے اپنے اعمال اس قابل ہی نظر نہیں آتے کہ اسے اللہ کے حضور میں پیش کر سکے۔ اسے اپنے سارے اعمال سیاہ کاری کی صورت میں نظر آنے لگتے ہیں۔ لیکن جب وہ اللہ کی رضامندی وخوشنودی کی آیتیں پڑھتا ہے تو اسے حوصلہ ملنے لگتا ہے اور اللہ کی ذات میں اس کی امید ویقین میں اضافہ ہونے لگتا ہے کہ انشاء اللہ وہ اس کی بخشش والوں کی فہرست میں شامل ہوگا۔

قرآن، بندہ مومن کا اللہ سے ملاقات کے استحضار کا جو مزاج راسخ کرنا چاہتا ہے، وہ کثرت ذکر کے ذریعہ ہی ممکن ہے، جس کا قرآن میں بار بار تکرار موجود ہے۔

کثرت ذکر کے بغیر قرآن سے اخذ فیض کی استعداد بہت ضعیف ہوجاتی ہے، اس لئے مبتدی ومتوسط طالبوں کو بااصرار تاکید کی جاتی ہے کہ جب تک قلب پر نفس اور مادہ پرستی کی قوتوں کے لگے ہوئے زنگ صاف نہیں ہوتے اور قلب، ایک حد تک قلب سلیم کی صورت اختیار نہیں کرتا، تب تک وہ ذکر کے ملکہ کو راسخ کرنے کے لئے جتنے بھی مجاہدے کر سکتے ہیں، انہیں کرنے چاہئے، اس کی ساری ایمانی وروحانی ترقی اور دنیا ومادیت کے اثرات سے بلند ہونے، اور اللہ کی نصرت ومدد کو شامل کرنے کی ساری سعادتیں کثرت ذکر سے ہی وابستہ ہیں۔ کثرت ذکر، نفس کی کدورتوں کی صفائی وپاکیزگی اور مادی ودنیاوی آلائشوں اور اس کے اثرات سے بلندی کا ذریعہ ہے۔ طالب اس کے بعد جب قرآن سے اپنا تعلق مستحکم کرتا ہے تو فہم قرآن اور اثراتِ قرآن کی راہ میں حائل ساری رکاوٹیں دور ہوجاتی ہیں۔ اور قرآن، بندہ مؤمن کے لئے ہدایت ورہنمائی میں مسلسل اضافہ، اسلامی شریعت پر مستحکم رہنے، اللہ کے بندوں کے لئے باعث رحمت بننے اور ہمہ وقت آخرت کی دائمی زندگی کی تیاری کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ بندہ مؤمن پر قرآن کی اصل تاثیری قوت اس کے بعد ہی کھلتی ہے۔

اس لئے کہ نفس کی کدورتوں اور کثافتوں کی صورت میں قرآن کی آیتیں اور اس کے انتباہات نفس، دل کی طرف منتقل کرنے کی راہ میں شدید حائل ہوتا ہے۔

(۲)

اس بات کے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے کہ ذکر کی فضا اور اس کے لئے آمادگی، ذکر والوں کے ماحول میں شامل ہونے کے نتیجہ میں ہی پیدا ہوتی ہے۔ ورنہ مادی ماحول میں رہتے ہوئے اپنے طور پر ذکر کی سعادت کا حاصل ہونا اور ذکر کے مزاج کا راسخ ہونا غیر معمولی طور پر دشوار ہے۔ ذکر کی یہ سازگار فضا اللہ والوں کی صحبت کے ماحول میں زیادہ بہتر طور پر پیدا ہوتی ہے، اس لئے کہ اللہ والوں کی خانقاہ میں ہمہ وقت ذکر ہی کی صدا بلند ہوتی ہے اور ان کا دل ذکر ہی سے سرشار رہتا ہے۔ انہیں ذکر اور شریعت کے علاوہ دوسری باتوں سے طبعی مناسبت نہیں ہوتی، اس طرح کے ماحول سے جڑنے اور تعلق مستحکم کرنے کے بعد سخت سے سخت دل بھی ذکر کے لئے نرم ہونے لگتا ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ دل کو مکمل طور پر اللہ والوں کے سپرد کیا جائے۔ اور اس کام کو دوسرے کاموں پر ترجیح دی جائے۔ اس کے بعد فرد کی حالت یہ ہوجاتی ہے کہ وہ جہاں بھی ہو، اس کا دل متوجہ الی اللہ ہونے لگتا ہے۔ لیکن ذکر کو کام کرنے اور نفسی قوتوں کی مکمل تطہیر وصفائی میں وقت لگتا ہے۔ کافی عرصہ تک اللہ والوں سے رابطہ رکھنے اور عرصہ تک ذکر کرتے رہنے کے بعد ہی نفس کا طاقتور ترین حیوان قابو میں آنے لگتا ہے۔ جب یہ ایک بار قابو میں آ گیا تو پھر اللہ کی سنت یہ ہے کہ وہ قابو میں ہی رہتا ہے۔ الا یہ کہ طالب سے اصولوں کی خلاف ورزی کی حرکتیں صادر ہوں۔

(۳)

کثرت ذکر اور اہل اللہ سے مستحکم تعلق کے نتیجہ میں سب سے بڑی سعادت جو حاصل ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ قرآن، انسانی نفس کی خوفناک قوتوں، نفس پرستی کی وجہ سے قوموں پر آنے والی تباہی، آخرت کی دائمی زندگی کے عذاب، قوموں کے زوال میں آداب بندگی بجالانے سے انکار کی روش کے عمل دخل، مخلصانہ اطاعت کے نتیجہ میں ملنے والے انعامات، اسلامی شریعت پر عمل پیرا ہونے کے ثمرات، اعمال صالحہ کے نتیجہ میں حاصل ہونے والی پاکیزہ زندگی، مادی دنیا کی آلائشوں سے بھرپور زندگی کے اثراتِ بد

وغیرہ، غرض کہ بندہ مومن، قرآن کی ان ساری باتوں کے ذاتی مشاہداتی مراحل سے گذر کر، اس کی صداقتوں کا شاہد بن جاتا ہے اور قرآن اس کے لئے ایک مشاہداتی کتاب بن جاتی ہے، جس کی روشنی میں وہ اپنے حالات، قوموں کے حالات اور آنے والی زندگی کے حالات کا عکس دیکھتا رہتا ہے۔

اللہ کے جس ذکر کی اتنی عظیم سعادتیں حاصل ہوں، اس ذکر کے لئے اگر توانائیاں صرف نہ ہوں، مجاہدے نہ ہوں۔ تو وائے حسرتا ہی کہا جا سکتا ہے۔ اس سے زیادہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

(۴)

ذکر کے ماحول سے دوری کے نتیجہ میں سب سے بڑی سزا جو ملتی ہے، وہ یہ ہے کہ قرآن سے حقیقی اخذ فیض کی صلاحیت واستعداد کمزور ہوجاتی ہے۔ دوسری بڑی سزا جو ملتی ہے، وہ دولت ودنیا اور حب جاہ پر فدا ہونے اور اپنی بیشتر توانائیاں اسی میں صرف کر دینے کی سزا ہوتی ہے۔ نیز فرد پر دنیا کی چند روزہ زندگی کو کامیاب اور خوشحال بنانے کا جنون ودہشت طاری کردی جاتی ہے اور اسے اس فکر میں سراپا غلطاں کردیا جاتا ہے۔ کتنی بڑی سزا ہے، جو ذکر کے نورانی ماحول سے دوری کے نتیجہ میں ملتی ہے۔ سنبھلنے اور بیدار ہونے کی ضرورت ہے۔ مہلت عمر تیزی سے رخصت ہوتی جارہی ہے۔

(۵)

نفس امارہ کے مطالعہ ومشاہدہ وتجزیہ سے جو چیزیں واضح ہوتی ہیں، وہ یہ ہیں کہ نفس اپنی الوہیت سے کسی قیمت پر دستبردار ہونے کے لئے تیار نہیں۔ نفس امارہ کی حامل قوم کی اخلاقی انارکی کی بالکل وہی حالت ہوتی ہے، جس کا ذکر قرآن نے تفصیل سے قوم نوح، قوم عاد، قوم ہود قوم لوط جیسی قوموں کے حالات کی عکاسی کی صورت میں کی ہے۔

نفس امارہ شروع سے اب تک انسانیت کو تباہ کاری کی جس راہ پر گامزن کرتا رہا ہے، قرآن اس کے ذکر سے بھرا ہوا ہے، لیکن موجودہ دور میں ہم عالمی سطح سے لے کر اپنے معاشرہ کی سطح تک کا اس کا براہ راست مشاہدہ کر رہے ہیں۔ دوسروں کا تو ذکر ہی کیا

کریں، ہمارے اپنے نفس امارہ کی حالت یہ ہے کہ وہ ہمہ وقت خدا سے بغاوت، اپنے بھائی بندوں کے حقوق کی تلفی وپامالی، اللہ کی عبادت وذکر سے اعراض، دولت جمع کرنے کے جنون جیسے مفاسد سے عبارت ہے اور ہم سے نفس کی اس حالت کو بدلنے کی استعداد گویا سلب ہوگئی ہے۔ اگر اللہ کی طرف سے رسول اور نئی کتاب کا سلسلہ بند نہ ہوا ہوتا تو موجودہ عالمی معاشرہ کی حالت کو ماضی کی تباہ شدہ قوموں کی حالت سے بدتر حالت قرار دیا جاتا۔

نفس کی ان تباہ کاریوں کو فکری اور علمی طور پر سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس کے علمی ادراک کے بعد ہی اس کی ان خرابیوں سے گلو خلاصی کی طلب پیدا ہوسکتی ہے۔ ہم میں سے جن خوش نصیب افراد کو نفس کی ان ہولناک خرابیوں کا ادراک ہوگیا ہے، انہیں ہمت وحوصلہ سے کام لے کر اس کے ان مفاسد سے بچنے کے لئے ذکر وفکر کے ماحول سے مستقل وابستہ ہو کر اسے مہذب بنانے کے لئے آخری حد تک کوشاں ہونا چاہئے۔ نفس امارہ سے نجات اور اس کی تہذیب کا عمل کوئی وقتی نوعیت کا عمل نہیں ہے کہ شب وروز میں چند لمحات ذکر وفکر وعبادت میں صرف کر کے، اس کی قوتوں کو ضابطہ میں لایا جا سکے، بلکہ یہ ایک مستقل عمل ہے۔ اگر ذکر وفکر کا دورانیہ ایک ڈیڑھ گھنٹے سے زائد نہ بھی ہو، تاہم اس کی فکر اور اس کا دھیان تو ہمہ وقت ہونا چاہئے کہ کہیں نفس امارہ کا یہ درندہ ہلاکت سے دوچار نہ کردے۔ یہ کھٹکہ اور یہ فکر ان اصحاب کی محبت کے ساتھ صحبت سے ازخود مستحکم ہوتی جائے گی، جنہوں نے زندگی کا طویل عرصہ اس راہ میں صرف کر کے، نفس کو بڑی حد تک مطیع کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اس سے ذکر وفکر وعبادت کے دورانیہ میں بھی اضافہ ہوتا جائے گا تو خوداحتسابی کا عمل بھی تیز سے تیز تر ہوگا۔ سکون قلبی کی دولت بھی حاصل ہوگی اور نفس مطمئنہ تک پہنچنے کی سعادت بھی بتدریج حاصل ہوتی جائے گی۔ یہ سعادتِ دارین کی راہ ہے۔ لوگ معاشی خوشحالی کے لئے اپنی ساری توانائیاں صرف کردیتے ہیں۔ ہم سعادتِ دارین کے لئے اگر اپنی توانائیاں صرف نہ کریں تو یہ دانشمندی ہرگز شمار نہ ہوگی۔

(۶)

نفس امارہ کی تہذیب اور اصلاح نفس کے سلسلہ میں عالم ربانی یا مربی ومزکی یا روحانی استاد طالبوں کے لئے ذکر وفکر کے ساتھ جسمانی مجاہدے بھی تجویز کرتا ہے، مثلا طالب میں اگر تکبر کی بیماری زیادہ شدید ہے تو اس کی اصلاح کے لئے ہنگامی نوعیت کا علاج تجویز کرتا ہے، لیکن چونکہ موجودہ دور میں اصلاح نفس کی طلب بہت کم ہے، اس لئے جسمانی مجاہدوں کے لئے طالب تیار ہوں، مشکل ہے، پھر راہ محبت میں ہر طالب کے مزاج، حالات اور صلاحیتوں کے پیش نظر اس کے ذکر وفکر اور مجاہدوں کی مقدار مختلف ہوتی ہے۔ سب کے لئے ایک ہی نصاب اور طریقہ کار نہیں۔

البتہ ایک بات جو اس راہ میں داخل ہر طالب پر واضح ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ اسے ایک نئی معنوی زندگی کی سعادت حاصل ہونا شروع ہوگئی ہے، اس کے دل کے فتویٰ کا عمل جاری ہونا شروع ہوا ہے، ضمیر کی خلش بڑھنا شروع ہوئی ہے۔ نفس سے مقابلہ کی حالت شروع ہوگئی ہے، حب جاہ وحب مال اور حسد جیسی بیماریوں کا ادراک اور ان سے ایک حد تک بچاؤ کی صورت پیدا ہونا شروع ہوگئی ہے۔

اس راہ میں جو طالب اصولوں کے ساتھ چلے گا، زیادہ سے زیادہ پاکیزہ صحبت اور ذکر کے ماحول میں رہے گا، اس کی اصلاح کی بہتر سے بہتر صورت پیدا ہوتی جائے گی۔ جو اصولوں کی خلاف ورزی کرے گا، صحبت ورابطہ اور روزمرہ ذکر کے معمولات اور اس میں اضافہ سے اعراض کرے گا، اس کی حالت گرنا شروع ہوگی۔ اگر اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش نہ کی تو یہ خطرہ دامنگیر ہوتا ہے کہ کہیں اس سے یہ نعمت سلب نہ ہوجائے اور وہ پہلے سے زیادہ بدتر حالت میں مبتلا ہوجائے۔

آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی راہ میں قبول فرمائے اور نفسی قوتوں کی گرفت سے بچا کر اپنے قرب کی دولت عظمیٰ عطا فرمائے۔ **(آمین)**

(ماخوذ ''بیداری'' ستمبر ۲۰۱۵ء)

اسلام اور فرد کے درمیاں

معرکہ آرائی کا اصل میدان

اس دور میں ایک اہم حقیقت جو نظر انداز ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ مادی مصروفیات میں کمی آئے بغیر افراد کو دین کی دولت عظمیٰ حاصل ہوجائے اور دین ان کے لئے آسان ہوجائے، نیز افراد یہ بھی چاہتے ہیں کہ دل کی صلاحیتوں کو بیدار کئے بغیر محض عقل کی مدد سے انہیں ایمان ویقین کی نعمت حاصل ہوجائے۔ ایسا ہونا اللہ کی سنت کے خلاف ہے۔

دین کی نعمت عظمیٰ کا حاصل ہونا، شرح صدر اور قلب سلیم کی سعادت کا عطا ہونا، ایمانی حقائق کا قلب پر وارد ہونا، مادی دنیا کی تاریکیوں سے بلند ہوکر، حقیقت آخرت کا روز روشن کی طرح ہونا، نفسی قوتوں کی یرغمالی سے آزاد ہوکر، اسلامی شریعت پر عمل پیرا ہونا، حب جاہ وحب مال اور حرص وہوس کے بتوں سے نجات حاصل کرکے، عبادت کا خالص اللہ کے لئے مخصوص ہونا، اللہ کی رضامندی کے حصول کا مقصود زندگی ہونا، اللہ کے ساتھ والہانہ محبت کے ساتھ اللہ کے بندوں سے بھی محبت ورواداری کا معاملہ کرنا، اخلاق حسنہ کا حامل ہونا، یہ ساری نعمتیں ایسی ہیں، جو ساری دنیا اور دنیا کے سارے خزانوں سے بھی افضل ہیں۔ اتنی بڑی نعمتیں محض قیل وقال، عقل محض، دنیاوی مصروفیات میں کمی کے بغیر حاصل ہوسکیں، ممکن نہیں۔ جب دنیا کا کوئی فن اور کوئی بھی نعمت وقت وصلاحیتوں وتوانائیوں کے استعمال کے بغیر حاصل نہیں ہوتی تو دین کی سعادت دارین کی راہ وقت، صلاحیتوں اور توانائیوں کے بغیر کیسے حاصل ہوسکتی ہے۔

بہت سارے ذہین افراد اس غلط فہمی کا شکار رہتے ہیں کہ انہیں مطالعہ سے، تھوڑے سے اوراد ووظائف سے اور غلبہ دین کے لئے ہفتہ وار اجتماعات میں شرکت سے دین کے اسرار ورموز اور حقیقت ایمان حاصل ہوجائے اور ایسا ہونا ان کا حق ہے۔

یہ غلط فہمی دراصل انسانی نفس کی بے پناہ اور اتھاہ قوتوں کو نہ سمجھنے اور اس سلسلہ میں اللہ کی سنت کے عدم ادراک کا نتیجہ ہے۔

انسانی نفس کو اللہ کے لئے مطیع کرنا جزوقتی نوعیت کا کام ہرگز نہیں ہے، بلکہ ترجیحات کی فہرست میں اس کام کو اولین اہمیت دیئے بغیر چارہ کار نہیں۔

اس معاملہ میں بدقسمتی سے بہت سارے پردے حائل ہوجاتے ہیں، کہیں علم کے پردے، کہیں ذہانت اور فنی صلاحیت ومہارت کے پردے، کہیں معاشرے میں حیثیت حاصل ہونے کے پردے، کہیں مال ودولت کے پردے۔

یقیناً ذہانت کی بھی ضرورت ہے، ذہانت ایک بڑی نعمت ہے، افراد پر ذہین افراد ہی متاثر ہوکر، معاشرہ کی تبدیلی کا ذریعہ بنتے ہیں۔ لیکن ذہانت میں خطرات بھی پوشیدہ ہیں اس لئے ذہانت اسی وقت کارگر ہوسکتی ہے، جب اسے دل کی معیت حاصل ہو۔ علم کی بھی مسلمہ اہمیت ہے، علم کے بغیر دینی تعلیمات اور اللہ ورسول کے احکامات کا علم نہیں ہوسکتا، علم نہیں ہوگا تو عمل کی صورت کیسے پیدا ہوسکتی ہے، لیکن علم چونکہ اپنے ساتھ حجابات بھی لاتا ہے اس لئے علم کے ساتھ معرفت بھی ضرورت ہے، تاکہ علم نافع کی صورت اختیار کرسکے۔

دولت کی بھی ضرورت ہے، دولت نہ ہوگی تو محتاجی ہوگی اور خدمت دین کے کام متاثر ہوں گے، لیکن دولت چونکہ اکثر فرد وافراد کے بگاڑ کا ذریعہ بھی بن جاتی ہے، اس لئے دولت کے ساتھ تربیت وتہذیب نفس کی بھی ضرورت ہے، تاکہ دولت کی وجہ سے فرد حداعتدال سے تجاوز نہ کرسکے۔

معاشرہ میں حیثیت کی بھی ضرورت ہے، اس لئے کہ معاشرہ میں تعارف اور حیثیت نہ ہوگی تو دین کے دعوتی کام کے لئے معاشرہ میں نفوذ کی صورت مشکل ہوگی، تاہم چونکہ معاشرہ میں حیثیت سے حب جاہ پیدا ہونے کے خطرات لاحق ہوتے ہیں، اس لئے حب جاہ سے بچنے کے لئے اپنے آپ کو پامال کرنے کی ضرورت ہے۔

ان پردوں کو ہٹاکر دین وایمان کے استحکام کے لئے وقت دینا، اس سمت میں صلاحیتوں کا استعمال ہونا ناگزیر ہے۔ اس کے بغیر فرد، رسمی اسلام اور قیل وقال سے آگے بڑھ سکے، مشکل ہی نہیں، بلکہ ناممکنات میں سے ہے، دین تو اسی ترجیحی عمل سے ہی حاصل ہوسکتا ہے۔

مادی دنیا میں مصروف جدید مذہبی فرد کی حالت یہ ہے کہ وہ کبھی کسی دینی کتاب کے مطالعہ سے ایمانی حلاوت کا متلاشی ہوتا ہے تو کبھی کسی تقریر سے، کبھی کسی دینی اجتماع

میں شرکت سے، وہ نئی نئی کتابیں پڑھتا رہتا ہے کہ شاید اسے زندگی کا اصل گر اور جوہر حاصل ہو اور اس کی زندگی خیر وبرکت سے بہرہ ور ہوجائے۔ وہ ساری زندگی اس طرح کی وقتی اور ہنگامی کوششوں میں صرف کردیتا ہے، لیکن عام طور پر اسے نہ تو سکونِ قلبی حاصل ہوتا ہے اور نہ ہی باطنی امراض سے نجات کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ دین کے آسان ہونے کے نعمت تو اس سے زیادہ مشکل ہوتی ہے۔

یہ سب ایک کمی وکوتاہی کا نتیجہ ہوتا ہے، وہ کوتاہی دین وآخرت کی زندگی کو دنیا پر ترجیح دینے اور دین کو جزوقتی مسئلہ سمجھنے کا ہوتا ہے۔

دین اور آخرت کی کامیابی اتنا سستا سودا نہیں ہے کہ آسانی سے حاصل ہو سکے، اس کے لئے تو نفسی قوتوں سے خوفناک جنگ کرکے، انہیں مفتوح کرکے اللہ ورسول کی اطاعت میں دینا ہوتا ہے۔

دین کے تقاضوں اور نفسی قوتوں کے درمیاں زندگی کے ہر موڑ پر جو کشمکش ہوتی ہے، اس کا اندازہ درج ذیل نقشہ سے لگایا جا سکتا ہے۔

دین چاہتا ہے کہ فرد، اللہ سے محبت بلکہ عشق کا تعلق قائم کرے، نفس چاہتا ہے کہ اس کی ضرورت نہیں، اس لئے کہ اللہ کا عشق غیر معمولی مجاہدوں وکاوشوں کا متقاضی ہے۔

دین چاہتا ہے کہ فرد دنیا کے لئے اتنا وقت صرف کرے، جتنا دنیا میں رہنا ہے اور آخرت کے لئے اتنی توانائیاں صرف کرے، جتنا آخرت میں رہنا ہے، جب کہ نفس چاہتا ہے کہ آخرت جب آئے گی، دیکھا جائے گا۔ فی الحال تو ساری توانائیاں دنیا کی زندگی کو خوشگوار بنانے اور سامان دنیا کے حصول کی جدوجہد میں صرف کی جائیں۔

دین چاہتا ہے کہ غفلت وسستی چھوڑ کر، بنیادی دینی تعلیم کی تحصیل اور دینی جدوجہد کو قابل ذکر وقت دینا چاہئے۔ نفس چاہتا ہے کہ اس کی ضرورت نہیں، رسمی دینداری ہی کافی ہے۔

دین چاہتا ہے کہ اللہ کی عبادت کا حق ادا کرنا چاہئے، اور اس کی عادت ڈالنی چاہئے، جو ہمیشہ صلحاء کا طریقہ رہا ہے۔ نفس چاہتا ہے کہ اس طرح کی عبادت اولیاء کرام کے لئے مخصوص ہے۔ ہم اس کے متحمل نہیں۔

دین چاہتا ہے کہ سادہ زندگی بسر کرنی چاہئے جب کہ نفس چاہتا ہے کہ گاڑیاں

چاہئے، بنگلے چاہئے۔ دولت چاہئے اور رونق زندگی کا سامان چاہئے۔

دین چاہتا ہے کہ بہتر اور پاکیزہ معاشرت اختیار کرنی چاہئے، شادی بیاہ میں فضول خرچی اور دکھاوے سے بچنا چاہئے، گھروں میں پردہ کا اہتمام ہونا چاہئے، مادی تہذیب کے ہر طرح کے اثرات سے بچنا چاہئے، نفس کہتا ہے کہ معاشرہ کے طرز سے ہٹ کر معاشرت اختیار کرنا، معاشرہ میں ذلیل اور نکو ہونے کے مترادف ہے، اس لئے اس دور میں دینی طرز معاشرت قابل عمل نہیں۔

دین چاہتا ہے کہ ضرورت سے زیادہ دولت غریب اقرباء، یتیموں، محتاجوں اور غریبوں میں صرف کرنی چاہئے، تاکہ ان کی معاشی پریشانیوں میں کمی واقع ہو، نفس چاہتا ہے کہ دولت سے دست برداری ممکن نہیں۔ ایسا دین ومذہب جو دولت جمع کرنے کی راہ میں حائل ہو اور جو زیادہ سے زیادہ اس کے خرچ کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ ہمارے مزاج کے منافی ہے اور ہمیں ناگوار ہے، چاہے بظاہر زبانی طور پر فرد ایسا نہ کہہ سکے، لیکن نفس عملا اسی روش کا مظاہرہ کرتا ہے۔

دین چاہتا ہے کہ کاروبار اور معاشی سرگرمیوں میں ناجائز چیزوں سے بچا جائے، سود کی آمیزش نہ ہو، ملاوٹ نہ ہو، رشوت نہ ہو، زیادہ منافع نہ ہو، ذخیرہ اندوزی نہ ہو، لوگوں کی مجبوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ان سے لوٹ مار کی روش نہ ہو، جلد سے جلد مالدار بننے کی خاطر پیشہ ور سرگرمیوں میں جعل سازی وفریب دہی نہ ہو، فنی مہارت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر، لوگوں سے دولت لوٹنے کی حرکتیں نہ ہوں، جب کہ نفس کی چاہت یہ ہے کہ دین کی یہ تعلیمات ایسی ہیں، جو خوشحال زندگی کی راہ میں حائل ہیں۔ مسجد میں جانے اور تھوڑے سے اوراد کی حد تک دین کی تعلیمات قابل قبول ہیں، لیکن معاشی خوشحالی کے سلسلہ میں دین کی حد بندیاں قابل قبول نہیں ہیں۔

دین چاہتا ہے کہ عزیز واقارب اور دوست واحباب کی غلطیوں سے صرف نظر کیا جائے اور انہیں یک طرفہ طور پر معاف کرکے، ان سے مزید بھلائیاں کی جائیں اور ان سے تعلقات کسی بھی قیمت پر قطع نہ کئے جائیں۔ نفس چاہتا ہے کہ جہاں ہماری عزت ووقار اور انا کو ٹھیس پہنچے گی، ہماری اذیت رسانی ہوگی اور رویوں میں ہماری عزت اور خود داری مجروح ہوگی، وہاں ہم انتقام لئے بغیر رہ سکیں، ممکن نہیں۔ آخر عزت نفس بھی تو

کوئی چیز ہوتی ہے۔ ایسی رشتہ داری کس کام کی، جہاں ہماری شان ومان مجروح ہو، ہماری حیثیت کے مطابق ہمارا اکرام نہ ہو۔

غرض کہ زندگی کے ہر موڑ پر دین کے اپنے تقاضے ہیں، جب کہ نفس کے اس کے بالکل برعکس دوسرے تقاضے ہیں۔ جو ہر موڑ پر ایک دوسرے سے متصادم ہیں۔

یہ حالات ایسے ہیں، جو نفس سے ایک صبر آزما جنگ کے متقاضی ہیں۔

نفس کو مہذب بنائے بغیر نہ تو انسانی جوہروں سے بہرہ وری کی سعادت حاصل ہوتی ہے، نہ ہی سکون قلب کی زندگی عطا ہوتی ہے، اس کے نتیجہ میں آخرت میں جو رسوائی ہوگی، وہ ایسی رسوائی ہے، جو ناقابل بیان اذیت ہے۔

دین ودنیا کی بھلائی کے سارے راستے نفس سے معرکہ آرائی سے ہو کر گذرتے ہیں۔ جس نے اس نکتہ کو سمجھ لیا، اور اللہ کی محبت کی دنیا میں شامل ہوکر، نفس کو روزانہ پامال کرنے اور اس کی قوتوں کے زور کو توڑنے اور اسے اللہ ورسول کی اطاعت کی راہ پر گامزن کرنے پر لگایا، وہی شخص کامیاب اور خوش نصیب ہے (قد افلح من تزکیٰ) اس سے بڑھکر خوش نصیب انسان اور کون ہوسکتا ہے۔

نفس کو مفتوح کرنے کی یہ راہ ایسی ہے، جس میں دنیا میں استغراق یا دنیا کو مقصود بنانے سے دستبرداری اختیار کرنی پڑتی ہے۔ یعنی دنیا کے حوالے سے ایثار وقربانی کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے اور ذکر وفکر، عبادت وعبدیت کے لئے کافی وقت دینا پڑتا ہے، اور اپنی ساری سرگرمیوں میں اسے مقصود کی حیثیت دینی پڑتی ہے، اگرچہ دنیاوی سرگرمیاں بھی جاری وساری رہتی ہے، لیکن دنیا میں استغراق کی حالت باقی نہیں رہتی، وہ افراد خوش نصیب ہیں، جو ایسا کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں، اللہ انہیں اسی دنیا میں حیاۃ طیبہ یعنی پاکیزہ زندگی، خوشیوں سے سرشار زندگی عطا فرماتا ہے، دنیا کی کمی یا مادی معاملات میں ہونے والے نقصانات سے اس کے دل کے سکون وطمانیت کا نظام متاثر ہونے نہیں پاتا۔

دوسری چیز جس کی فرد کو ضرورت لاحق ہوتی ہے، وہ عقل کی سرحدوں سے آگے بڑھکر دل کی گہرائیوں میں اترنا پڑتا ہے، دل، جو محبوب حقیقی سے محبت کا اصل مرکز ہے، دل کی ان غیر معمولی صلاحیتوں کو اجاگر کرنا پڑتا ہے اور اللہ سے محبت کے ارتقائی مراحل

طے کرنا پڑتے ہیں۔ فرد جوں جوں دل میں غوطہ زن ہوتا ہے، اسے ادراک ہونے لگتا ہے کہ ایمان کی حقیقت اور اس کی اصلیت دل کی سرحدوں کی دوسری پار ہے۔ جب تک فرد اس سرحد کو پار نہیں کرتا، نفسی قوتوں کی یرغمالی سے بچنا اس کے لئے دشوار تر ہوتا ہے۔

(ماخوذ ''بیداری'' ستمبر ۲۰۱۵ء)

وقت کا چیلنج

اور ہمارا کردار و ذمہ داریاں

(یہ مقالہ ہفت وار اصلاحی وتربیتی نشست کے لئے لکھا گیا اور پڑھا گیا)

آج مادیت پرستی کی طوفانی لہروں نے ایسی تشویشناک بلکہ خوفناک صورتحال پیدا کردی ہے کہ ہمارا معاشرہ زیر وزبر ہورہا ہے۔ شادیاں ناکامی سے دوچار ہو رہی ہیں۔ گھروں میں اشتعال کی فضا بڑھ رہی ہے۔ عزیز واقربا کے تعلقات ٹوٹ رہے ہیں، رشتہ داری کا تقدس مجروح ہوگیا ہے۔ اغراض پرستی کے میلانات تیزی سے بڑھتے جارہے ہیں۔ کاروباری بددیانتی عام ہوگئی ہے، بلکہ وہ خوفناک صورت اختیار کر چکی ہے۔ معاملات خراب سے خراب تر ہورہے ہیں۔ ایک دوسرے سے دھوکہ دہی اور فریب کاری کے ذریعہ پیسہ لوٹنے کی روش عام ہوگئی ہے۔ سیاست، دولت کمانے اور نام وری کا ذریعہ بن گئی ہے۔ دولت کا ارتکاز ایک خاص طبقہ کی طرف ہوگیا ہے، جب کہ ملک کا اسی فیصلہ طبقہ روٹی کا محتاج بن کر رہ گیا ہے۔ کوئی کسی کا پرسانِ حال نہیں رہا، قومیتی اور مسلکی تعصّبات کی بنیاد پر ایک دوسرے کو جان سے مارنے تک کی نوبت پیدا ہوگئی ہے۔ دینداری، مراسم کی ادائیگی تک محدود ہوکر رہ گئی ہے، معاشرہ میں مفلوک الحال لوگوں کی مدد کی صورتیں مسدود ہوگئی ہیں۔ دولت پر سانپ بن کر بیٹھے رہنے کا رجحان غالب ہورہا ہے۔ سنگ دلی وقساوت قلبی بڑھ رہی ہے۔ ریاستی اداروں میں معاشرہ کے حوالے سے اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی کا احساس تیزی سے ختم ہورہا ہے۔ خدمت خلق اور رضا کارانہ طور پر لوگوں کو اخلاقی اعتبار سے سہارا دینے کی معاشرہ کی صلاحیت واستعداد ختم ہوتی جارہی ہے۔

مغرب میں قومی وکاروباری اخلاق کے نام سے جو چیز موجود ہے، جو مغربی معاشرہ کو زندہ رکھے ہوئی ہے، ہمارے ہاں قومی وکاروباری اخلاق بھی تباہی سے دوچار ہے۔

دینی ومذہبی جماعتوں کے کارکنوں میں باہم ایک دوسرے سے رنجشوں، ناراضگیوں

اور بُعد کی فضا بڑھ رہی ہے اور ان میں ٹوٹ پھوٹ کا عمل جاری ہے۔ جائز وناجائز ہر طریقہ سے دولت کے حصول کی جدوجہد مجنون وار صورت اختیار کر چکی ہے۔ ساری توانائیاں دنیا کومقصود بنانے اور زیب وزینت کے سامان میں صرف ہورہی ہیں ۔نفسیاتی بیماریوں کی رفتار تیزی سے بڑھتی جارہی ہیں۔ انسانیت کشی کی سرگرمیوں میں اضافہ ہورہا ہے۔ آزاد جنسی عمل اور اخلاقی قدروں کی پامالی تشویشناک صورت اختیار کر چکی ہے۔ حکمرانوں اور بیوروکریسی میں ملک کا خزانہ لوٹنے کے رفتار میں اضافہ ہوگیا ہے۔

کتاب اور حقیقی علم سے رشتہ ٹوٹ چکا ہے، عزت کا معیار تقویٰ کی بجائے دولت بن کر رہ گیا ہے، چاہے یہ دولت لوگوں کا خون چوس کر حاصل کی گئی ہو، معاشرہ سے قوت برداشت ختم ہو چکی ہے، جدید تعلیمی ادارے نوجوانوں کو آوارہ اور دولت پر فدا ہونے کی ادائیں سکھانے کا ذریعہ بن گئی ہیں۔ موبائل پر نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں کے درمیاں رابطہ اور میلاپ کا عمل خطرناک صورت اختیار کر چکا ہے۔

دلوں کو دستکش دے کر اندر کے مفتی کو بیدار کرنے جیسے اہم کام کا ادراک سلب ہوگیا ہے، زندگی بھر کے معاملات میں اسلامی شریعت (جو ہمارے لئے سعادت دارین کی راہ ہے) اس سے اعراض واغماض کی روش غالب ہوگئی ہے، بَـــڑوں کا احترام اور ادب وآداب جو ہماری تہذیب کا حصہ تھا، وہ ختم ہوگیا ہے، اہل علم، اہل فضل اور صاحبان دل سے حقیقی علم ومعرفت اور فیوض حاصل کرنے کا رجحان ختم ہورہا ہے۔ اہل مغرب سے ان کی مادر پدر آزادی کی چیزوں میں نقالی کی روش عام ہے، جب کہ ان کی اچھی چیزوں کو اختیار کرنے میں بخل غالب ہے۔ عدالتوں میں چھوٹے حلف اٹھانے کی روش عام ہورہی ہے۔ اس طرح کے حلف کہ اگر ہم جھوٹے ہوں تو ہم پر خدا کا عذاب نازل ہو، محض چند سولت کی خاطر اس طرح کے حلف اٹھا کر، اللہ کے عذاب کو دعوت دینے کی راہ اختیار کی جارہی ہے۔

یہ ایسی صورتحال ہے، جو ہمارے معاشرہ کو اندر سے دیمک کی طرح کھوکھلا کررہی ہے، جس کی وجہ سے معاشرہ میں اسلامی، اخلاقی اور روحانی تحرک کی لہر شروع کرنے کی صلاحیت تیزی سے ختم ہورہی ہے۔ ان حالات میں سب سے بڑا خطرہ جو پیدا ہوگیا ہے، وہ یہ ہے کہ ہم اپنی نسلوں کو ایسا معاشرہ دے کر جارہے ہیں، جو جانوروں، حیوانوں بلکہ

درندوں کا معاشرہ ہو، جہاں آپس میں تصادم اور خون وخرابہ کے علاوہ انسانیت نام کی کوئی چیز موجود نہ ہو۔ اور سلیقہ، عزت اور شرافت سے زندگی گزارنے کے راستے بند ہوں، اور ہماری نسلیں غیروں کی ذلیل غلامی کے بندھنوں میں جکڑی ہوئی ہوں۔

حالت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ بڑے بڑے علم والے، بڑی بڑی ذہانتوں والے، اَسی، اَسی سال عمر والے افراد کردار کے شدید بحران سے دوچار ہیں، افراد، دوست واحباب اور گھریلو معاملات کے حوالے سے میں شدید اذیت رسانی سے دوچار ہیں، علم، ذہانت اور عمر رسیدگی ان معاملات کو سلیقہ وتحمل وبردباری سے طے کرنے کی صلاحیت سے بہرہ ور کرنے میں ناکام ہے، جب صلاحیتوں کے حامل افراد کی حالت یہ ہے تو عام افراد کی جو حالت ہوگی، اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔

یہ ایسے حالات ہیں، جو معاشرہ کے دردمند افراد کے لئے لمحہ فکریہ ہیں، بلکہ اصلاح احوال کے لئے ان کو سراپا متحرک کرنے کے متقاضی ہیں۔

ان حالات میں اصل سوال یہ ہے کہ اصلاح کا بنیادی ہدف کیا ہو؟ جس سے اگر معاشرہ کی بڑی حد تک اصلاح کی صورت پیدا نہ ہو سکے تو جتنے افراد کو مادیت پرستی کے اس سیلاب سے بچایا جا سکتا ہے، کم ازکم انہیں بچایا جائے۔

ہماری نظر میں اصلاح کا بنیادی ہدف افراد کی ذاتی زندگی میں ایمان ویقین کی فضا پیدا کرکے، انہیں مادیت سے اوپر اٹھانا اور فکر آخرت کو غالب کرنا ہے۔

جب ایمان، دل کی گہرائیوں میں مستحکم ہونے لگتا ہے تو زندگی کے سارے پہلو بتدریج بدلنے لگتے ہیں اور خود احتسابی کے ذریعہ انسانی جوہروں سے بہرہ وری کی ازخود صورت پیدا ہونے لگتی ہے۔

ایمان ویقین کی یہ فضا، اللہ کی محبت اور اللہ سے ملاقات کے ذوق وشوق سے ہی پیدا ہوکر ارتقا پذیر ہوسکتی ہے۔ حقیقت یہ کہ جب دل کی سرزمین میں اللہ سے والہانہ محبت کی فضا پیدا ہوجاتی ہے تو دل سے ایسے اعمال ظاہر ہوتے ہیں، بلکہ پھوٹ کر نکلتے ہیں، جو انسانیت کا جوہر اور اسلامی شریعت کا حصہ ہوتے ہیں۔ اللہ کی محبت، انسانی فطرت کا ناگزیر حصہ بھی تو ہوتی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ فطرت کی اس حقیقی طوفانی لہر کی راہ میں پیدا شدہ مادیت پرستی کی لہروں کی رکاوٹ کو ایک بار دور کردیا جائے، جب یہ دور ہونا

شروع ہوگی تو ایمان ویقین کی حلاوت، مادی حلاوت کے سارے اثرات کو کالعدم کردے گی۔

یہ کام ایسا ہے، جو مشکل ضرور ہے، لیکن اگر باصلاحیت اور دردمند افراد کی طرف سے اس کے لئے حکمت وفراست اور پورے دعوتی جذبہ سے کام شروع کر دیا جائے تو معاشرہ کو اخلاقی انارکی اور حیوانی معاشرہ میں تبدیل کرنے سے بچایا جا سکتا ہے۔

ہمارے وہ ساتھی جو راہ محبت میں برسوں سے چل رہے ہیں۔ انہیں معاشرہ کی اس زبوں حالی پر رحم کھا کر، اپنے حلقہ احباب اور عزیز واقارب میں ساری توانائیوں کے ساتھ یہ کام کرنا چاہئے، اس لئے کہ مادیت پرستی کی قوتوں نے افراد معاشرہ کو دین ودنیا کی ساری حقیقی سعادتوں سے محروم کر دیا ہے۔ ان کے دل غموں اور دکھوں سے بھر چکے ہیں، وہ خوشیوں سے سرشار زندگیوں کے لئے ترس رہے ہیں، گھروں میں رونق کے خاتمہ سے ان کے دل ٹوٹے ہوئے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں آخرت میں انہیں جس غم سے دوچار ہونا ہوگا، وہ تو ناقابل بیان اذیت کا غم ہوگا۔

ایک بار جب معاشرہ میں دعوتی عمل کے ذریعہ ایمان ویقین کی فضا پیدا ہوگی اور اللہ کی محبت کی لذتوں سے بہرہ یابی ہوگی تو افراد کو یہ بتانے کی ضرورت ہی نہ ہوگی کہ انہیں کیا کرنا ہے، اس لئے کہ اللہ کی محبت انہیں اس راہ میں مسلسل آگے بڑھنے اور اسلامی شریعت کو دستورالعمل بنا کر، اس کے مطابق زندگی گزارنے پر مجبور کرے گی۔ اللہ کی محبت کی تاثیری قوت بے پناہ ہے، جو بیان سے باہر ہے، پھر ایمان ویقین کی فضا اور اللہ کی محبت سے فیضیابی سے فرد وافراد پر یہ راز ازخود کھلے گا کہ وہ سکون وتسکین ولذت اور خوشی کی جو زندگی مادی اسباب وسامان اور دولت ودنیا میں تلاش کر رہے تھے، یہ تو سراب تھا اور آنکھوں کو دکھائی دینے والا خوبصورت منظر تھا، حقیقی خوشی ولذت کی زندگی، بلکہ جنتی زندگی کی عکس والی زندگی تو اللہ سے والہانہ محبت کی زندگی ہے۔ اور حرص وہوس، دنیا سے محبت اور مادی بتوں سے پوجا کی زندگی تو جہنمی انگاروں پر لیٹنے کی زندگی ہے۔

جب یہ نکتہ ان پر واضح ہوگا تو معاشرہ میں مادی زندگی کی فداؤں پر ادائیگی کی روش میں ازخود کمی آتی جائے گی، ایک دوسرے سے محبت وخیر سگالی کی فضا عام ہوگی، اللہ کی مخلوق کی نفع رسانی کی روش میں اضافہ سے اضافہ تر ہوگا۔

موجودہ حالات میں اللہ کی محبت کر راہ میں چلنے والے افراد کی ذمہ داریاں غیرمعمولی طور پر بڑھ جاتی ہے۔ ایمان ویقین، روحانیت اور شریعت پر اخلاص سے عمل پیرا ہونے کی جس لذت سے وہ خود آشنا ہیں۔ اس لذت سے اپنے دائرہ اثر کے افراد کو آشنا کرنے کی کاوشوں سے خود ان کی ایمانی حلاوتوں میں اضافہ ہوگا، بلکہ ان کی مزید ایمانی ترقی انہیں دعوتی سرگرمیوں سے ہی وابستہ ہے۔

(۲)

اللہ سے محبت کی زندگی (جو اسلامی شریعت کا باطنی حصہ ہے) وہ ایسی قیمتی وپاکیزہ زندگی ہے، جس پر مادی نوعیت کی سو زندگیاں نشاور کی جا سکتی ہیں۔

راہ محبت میں چلنے والا فرد (متوسط طالب) جب نفس کے زیر اثر مادی دنیا کی طرف جھانکنے لگتا ہے (اور جھانکنے کا اس کا یہ عمل طویل عرصہ تک وقتاً فوقتاً جاری رہتا ہے) تو فرد، مادی دنیا کے جہنمی انگاروں کی تپش سے بے چین وبے قابو ہونے لگتا ہے۔ جب توبہ کے ذریعہ نفس کی گرفت سے آزاد ہوکر، پھر راہ محبت میں تیزی سے گامزن ہونے لگتا ہے تو اس محبت کی بے پایاں مسرتوں سے محظوظ ولذتیاب ہونے لگتا ہے۔

راہ محبت میں چلنے والے افراد کے یہ تجربات ومشاہدات ایسے ہیں، جس سے محبت کی دنیا سے باہر کے افراد کو محبت آمیز اسلوب سے آشنا کرنا اور اس راہ میں داخل ہونے کی دعوت دینا، وقت کی سب سے اہم ضرورت ہے، اس لئے کہ افرادِ معاشرہ کے سارے مسائل اور سارے مفاسد سے بچاؤ کی واحد صورت یہی ہے۔

(۳)

یاد رکھنا چاہئے کہ اللہ کی مخلوق کی نفع رسانی کا ذریعہ بننا، انہیں اپنی ذات سے فائدہ پہنچانے کے لئے کوشاں ہونا، بالخصوص انہیں اسلامی اور اخلاقی اعتبار سے سہارا دینا، یہ سب سے بڑی نیکی ہے، اتنی بڑی نیکی کہ اس نیکی کی برکت سے فرد، اللہ کی رحمت کا مستحق ہوجاتا ہے، اور اس کی وجہ سے نوازا جاتا ہے اور اسے انعامات سے سرفراز کیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ دوسروں کی بھلائی کی فکرمندی اور اس کی سعی غیرمعمولی حوصلہ وہمت کی متقاضی

ہوتی ہے، جب کہ نفس کو یہ چیز سب سے بھاری محسوس ہوتی ہے۔

بعض اوقات ذاتی اعمال آسانی سے صدور ہوجاتے ہیں، لیکن دوسروں تک دین کی بنیادی دعوت پہنچانا اور انہیں اللہ کی محبت کی راہ کی طرف بلانا، سب سے زیادہ دشوار کام ہوتا ہے۔ نفس پر جو کام دشوار تر ہو، اس دشواری پر قابو پاکر، اسے سرانجام دینا فرد کو بہت ساری نیکیوں کا مصداق بنا دیتا ہے۔

اس بات کا استحضار بھی ضروری ہے کہ مبتدی کے لئے دعوت کا کام ہاتھ میں لینا مفاسد سے خالی نہیں ہے، اس لئے کہ وہ سلیقہ اور حکمت سے دعوت کا کام کرنے سے آشنا نہیں ہوتا، وہ اگر دعوت کا کام ہاتھ میں لے گا تو اس سے اس بات کا زیادہ خطرہ درپیش ہے کہ کہیں لوگوں میں ضد کی نفسیات پختہ نہ ہوجائے اور مناظرہ بازی اور تصادم کی فضا پیدا نہ ہوجائے، اس طرح یہ دعوتی کام فائدہ سے زیادہ نقصاندہ ہوجائے، البتہ وہ افراد جو برسوں سے استقامت سے راہ محبت میں چل رہے ہیں۔ انہیں دعوت کے کام کے لئے مستعدی کا مظاہرہ کرنا ضروری ہے، اس لئے بھی کہ ذکر کے نور سے ان کی بات دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوتی ہے، وہ دلوں کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتی، اگرچہ وقتی طور پر اس کا اثر محسوس نہ ہو، لیکن وہ افراد کے تحت الشعور میں کسی نہ کسی حد تک ہلچل برپا کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ متوسط طالب کی حالت وہ ہونی چاہئے، جو چور کی ہوتی ہے کہ چور جس مجلس میں بھی جاتا ہے، وہاں اس کی ساری توجہ سامان کی طرف ہوتی ہے کہ یہاں کیا کیا چیزیں ہیں، جو چوری کی جاسکتی ہیں۔

بالخصوص فساد زدہ معاشرہ میں متوسط طالب کی ذمہ داریاں غیرمعمولی طور پر بڑھ جاتی ہیں۔ اور اس کے دعوتی کام سے بہت سارے افراد کے لئے اس عذاب سے بچنے کی صورت پیدا ہوسکتی ہے، جو نفس پرستی کی قوتوں کی پرستش کے نتیجہ میں ان پر مسلط ہوگیا ہے۔

ہمارے ساتھیوں کو آگے بڑھنا چاہئے، علمی محاذ اور ہر طرح کے دعوتی محاذ کو سنبھالنے کے لئے متحرک ہونا چاہئے۔ پڑھنے پڑھانے اور مطالعہ کا مزاج پیدا کرنا چاہئے۔ جدید نظریات (جنہوں نے ہزارہا سے زیادہ سندھی اہل علم کو اپنا اسیر بنا کر، انہیں اسلامی نظریہ اور اسلامی تہذیب سے دور کر دیا ہے) ان نظریات کی نوعیت اور ان میں

موجود علمی نقائص کو سمجھنا چاہئے۔ سندھ میں دعوتی محاذ میں علمی محاذ سب سے زیادہ اہم محاذ ہے، جس کو سنبھالنے کی سخت ضرورت ہے۔ ہمارے وہ ساتھی جو برسوں سے ہمارے ساتھ وابستہ ہیں، ان کے لئے اس کی فکرمندی ضروری ہے۔ انشاء اللہ، یہ کام ان کی روحانی ترقی میں بھی اضافہ کا ذریعہ ثابت ہوگا۔

افراد کو دنیاوی زندگی میں اللہ کی طرف سے جو سعادتیں اور برکتیں حاصل رہی ہیں، ان کے بارے میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ یا تو اخلاص کے ساتھ خدمت دین اور دعوت دین کے کام کے نتیجہ میں حاصل ہوئی ہیں یا پھر اللہ کی مخلوق کی بے غرضانہ طور پر خدمت ومدد کی وجہ سے عطا ہوئی ہیں۔ ان دونوں کاموں کی فیصلہ کن اہمیت ہے، جنہیں راہ سلوک کے متوسط طالبوں کو پیش نظر رکھکر، اپنی جدوجہد کے رخ کو اللہ کی مخلوق کی نفع رسانی اور دعوتی کاموں کی طرف موڑنا چاہئے۔

معاشرہ کو بڑھتی ہوئی اخلاقی انارکی، مادیت اور نفس پرستی کے مفاسد اور تباہی سے بچانے کی بھی یہی صورت ہے۔ **(ماخوذ ''بیداری'' ستمبر ۲۰۱۵ء)**

عصر حاضر میں صحیح اور متوازن فکری رہنمائی

مولانا علی میاں کی نظر میں

(''مجالس حسنہ'' کتاب کی روشنی میں)

زیر نظر کتاب حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ملفوظات وارشادات پر مشتمل ہے، جسے مولانا فیصل احمد ندوی صاحب نے ترتیب دیا ہے، یہ ملفوظات حضرت مولانا کے آخری دور کے چار پانچ سال کی ان مجالس کی ہیں، جو دارالعلوم ندوۃ العلماء میں بعد نماز عشاء جمتی تھیں، جس میں طلبہ کے علاوہ اساتذہ بھی شریک ہوتے تھے، یہ مجلس عام طور پر ۲۵۔۳۰ منٹ کی ہوتی تھی، ان مجالس میں مولانا کی طرف سے کی گئی گفتگو اکثر دارالعلوم کے تین اساتذہ کے سوالات کے جواب میں ہوتی تھی۔ اس گفتگو کو فیصل احمد ندوی صاحب، جو اس وقت مدرسہ میں پڑھتے تھے، اپنے کمرہ میں جاکر تحریر کا جامہ پہناتے تھے۔ مولانا کے وصال کے بعد موصوف نے ان ملفوظات کو صحیح صورت میں نہ صرف مرتب کیا، بلکہ جن شخصیتوں اور مقامات کا ذکر ہے، اس کی تفصیل وتحقیق بھی شامل کی۔

مجالس وملفوظات کی اس کتاب کی ایک بڑی اہمیت یہ ہے کہ بیسویں صدی کے بڑے مفکر، بڑے داعی اور وسیع مطالعہ کے حامل عالم کے تجربات ومشاہدات اور زندگی بھر کے غور وفکر کا حاصل سامنے آ گیا ہے اور نئے دور کے حالات کو پیش نظر رکھکر مدرسہ سے جس ذہنی وفکری سطح کے افراد تیار ہونے چاہئے، ان فکری خطوط کا پورا خاکہ تیار ہوکر آ گیا ہے۔ نیز بیسویں صدی کے عالم اسلام کی علمی، ادبی، دعوتی، روحانی شخصیتوں کا ذکر خیر اور ان کے کردار وکام کی قابل قدر وقابل اخذ خوبیاں وکمالات بیان ہوئے ہیں۔ اور افراد کی تربیت واصلاح اور زندگی میں فیصلہ کن تبدیلی پیدا کرنے اور دین پر استقامت سے قائم رہنے کے لئے وہ بنیادی نکات پیش ہوئے ہیں، جو علم کا حاصل ہیں اور جنہیں ہر موڑ پر پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

کتاب میں تجدید احیائے دین کی بعض ممتاز شخصیتوں کے ذکر کے ساتھ حضرت مولانا کے اپنے خاندان کی بعض بڑی دینی شخصیتوں کے کام اور کردار کے نمایاں پہلوؤں کا ذکر بھی موجود ہے۔

یہ کتاب ایک اعتبار سے آئینہ بھی ہے، جس میں مولانا کی شخصیت، ان کے ہمہ جہتی علمی ودعوتی کام، اسلام اور ملت کے لئے ان کے درد اور اس کے لئے اپنی ساری توانائیوں کے استعمال کی جھلک بآسانی دیکھی جاسکتی ہے۔

محترم فضل ربی صاحب تبریک وتحسین کے مستحق ہیں کہ موصوف ''مجلس نشریات اسلام'' کے زیر اہتمام عرصہ سے پاکستان میں مولانا علی میاں کی کتابوں کی اشاعت کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دور جدید کے چیلنج کے فہم اور اس چیلنج سے عہدہ برآ ہونے اور دین ودنیا کے لگ بھگ سارے اہم مسائل میں معتدل ومتوازن ذہن سازی کے لئے مولانا علی میاں کی فکر وقت کی سب سے اہم ضرورت ہے۔ پاکستان کے دینی طبقات اور علمائے کرام کے لئے مولانا کی فکر کے مطالعہ سے ان کی ذہنی سطح بہت بلند ہوجائے گی اور وہ امت کی بہتر متوازن رہنمائی کرنے کے قابل ہوں گے، جب کہ جدید طبقات کے لئے مولانا کی کتابیں اسلام پر ان کے اعتماد کو بحال کرکے، جدیدیت سے ان کی مرعوبیت کے خاتمہ کا ذریعہ ثابت ہوگی۔

مولانا علی میاں برصغیر ہند کی ایسی منفرد شخصیت ہیں، جو جدید انسان کی رہنمائی کے لئے قدرت کی طرف سے سامنے آئی تھی، اللہ نے ان میں وہ ساری خوبیاں، کمالات وصلاحیتیں رکھی تھیں، جو جدید دور کے انسان کی بہتر اور مؤثر رہنمائی کے لئے ضروری تھیں، مولانا مفکر تھے، عارف تھے، مصنف تھے، داعی تھے، مربی تھے، مقرر تھے، اور جدیدیت سے آشنائی، مسلم امت کے مزاج کو سمجھنے، دور جدید کی گتھیوں کو سلجھانے، ملت اسلامیہ کو جھنجھوڑنے، مسلم امت کے سارے طبقات سے محبت کرنے، اپنے دائرے سے باہر موجود خیر کا کام کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنے، بلکہ ان کی سرپرستی کرنے، اسلامی تاریخ پر گہری نگاہ رکھنے جیسے بہت سارے معاملات میں مولانا کی شخصیت ہمارے لئے بہت بڑا سرمایہ اور اللہ کا عطیہ تھی۔

مولانا ابوالحسن علی کی کتابوں کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جدید دور کے علمی نظریات اور فکری نوعیت کے فتنوں کے فہم اور ان سے بچاؤ کے سلسلہ میں ہتھیار کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور جدید ذہن کو جدیدیت کے ذہنی پس منظر میں اپیل کرکے، انہیں اسلام سے ہمہ آہنگ بنانے میں کردار ادا کرتی ہیں، ان کتابوں کی دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ قرآن وسنت کے سلف کے اسلامی فکر کو اجاگر کرکے، اس فکر کی اہمیت وعظمت کا نقش مستحکم کرتی ہیں اور دین کے بنیادی معاملات میں سلف کی مسلمہ حیثیت اور ان کی مجتہدانہ کاوشوں پر اعتماد بحال کرتی ہیں، بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ موصوف نے سلف کی فکر کو نیا لباس عطا کیا ہے اور نئی صورت دی ہے۔

سوم یہ کہ مولانا امت کے کسی خاص گروہ سے بحث نہیں کرتے، نہ ہی کسی خاص گروہ کے رد وقد میں توانائیاں صرف فرماتے ہیں، بلکہ مولانا امت کے سارے گروہوں کو مسلم ملت کا حصہ سمجھکر سب کو مخاطب کرتے ہیں اور انہیں اصلاح نفس کے ساتھ ساتھ دنیا میں اسلامی نقطہ نگاہ سے اپنے کردار کی ادائیگی پر ابھارنے کی کاوش فرماتے ہیں۔

مولانا کی فکر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں جہاں تہذیب نفس اور تزکیہ نفس کی اہمیت فیصلہ کن ہے، وہاں معاشرہ کی اسلامی تشکیل نو کے کام کی اہمیت پر بھی غیر معمولی زور ہے۔ مولانا دعوتی کام کو فیصلہ کن اہمیت دیتے ہیں اور انسانیت تک دین کی دعوت پہنچانے کے کام کو مسلمانوں کے مقاصد میں شمار کرتے ہیں، اس سلسلہ میں خود مولانا کی اپنی ساری زندگی دعوتی کام کے فروغ میں ہی صرف ہوئی۔

مولانا کی فکر کے بارے میں اگر مزید گفتگو کی جائے تو اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ دور فکری اعتبار سے افراط وتفریط اور غلو کا دور ہے، کہیں مذہب کی نمائندگی میں روایتی فقہی ومسلکی رنگ غالب ہے تو کہیں دین ومذہب کی ترجمانی میں جدیدیت سے تاثیر پذیری کے اثرات غالب ہیں اور دین کے اہداف کی پیشکش میں سیاست ومعیشت کا رنگ فیصلہ کن ہے، کہیں دین کے دعوتی کام، اس کی مظلومیت اور حمیت دین سے محرومی کی فضا غالب ہے تو کہیں اصلاح نفس کے کام سے اعراض کی روش غالب ہے، کہیں دور جدید کے ہمہ گیر وہمہ جہت فتنوں سے انکار کا مزاج موجود ہے تو کہیں جدیدیت کے چیلنج

سے مقابلہ کے نام پر جدیدیت سے مرعوبیت کی ذہنی فضا موجود ہے۔ کہیں دین کے نام پر سیاست میں کلی توانائیاں صرف ہورہی ہیں تو کہیں سیاست اور سیاست کی تبدیلی کے کام کو دینی اعتبار سے کوئی اہمیت حاصل نہیں۔

اس فکری وعملی صورتحال میں مولانا علی میاں کی فکر ایسی ہے، جو اعتدال وتوازن کا دامن تھامے ہوئی ہے، جس میں دین کی صحیح ترتیب، اس کے صحیح اہداف وتقاضے جدید اسلوب ورنگ میں نہایت بہتر طور پر پیش کئے گئے ہیں۔

مولانا ندوی کی فکر کا مطالعہ وقت کی سب سے اہم ضرورت ہے، اس سے دینی ومذہبی طبقات میں جدید چیلنج کو سمجھنے اور اس چیلنج کے مقابلہ کی استعداد پیدا ہوگی اور دین کے سارے اجزاء کو اس کی صحیح ترتیب کے ساتھ سمجھنے اور افراط وتفریط اور غلو سے بچکر حقیقی داعی کی حیثیت سے کردار ادا کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگی۔

مجلس نشریات اسلام کراچی ایک عرصہ سے مولانا کی کتابیں شائع کررہا ہے، مولانا کی یہ کتابیں ایسی ہیں، جو ہر دینی مدرسہ کے ہر عالم دین کو اس کا مطالعہ کرنا چاہئے، اس لئے کہ اس سے نئی نسل اور طبقہ علماء کے درمیاں ذہنی بگد کی جو صورت پیدا ہوگئی، اس کے خاتمہ کی صورت پیدا ہوگی۔

زیر نظر کتاب مولانا علی میاں کے زندگی بھر کے تجربات ومشاہدات اور دعوتی کام کے دوران پیش آنے والے واقعات، اصلاح نفس، دعوتی کام کی ضرورت، اپنے اساتذہ اور ہمہ عصر بزرگوں کے پاکیزہ واقعات جیسے بہت سارے موضوعات پر مشتمل ہے۔

ملفوظات کی یہ کتاب کئی اعتبار سے منفرد نوعیت کی کتاب ہے، اگرچہ یہ ملفوظات عارف وقت کی ملفوظات ہیں، لیکن اس میں راہ سلوک کے حالات ومسائل اور سالکین راہ طریقت کی کیفیات اور ان میں رہنمائی سے زیادہ بیسویں صدی کی دینی وعلمی شخصیات کی زندگی کے بعض جوہری پہلوؤں کی نشاندہی، موجودہ دور میں اسلام کے تحفظ وبقا کے لئے دینی جدوجہد کی ضرورت، عالم اسلام کی دعوتی وعلمی شخصیتوں کے تعارف جیسے موضوعات غالب ہیں۔

مجالس علی میاں (رحمہ اللہ) ''مجالس حسنہ'' کتاب کی اہمیت کے پیش نظر خاص

موضوعات پر ہم ان ملفوظات کا انتخاب پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی توضیح وتشریح بھی کریں گے۔

وقت کے سب سے بڑے چیلنج کو سمجھنے کی ضرورت

مولانا کی ملفوظات کی کتاب میں جدید تعلیم یافتہ نسلوں کا اسلام پر اعتماد بحال کرنے اور اس کے لئے درسگاہ کے طلبہ میں صلاحیت پیدا ہونے کے کام کو فیصلہ کن اہمیت دی گئی ہے۔ چونکہ مولانا کی مجالس کے مخاطب دارالعلوم ندوۃ العلماء کے طلبہ ہی تھے اور طلبہ کی ذہنی، علمی اور روحانی تربیت مقصود تھی، اس لئے ان ملفوظات میں طلبہ کو وہ کام یاد دلائے گئے ہیں، جو انہیں کرنے ہیں۔ ان کاموں میں دور جدید کے علمی چیلنج کو سمجھکر، اس کے مقابلہ کا کام اہم ہے۔ فرماتے ہیں۔

''اس دور کا سب سے بڑا چیلنج'' جس کو ہم ایک سے زائد بار بیان کر چکے ہیں، یہ ہے کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ (انٹلیکچول کلاس) کے ذہن سے اسلام کے زمانے میں قابل عمل ہونے کا احساس ختم ہوگیا ہے تو اس بات کی ضرورت ہے کہ ان کے ذہن میں یہ بات جاگزیں کی جائے کہ اسلام میں یہ صلاحیت (موجود) ہے کہ وہ پوری طرح اس دور کا بھی ساتھ دے سکتا ہے۔ تو فضلائے مدارس کے لئے ضروری ہے کہ ان کتابوں کا مطالعہ کریں، جن سے مغربی تہذیب کا کھوکھلا پن معلوم ہو، بہت سے انگریز مصنفین نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے کہ یہ تہذیب ناکام ہوچکی ہے۔ (صفحہ ۶۳۳)

فرمایا: ہماری تحریروں کا بنیادی مضمون اور مرکزی موضوع جس کو قدر مشترک کہا جا سکتا ہے، یہ ہے کہ اسلام کی صلاحیت وابدیت پر اعتماد بحال ہوجائے اور مسائل اور مشکلات کے حل ہونے کا یقین ہو، بالخصوص جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے ذہن میں یہ بات پورے وثوق کے ساتھ بیٹھ جائے، اس کو ہم کئی دفعہ بیان کر چکے ہیں۔ (صفحہ ۶۴۵)

فرمایا: یہاں سے فارغ ہونے کے بعد کچھ انگریزی پڑھو، معاش کے لئے نہیں، بلکہ خدمت دین کے لئے، اور جدید طبقہ کو مطمئن کرنے کے لئے مطالعہ وسیع کرو، نئی چیزیں پڑھو، وہ جو سنجیدہ اور خیال آفریں ہو، ذہن کو غذا پہنچانے والی، اس وقت سب سے

بڑا کام یہ ہے کہ جدید تعلیم یافتہ طبقے میں اسلام کی ابدیت، صلاحیتِ بقا اور صلاحیتِ قیادت کا بھی اعتماد بحال کریں، اس وقت کا سب سے بڑا فتنہ یہی ہے کہ جدید طبقہ کے ذہن سے اسلام کی صلاحیتِ بقا کا اعتماد اٹھتا جارہا ہے۔ حکومت بھی اسی طبقہ کے ہاتھ میں ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ اسلام نے بہت اچھے کام کئے ہیں، لیکن اسلام غیر ترقی یافتہ اور پسماندہ ملک میں آیا تھا، یہ بات ان کے ذہن میں رہتی ہے۔ وہ (یعنی اسلام) اب اس ترقی یافتہ دور میں کہاں چل سکتا ہے۔ اس کا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔ (صفحہ ۲۶۸)

فرمایا: مدارس کا اب تک یہی حال ہے کہ کچھ عربی سمجھ سکیں اور فتویٰ دینا آجائے، یہ فتوے کا کام بھی بہت ضروری ہے۔ لیکن اصل کام دینی بگاڑ کو دور کرنا اور اسلام پر اعتماد بحال کرنا ہے، جس کی طرف کوئی توجہ نہیں ہے، ہم نے اعظم گڑھ میں مستشرقین پر ہونے والے سیمینار میں اسی موضوع پر تقریر کی تھی کہ انگریزوں کو جب اپنا سیاسی تسلط کمزور ہوتا ہوا نظر آیا تو انہوں نے ایک ایسی ٹیم تیار کی، جس سے وہ ذہنوں پر تسلط قائم رکھیں اور ان کو ذہنی غلام بنائیں۔

آج اسلامی ممالک میں حکومت اسی طبقہ کے ہاتھ میں ہے، اگر نہیں تو اس کا غلبہ ہے، جیسے سعودیہ، جو اسلام کے مستقبل سے قطعی مایوس ہیں، اس کی صلاحیت پر ان کو کوئی اعتماد نہیں، اس پر بہت کم کام ہوا ہے۔ محمد اسد صاحب نے اس پر لکھا تھا، پھر ہماری کتاب (ماذا خسر العالم) نے بہت کام کیا، بڑے وقت پر نکلی، مولانا مودودی نے بھی اس پر کام شروع کیا تھا۔ (صفحہ ۳۲۲)

مولانا علی نے جس کام کی طرف توجہ دلائی ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ کام ایسا ہے، جو مسلمانوں کے لئے موت وزندگی کی حیثیت رکھتا ہے، اس کام کی طرف قابل ذکر توجہ نہ دینے کی وجہ سے پورے عالم اسلام میں تہذیبی انحراف وبغاوت کی روش عمومی صورت اختیار کر چکی ہے۔ حکمراں، اور اس سے منسلک طبقات سرمائیدار، اہل سیاست، میڈیا سے وابستہ افراد وغیرہ ان سب کی بڑی اکثریت مادہ پرستی اور نفس پرستی کی قوتوں کے زیر اثر ہو چکی ہے۔ نیز مادہ پرست عالمی تہذیب اور اس کے نمائندوں نے ہمارے مذکورہ طبقات پر اتنی گرفت حاصل کر لی ہے کہ وہ مختلف ممالک میں اسلام کا نام لینے والوں کو پھانسیاں دے رہے ہیں اور جو مدارس قال اللہ وقال الرسول کے نام سے گونج رہے ہیں، ان

مدارس کو جہالت کی ڈگریوں کا مرکز قرار دے کر ان کے خاتمہ کے آرزو مند ہیں اور اس کے لئے کوشاں ہیں، محض اس لئے کہ عالمی کفر کی طاقتیں، جو ان کی سرپرست ہیں، ان کی خوشنودگی حاصل ہو۔

عالم اسلام کی عمومی صورتحال یہ ہے کہ جدید تعلیم سے وابستہ ذہین افراد کی بڑی اکثریت این جی اوز کے نام پر چند سکوں کی خاطر تہذیبی ومعاشرتی محاذ پر عالمی کفر کے لئے کام کررہی ہے اور وہ اسے اپنی سعادت سمجھنے لگی ہے کہ اس کام کی بدولت اتنے بڑے معاوضے ملنے لگے ہیں۔

اگرچہ اس صورتحال کے پیدا ہونے میں مختلف اہم اسباب کارفرما ہیں۔ مثلاً جدید تعلیمی اداروں میں مادہ پرست نظریات کی بنیاد پر ذہنوں کی نشوونما، نفسی قوتوں کو مشتعل کرنے اور مادی دنیا کی عظمت کا نقش بٹھانے والی الیکٹرانک میڈیا، معاشی دوڑ کی شدید کشمکش اور اس میں آگے بڑھنے کی کاوشیں، روزی کی مجبوریاں، دولت کا سرمایہ دار اور حکمرانوں اور ان سے وابستہ طبقات کی طرف ارتکاز اور اس دولت پر سانپ بن کر بیٹھنے کی اجتماعی نفسیات وغیرہ، لیکن اس کے بعض اسباب ایسے ہیں، جو مذہبی طبقات سے متعلق ہیں۔ جن میں یہ چیزیں شامل ہیں۔ جدید نسلوں سے ان کے ذہنی فرق کی وجہ سے مذہبی طبقات کے عملی تعلق ورشتہ کا منقطع ہونا، اسلام کے بارے میں تعلیمی اداروں، لٹریچر اور میڈیا کے زیراثر ان میں جو ذہنی شکوک وشبہات پیدا ہوتے ہیں، ان شکوک کے ازالہ کی صورت کا پیدا نہ ہونا، دور جدید میں زبان، اسلوب بیان اور استدلال نے جو نیا لباس اختیار کیا ہے، جس میں جدید نسلوں کی نشوونما ہوئی ہے، اس اسلوب بیاں اور استدلال کے مطابق مذہبی طبقات کی طرف سے اسلام کی پیشکش میں ناکامی، اجتہادی صلاحیتوں سے کام لے کر نئے نظریات کی علمی طور پر تردید اور ان کی کمزوریوں کی نشاندہی کی صلاحیتوں سے عدم بہرہ وری، مسلکی، گروہی، جماعتی اور شخصی عصبیت کے دائروں سے بلند ہو کر، امت کو درپیش قیامت خیز خطرات کے فہم اور اس سے مقابلہ کے احساس کا فقدان، وغیرہ، یہ ایسی کمزوریاں ہیں۔ جنہوں نے اہل مذہب کو جدیدیت سے فکری اور علمی طور پر مرعوب نسلوں کو سہارا دینے، انہیں سنبھالنے اور انہیں ملت سے وابستہ رکھنے میں اپنے کردار کی ادائیگی کے موقعہ سے قاصر رکھا۔

مولانا علی میاں اس کام کو عصر حاضر میں اسلام کے تحفظ وبقا کے لئے سب سے بڑا کام سمجھتے ہیں، ان کی بیشتر کتابوں اور تقاریر میں اسی نکتہ کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ مولانا موصوف نے قرآن وسنت کی روح اور بزرگان دین کی تعلیمات کو ایسا رنگ دیا ہے، جو جدید زبان، جدید اسلوب اور جدید استدلال سے ہمہ آہنگ ہے۔ جس میں جدیدیت کی کوئی آمیزش نہ ہونے کے باوجود وہ جدید ذہن سے ہم آہنگ ہے۔ اسلام چونکہ ایک فطری دین ہے، یہ فطری دین اپنے اندر اتنی لچک رکھتا ہے کہ وہ ہر دور کے حالات اور ہر دور کی زبان اور ہر دور کے اسلوب میں پیش ہونے کی پوری استعداد رکھتا ہے۔ مولانا علی میاں نے اسلام کی اس فطری استعداد ولچک کو پیش نظر رکھکر اپنے اسلامی فکر کی پیشکش میں پوری طرح اس اسلوب سے کام لیا ہے۔ اس سلسلہ میں ان کی کتابیں ''انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر'' مسلمان ممالک میں اسلامیت ومغربیت کی کشمکش ''مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں'' ''مذہب وتمدن'' ''نئی دنیا (امریکہ) میں صاف صاف باتیں'' ''تاریخ دعوت وعزیمت'' (چھ حصے) وغیرہ اہم کتابیں ہیں۔ جن کے مطالعہ سے جدیدیت سے مرعوبیت میں کمی واقع ہوتی ہے اور طبقہ علماء کو جدید دور میں دعوتی کام کے لئے نئی زبان اور استدلال کی نئی عمارت فراہم ہوتی ہے۔

عالم اسلام میں
طاقتور اسلامی تحریک کی ضرورت

مولانا علی میاں عالم اسلام میں معاشرہ کی سطح پر ایک طاقتور اسلامی تحریک کی شدت سے ضرورت محسوس کرتے رہے ہیں، ایسی تحریک جو نئی نسلوں کو دور جدید کی تحریکوں، اور مادی تہذیب کی یلغار سے بچاؤ اور انہیں اخلاقی طور پر سنبھالنے میں بنیادی کردار ادا کرے، یہ تحریک ایسی ہو، جو غیر سیاسی بنیادوں پر ہو، اس لئے کہ سیاست خود ایسا کام ہے، جو خود کل وقتی نوعیت کا کام ہے، اس تحریک میں ذہن سازی، یعنی ذہنی تربیت کے ساتھ ساتھ روحانی تربیت، تزکیہ وتہذیب نفس کی بھی بہتر صورت موجود ہو۔

معاشرہ میں صدیوں تک صوفیاء کرام کی خانقاہوں نے اس طرح کی تحریک کا کردار ادا کیا ہے۔ لیکن موجود دور میں نظریاتی فتنوں کی ہمہ جہتی وہمہ گیری اور عالمگیریت کی

تحریک نے خانقاہوں کے اثرات بڑی حد تک محدود کردیا ہے۔ اب تحریکوں کا دور ہے، جس میں ذہین نوجوانوں کو جدیدیت کے فکری وعلمی اثرات سے نکال کر، انہیں اسلامی تحریک کا حصہ بنانا ہے،عالم عرب میں حسن البنا نے اخوان المسلمون کے نام سے اس طرح کی تحریک برپا کی تھی، جس نے عالم عرب میں کافی ہلچل برپا کی اور جدید تعلیم یافتہ افراد کی کافی بڑی تعداد کو فرنگی تہذیب کی یلغار سے بچا کر انہیں اسلام کے لئے ہر طرح کی قربانیاں دینے پر آمادہ کیا، لیکن کچھ قبل از وقت سیاست میں عملی شرکت اور کچھ اسرائیل اور مغربی ممالک کی سازشوں اور کچھ فوج کے طاقتور ادارہ وغیرہ ان ساری چیزوں نے مل کر اس قوت کو مفلوج کرنے کی کاوش کی، اور اخوان ہر دور میں شدید ابتلا وآزمائش کا شکار رہے۔

تبلیغی جماعت نے بھی اس سلسلہ میں عالم اسلام کی سطح پر اچھا کردار ادا کیا ہے اور بہت سارے افراد کو دینی طور پر سہارا دیا ہے اور مستحکم کیا ہے، لیکن تبلیغی جماعت میں علمی اسلوب بیان کی کمی اور چھ نکات کی حدبندی جیسی چیزوں نے جدید تعلیم یافتہ افراد کی ذہنی وعلمی تسکین کی صورت پیدا ہونے میں رکاوٹ پیدا کی۔

جماعت اسلامی نے اس ضرورت کو ایک حد تک پُر کرنے کی کوشش کی ہے اور بڑا لٹریچر تیار کیا ہے، لیکن روحانی تربیت اور تزکیہ کے فقدان اور سیاسی تبدیلی کے کام کو فیصلہ کن اہمیت دینے جیسے اسباب کی وجہ سے جماعت اسلامی جدیدیت کی طوفان خیزی سے بچاؤ اور جدید تعلیم یافتہ آبادی کی بڑی تعداد کو سنبھالنے اور ان کی تربیت اور سیرت وکردار کے استحکام میں فیصلہ کن کردار ادا نہ کرسکی۔

عالم اسلام میں معاشرہ کی سطح پر اس طرح کی طاقتور تحریک کے فقدان نے مسلم معاشرہ کو اندر سے کھوکھلا کردیا ہے اور مادہ پرست عالمی تہذیب کے فروغ کے لئے پوری طرح حالات کو سازگار بنا دیا ہے۔

اس خلا کو پُر کرنے کی کاوش کا ہونا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ یہ ضرورت تصوف سے وابستہ ذہین افراد، دینی مدارس سے وابستہ افراد، تبلیغی جماعت کے تیار کردہ متحرک اور وسیع الفکر افراد اور جماعت اسلامی کے تجربات سے استفادہ کرنے والے افراد مشترکہ طور پر غور وفکر کے ذریعہ پُر کرسکتے ہیں۔

کتاب میں اس طرح کی تحریک کے بارے میں مولانا کے مختلف ملفوظات موجود ہیں۔ یہاں دوچار ملفوظوں پر اکتفا کی جاتی ہے۔

''اپنی کتاب سیرت سید احمد شہید کی تصنیف کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: مگر ایک نئی کتاب کی ضرورت تھی، جو لوگوں میں جوش پیدا کرے، اور منظّم کام کرنے پر آمادہ کرے، اسی زمانے میں ''خاکسار تحریک'' بھی شروع ہوئی تھی، علامہ مشرقی اس کی قیادت کرتے تھے، یہ بالکل لادینیت کی سی تحریک تھی، ورزش تھی، کچھ اعمال تھے، نظم وضبط تھا، مگر دین کی طرف کوئی توجہ نہیں تھی، اگر یہ تحریک چل پڑتی تو بڑا خطرہ ہوتا، اس کا مقابلہ کرنے کے لئے سیرت سید احمد شہید کی تالیف بہت ضروری معلوم ہوئی کہ پورے دین پر کاربند رہنے کے ساتھ کس طرح نظم وضبط کے ساتھ منظّم کوشش کی جا سکتی ہے۔ اس کی تصویر سامنے آجائے، یہ ایک خلا تھا اور اس خلا کا پُر ہونا ضروری ہے، پُر ہونا ہی ہے، چاہے اچھے طریقے سے ہو یا بڑے طریقہ سے، بہرحال پُر ہونا ہے یہاں کوئی دینی تحریک نہیں تھی۔

کسی ملک میں تحریک کا نہ ہونا اس کے لئے بڑا خطرناک ہوتا ہے، تبلیغی تحریک نے اس خلا کو پُر کیا، بڑی مفید اور مؤثر تحریک ہے، اس سے لگے رہنا چاہئے، مگر افسوس کہ عالم عرب میں کوئی تحریک نہیں، ایک اخوانی تحریک تھی، اس کو بھی کچل کر رکھ دیا گیا۔ (صفحہ ۵۷۹)

مولانا نذر الحفیظ صاحب نے کہا: آج ایک خلا ہے، کوئی طاقتور تحریک نہیں ہے، نہ امید ہے تو یہ خلا کیسے پُر ہوگا؟

حضرت نے ایک آہ سرد بھری اور فرمایا اللہ تعالیٰ ہی اس خلا کو پُر کرے گا کہ کوئی ایسی شخصیت پیدا کرے گا، جو بالکل جامع ہو کہ ہر طبقے اور ہر مکتبہ خیال کے لوگ اس کے قریب آجائیں۔ جیسے قریب ہی کی شخصیتوں میں امام حسن البناؒ تھے، ہر طرح کے لوگ ان کے ساتھ ہوگئے، سعید رمضان جو پورے جدید تعلیم یافتہ تھے اور محمد الغزالی جو قدیم طرز کے پڑھے ہوئے تھے اور وہ لوگ جن کا نام ہمارے روز مچہ میں آیا ہے، سب نے شیخ حسن البنا کو بڑا تسلیم کیا اور اپنے اپنے حلقوں میں کام کرنے لگے اور ان کی تعلیمات عام کرنے لگے۔ (صفحہ ۶۰۸)

مولانا نذر الحفیظ صاحب نے سوال کیا: بالخصوص ہندستان اور بالعموم عالم اسلام کے

اس وقت جو حالات ہیں، اس میں کس قسم کی تیاری کی ضرورت ہے۔ کیا کرنا چاہئے؟ فرمایا، صحیح دینی حمیت پیدا کی جائے۔ اپنی اصلاح کا عزم ہو، اس کے لئے جماعتی کوششیں ہوں، معاشرہ کا جو مرض ہے اس پر ہاتھ رکھنا چاہئے۔ معاشرہ میں جو برائیاں پنپ رہی ہیں، جو بدعات، رسوم ورواج اور غلط افکار ہیں، ان کو ختم کرنے کی کوشش کی جائے، بلکہ صحیح تعبیر میں ان کو نشانہ بنایا جائے۔

مجددین کا یہی طریقہ تھا، معاشرہ میں جو خرابیاں ہیں، وہ ان کو نشانہ بناتے تھے۔ چاہے شیخ عبدالقادر جیلانیؒ ہوں یا ہندستان کے مشائخ، سب نے یہی کیا، مجدد الف ثانی کو دیکھئے، اکبر کا جب فتنہ اٹھا تو وہ اس کے مقابلہ کے لئے کس طرح کمر بستہ ہوگئے۔ (صفحہ۵۰۳)

اپنی شخصیت اور کمالات کی نفی
عبدیت کے رنگ کے استحکام کے بغیر
فرد کا حالت خطرہ میں ہونا

مولانا علی میاں کے ہاں عاجزی، انکساری، فروتنی اور اپنی شخصیت اور کمالات کی نفی کا رنگ غالب ہے۔

ایک ملفوظ میں فرماتے ہیں۔

ہم پر اللہ کا بڑا کرم ہوا، ورنہ ہم کیا تھے، یتیم تھے، ہوسکتا ہے کہ کسی ہوٹل میں نوکر ہوتے یا یہ بھی نہ ہوتا۔ (صفحہ۹۹)

ایک ملفوظ میں ہے: وقالم اللہ شری، وقالم اللہ شری یعنی اللہ آپ لوگوں کو میرے شر سے بچائے، اللہ آپ لوگوں کو میرے شر سے بچائے۔ (صفحہ۴۵۹)

ایک تیسرے ملفوظ میں ہے، ہم کو روحانی سعادتوں میں بڑا حصہ نہ ملا، ہم علمی لائین کے آدمی ہیں۔ (صفحہ۳۱۳)

ان ملفوظات میں جس طرح اپنے سارے کمالات کی نفی کرکے، محض اللہ کے فضل وکرم کی بات فرمائی گئی ہے، یہ اہل اللہ کی امتیازی شان ہے، مولانا کا یہ کہنا کہ اگر اس کا فضل خاص نہ ہوتا تو ہم ہوٹل کے ملازم ہوتے یا وہ بھی نہ ہوتے۔

حقیقت یہ ہے کہ اہل اللہ، اللہ کی شان عظمت کے تلے دبے رہتے ہیں اور ان کے قلب پر مختلف صفات الٰہی کا نزول برابر ہوتا رہتا ہے، جس سے ان پر فنائیت، نفی ذات، عبدیت کے آداب کی بجا آوری میں کوتاہی اور اپنی سیہ کاری کا احساس غالب رہتا ہے، ایسی ہر چیز جس سے کوئی کمال ان کی طرف منسوب ہو یا جس سے دعویٰ کا تاثر پیدا ہوتا ہو یا دوسروں کی تحقیر ہوتی ہو، اس سے وہ شدید خائف رہتے ہیں کہ کہیں اس درگاہ عالی سے مسترد نہ کردیئے جائیں۔ حقیقی اہل اللہ پر خوف کی یہ تلوار ہر وقت لٹکتی رہتی ہے، اس لئے ان کے ہاں عاجزی، اپنے نفس کی پامالی اور اپنے حقیر تر ہونے کا احساس موجود ہوتا ہے، اگرچہ دوسرے لوگ انہیں کتنا ہی بڑا اور اللہ کے قرب کے مقام کا حامل اور صاحب کمال سمجھتے ہوں، لیکن اللہ کی صفاتی تجلیات کے غلبہ کی وجہ سے خود ان پر اپنے کچھ بھی نہ ہونے کا رنگ غالب رہتا ہے۔

اللہ آپ کو میرے شر سے بچائے۔ ایسی بات وہی شخصیت کہہ سکتی ہے، جو اللہ کی شانِ عظمت سے لرزاں وترساں رہتی ہو اور اور جو بشری تقاضوں کے تحت ہونے والے معمولی گناہوں، یا عبادت وذکر میں معمولی سستی وکوتاہی کو بھی اپنی سیہ کاری تصور کرتی ہو، اور جس پر آخرت میں سخت احتساب کا خوف طاری ہو۔

تیسرے ملفوظ کی یہ بات کہ ہم کو روحانی سعادتوں سے بڑا حصہ نہیں ملا۔

یہ مولانا کی عاجزی اور نفی ذات کا اظہار ہے۔

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مولانا کے دعوتی، علمی اور دوسرے سارے کاموں میں ان کی روحانی بلندی وترقی کی جھلک صاف طور پر نظر آتی ہے۔ مولانا نے عالمی سطح پر جو عظیم نوعیت کے علمی ودعوتی کام کئے ہیں، اس میں اللہ کے فضل خاص مطالعہ، ذہانت کے ساتھ مولانا کی غیر معمولی روحانی استعداد کو بھی عمل دخل حاصل ہے۔

اپنی ذات کی آخری حد تک نفی کا اظہار، صاحب کمال بزرگ کے علاوہ دوسروں سے ہو سکے، ممکن نہیں۔ معاشرہ میں باصلاحیت وبے صلاحیت افراد کے درمیاں ساری کشمکش اناؤں کے ٹکراء ہی کا تو نتیجہ ہے، اگر فرد چھوٹا بن کر رہے، اپنے لئے کسی مقام، عزت وشہرت اور نام وری کی طلب سے مکمل طور پر دستبردار ہوجائے تو معاشرہ خیر کا نمونہ بن جائے۔

دراصل محبوب حقیقی، اپنے ولی کو اسی حالت میں دیکھنا چاہتا ہے، اس کی ساری ترقی،

درجات وکمالات اور قرب کے حالات اس کی اسی کیفیت کے استحکام ہی سے وابستہ ہیں۔

مولانا علی میاں کے مذکورہ ملفوظات کو دیکھکر ہم اگر اپنے دل کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ معمولی مجاہدوں سے ہمارا نفس اتنا پھول جاتا ہے کہ وہ اپنے علاوہ کسی کی بزرگی کو تسلیم کرنے کے لئے ہی تیار نہیں ہوتا۔ ہمارا نفس عام طور پر ہر مجلس میں اس بات کے لئے کوشاں ہوتا ہے کہ کسی طریقہ سے مجلس میں معاصر شخصیتوں کا ذکر ہو تو ان کی تحقیر وتذلیل کرکے تسکین نفس کی صورت پیدا ہو۔

ظالم نفس کے اس طرح کے تسلط کی موجودگی میں بزرگی تو دور کی بات ہے، اصلاح نفس ہی کی کچھ امید رکھنا عبث ہے۔

اہل اللہ کے حالات اور ان کے ملفوظات کے مطالعہ سے نفس کی ان خرابیوں کے ادراک کے ساتھ ساتھ خوداحتسابی کے عمل میں تیزی آنے لگتی ہے۔ اس طرح فرد کے لئے اپنی ذات کی عظمت کے دائرہ احساس سے باہر نکل کر، حقیقت شناس بن کر چھوٹے پن کی حیثیت سے زندگی گذارنے میں آسانی ہوتی ہے۔ دوسری صورت میں خالی علم، زہد اور محض ذاتی نوعیت کے مجاہدوں سے نفس کی ساخت میں فیصلہ کن تبدیلی پیدا ہو، وہ آدابِ انسانیت سے بہرہ ور ہو، اس کی ذات دوسروں کے لئے کسی صورت باعث اذیت نہ ہو، دعویٰ سے آخری حد تک دستبردار ہو، نہ صرف مشکل ہے، بلکہ صوفیاء کی نظر میں غیر معمولی طور پر دشوار ہے۔ بعض صوفیاء تو اسے ناممکنات میں شمار کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں مولانا علی میاں جیسی عارف شخصیتوں کے عجز وانکساری کے کچھ اجزاء عطا فرمائے۔

مولانا کی نظر میں
دعوتی کام کی اہمیت

دریافت کیا گیا: روحانی ترقی سب سے زیادہ کس چیز سے ہوتی ہے تو آپ نے تین باتیں ارشاد فرمائیں، دو یاد رہ گئیں اور یہی زیادہ اہم ہیں۔ فرمایا، ذکر وعبادت اخلاص واستقامت کے ساتھ اور دعوت کا کام ایمان واحتساب کے ساتھ۔ (صفحہ ۵۳۴)

یہ بہت اہم نکتہ ہے، جو مولانا نے پیش فرمایا ہے۔ ذکر وفکر کی اہمیت تو مسلمہ ہے، اس کے بغیر نفس کے تہذیب کا عمل ممکن نہیں، لیکن دعوتی کام بھی راہ سلوک کا بنیادی حصہ

ہے۔ حضرت مجدد اور حضرت شاہ ولی اللہ نے دعوتی کام پر غیر معمولی زور دیا ہے۔ اگرچہ مبتدی طالب روحانی اور اخلاقی طور پر اتنا مستحکم نہیں ہوتا کہ وہ سلیقہ کے ساتھ دعوت کا کام کرسکے، البتہ متوسط طالب کے لئے دعوتی کام ناگزیر ہے اور اس کی روحانی ترقی میں ذکر وفکر کے ساتھ دعوتی کام بھی معاون ثابت ہوگا۔ اس کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں۔ ایک صورت یہ ہے کہ متوسط طالب اپنے روحانی استاد کی معیت وسرپرستی میں دعوتی کام کرے یا روحانی استاد کی طرف سے ہونے والے دعوتی کام میں معاونت کرتا رہے۔ موجودہ دور میں تو بالخصوص دعوتی کام کی فیصلہ کن اہمیت ہے، اس لئے کہ لوگ مادیت پرستی کے سیلاب میں تنکوں کی طرح بہے چلے جارہے ہیں، اور وہ کرب اور اذیت کے انگاروں سے گزر رہے ہیں۔ لیکن متوسط طالب کو دعوتی کام میں حکمت اور اعتدال کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ جہاں بھی وہ محسوس کرے کہ وہ اس کام میں حکمت کا دامن تھامنے میں ناکام ہے اور دعوتی کام میں نفسانیت، اشتعال، اور ضد وغیرہ کی آمیزش شامل ہوگئی ہے، وہاں اسے اپنے آپ کو سنبھالنے کے لئے کوشاں ہونا چاہئے، طالب کو دعوتی کام اپنے مزاج اور صلاحیتوں کے مطابق کرنا چاہئے۔ دعوتی کام میں راہ محبت کی اہمیت کو واضح کرنا، زندگی پر اللہ کے ذکر کے پڑنے والے اثرات کو اجاگر کرنا، حب مال وحب جاہ کی سرگرمیوں سے سکون وسکینت کے غارت ہونے کا نقصان ظاہر کرنا اور دینی فرائض کی طرف رغبت دلانا وغیرہ، یہ سارے کام ایسے ہیں، جو اسلامی دعوت کا ہدف ہیں۔

متوسط طالب کی روحانی ترقی میں ذکر وفکر کے ساتھ یہ دعوتی کام فیصلہ کن اہمیت کا حامل ہے۔

دوسروں کے ہاں موجود خیر کے
اعتراف میں بخل کی روش

ملفوظات میں اہل مذہب کی ایک بڑی کمزوری، جس کی نشاندہی کی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ اپنے دائرہ سے باہر موجود خیر اور اپنے حلقہ سے باہر بڑے سے بڑے دعوتی وعلمی کام کو اہمیت نہ دینے کی نفسیات غالب ہے، یہ کمزوری ایسی ہے جو عام طور پر بڑے بڑے اہل علم کے مزاج کا حصہ بن چکی ہے۔ اکابر اہل علم کے زیر اثر ان کے شاگردوں، مریدوں اور ان کے حلقہ سے وابستہ افراد کے مزاج کی تشکیل میں بھی یہ چیز شامل ہوگئی

ہے۔

دین کا جو داعی ہمارے گروہ سے وابستہ نہیں ہے، اس کا کام چاہے کتنا ہی وقیع اور علمی اعتبار سے کتنا ہی قیمتی اور غیر معمولی اہمیت کا حامل کیوں نہ ہو، لیکن وہ کام اس قابل ہی نہیں ہے کہ اس کی طرف التفات کیا جائے اور اسے اہمیت دی جائے، بلکہ نفسیات یہ ہے کہ اس طرح کے کام میں کمزور پہلو تلاش کر کر کے اسے بے وقعت کیا جائے۔

اس نفسیات نے مذہبی حلقوں کو غیر معمولی نقصان پہنچایا ہے، اس کا ایک بڑا نقصان تو یہ ہو رہا ہے کہ اس سے ایک دوسرے سے قربت کے راستے مسدود ہو جاتے ہیں، دوم یہ کہ امت کی وہ قیمتی علمی ودعوتی شخصیتیں جن کا ہمارے گروہ سے تعلق نہیں، ان کے زندگی بھر کے تجربات ومشاہدات اور ان کے وسیع مطالعہ اور جدیدیت پر ان کی معرکتہ الآراء تنقید سے استفادہ کی سعادت سے محرومی رہتی ہے۔

اسے ذہنی تنگی اور وسعت فکری کا بحران کہیں یا دائراتی خولوں میں بند رہنے کی وجہ سے خاص خطوط پر مزاج کی تشکیل یا جماعتی گروہی، خانقاہی اور درسگاہی مصلحتوں کا نام دیں، اذیت کی بات یہ ہے کہ اہل مذہب اور اہل علم کا یہ مزاج راسخ ہو چکا ہے۔

اس سلسلہ میں مولانا کے دو ملفوظ پیش کئے جاتے ہیں۔

''مولانا شمس الحق صاحب نے ماذا خسر کی مقبولیت کا ذکر کرتے ہوئے کہا ..... نے بتایا کہ ہم ٹیکسی پر جارہے تھے تو دیکھا کہ ٹیکسی ڈرائیور بھی اپنے پاس ماذا خسر رکھے ہوئے ہے، لیکن ہندوستان والوں نے اس کی قدر نہیں جانی۔

حضرت نے فرمایا: آج ہی خط آیا ہے علی احمد کا کہ ماذا خسر کی مانگ بڑھنے جارہی ہے اور بہت سے ناشرین نے اس کو شائع کیا ہے، بعض میں کچھ اغلاط بھی ہیں، ہم مزید شائع کرنا چاہتے ہیں، انہوں نے شائع کرنے کی اجازت مانگی تھی، لیکن ہندوستان والے کیا جانیں! یہ تو عربوں ہی کی خصوصیت ہے، عرب اپنی بہت سی کمزوریوں اور خامیوں کے باوجود بہت سی خصوصیات میں دنیا کی تمام قوموں سے منفرد ہیں، انصاف، اعتراف قدردانی، حق شناسی۔ پھر علی طنطاوی کے مختارات والے واقعے کو بیان کر کے فرمایا: کیا ہندوستان میں اس کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے! آج تک اپنے نصاب میں جگہ نہیں دے سکے، یہاں تو انظر الی ما قال، ولاتنظر الی من قال کے بجائے انظر الی من قال پہلے ہوتا

ہے، کیا کہا، یہ نہیں دیکھتے، کہنے والا کون ہے؟ لکھنے والا کون ہے؟ کس مکتب فکر سے اس کا تعلق ہے؟ ندوی ہے تو رہنے دو، ہاتھ نہ لگاؤ، یہ تنگ دلی دراصل ہندوؤں کے اثر سے ہے، ہندوؤں میں بہت زیادہ تنگ دلی ہے، وہ بہت جلد کسی کا اعتراف نہیں کرتے۔ اپنے اکابر سے وابستگی اور تعلق ہونا چاہیے، یہ بہت ضروری ہے، بلکہ یہ چیز محافظ ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ جو چیز ان کی طرف سے نہ آئی ہو، اور ان سے بظاہر اس کا تعلق نہ ہو، بلکہ دوسرے کی طرف سے آئی ہو، لیکن ان کی مخالف بھی نہیں بلکہ موید ہو، اس سے آنکھ بالکل بند کر لی جائے اور اس کی طرف دیکھا ہی نہ جائے اور اس کا اعتراف نہ کیا جائے!! (صفحہ نمبر ۶۲۲)

''مولانا شمس الحق صاحب نے پوچھا: آپ اپنے معاصرین کا تذکرہ جس کشادہ ذہنی اور فراخ دلی کے ساتھ کرتے ہیں، یہ بہت کم دیکھنے میں آیا ہے، اس میں کسی چیز کا اثر ہے؟

فرمایا: کیا کہا جائے، ندوے کا ماحول، بھائی صاحب کی تربیت اور بزرگوں کی صحبت کا اثر ہے کہ ہر شخص کے امتیاز اور تفرد کا اعتراف کیا جائے، یہ اس کا حق ہے، اس کا اعتراف نہ کرنا اور اس کو چھپانے کی کوشش کرنا اس پر ظلم ہے، یہ بات ہمارے یہاں کے قدیم فضلاء میں تھی، علامہ سید سلیمان ندوی جیسا علامۂ دہر اور مولانا عبدالباری جیسا فلسفے کا ماہر، لیکن حضرت تھانوی سے بیعت ہوتے ہیں، سب سے بڑھ کر سید سلیمان ندوی جن کی عالم میں شہرت تھی، لیکن اس کی انہوں نے پروانہیں کی کہ لوگ کیا کہیں گے، بلکہ ان کو حضرت تھانوی کے پاس وہ چیز نظر آئی، جس سے ان کو فائدہ ہوسکتا ہے تو ان کے دست گرفتہ ہوگئے، یہ خصوصیت ہمیشہ ندوے میں رہنی چاہیے کہ ہر ایک کی قدر، مرتبہ شناسی اور اس کے کمال کا اعتراف ہو، خیر جہاں سے بھی ہو، فائدے کی چیز جہاں بھی نظر آئے، اس کو حاصل کرنے کی کوشش ہونی چاہیے، یہ نہیں کہ یہ بات کس مکتبِ فکر سے تعلق رکھتی ہے، کس حلقے کی طرف سے کہی گئی ہے، ہمارے گھر میں بھی الحمدللہ یہ بات رہی، بھائی صاحب نے ندوے سے فراغت کی حاصل، لیکن والد صاحب نے ان کو حضرت شیخ الہند اور علامہ کشمیری کے درس حدیث سے استفادے کے لیے دیوبند بھیجا، اسی طرح بھائی صاحب نے ہمیں مولانا مدنی کے پاس بھیجا۔ (صفحہ نمبر ۶۲۳)

اختلاف رائے کے باوجود شخصیت کے احترام کا ہونا

مولانا کی تحریر کی ایک امتیازی شان جو اس دور میں عنقا ہوگئی ہے، وہ اختلاف رائے کے باوجود اس اختلاف کا اظہار مہذبانہ طور پر کرنا، اور اس اختلاف رائے کو تنقیص کی صورت نہ دینا ہے۔

مولانا مودودی کی فکر کے بعض پہلوؤں سے مولانا علی میاں کو سخت اختلاف رہا، اس موضوع پر انہوں نے ''عصر حاضر میں دین کی تفہیم وتشریح'' کے نام سے کتاب بھی لکھی، لیکن مولانا کے ساتھ اس اختلاف کو موصوف نے کبھی بھی شخصیت کے وقار کے مجروح ہونے اور تنقیص کی صورت نہ دی۔ ملفوظات کی اس کتاب میں بھی متعدد بار مولانا مودودی کا ذکر فرمایا ہے، اس لئے کہ رابطہ عالم اسلامی کے اجلاسوں میں مولانا کے ساتھ شریک رہے، عالم اسلام بالخصوص عالم عرب میں مولانا مودودی کے کام کے اثرات کا مشاہدہ کرتے رہے۔

مولانا مودودی کے بارے میں ایک جگہ فرماتے ہیں: مغربی تہذیب کے خلاف کہیں کچھ ملتا ہے تو محمد اسد کی کتاب روڈ ٹو مکہ یا اسلام ایٹ دی کراس روڈ میں اور مولانا مودودی کی تحریروں میں ملتا ہے، جو انٹلکچول کلاس کو متاثر کر سکے اور مستشرقین کو خاموش کرسکے۔ اللہ نے ہمیں اس کی توفیق دی، اصل خطرہ تو یہی ہے، استعمار سے بڑا خطرہ ہے۔ (صفحہ۲۹۵)

حکومت تک ایمان پہنچانے کی کاوش کا ہونا

ایک اہم نکتہ جو مولانا نے فرمایا ہے، وہ یہ ہے کہ دعوت کے ذریعہ افراد کی اصلاح ضروری ہے۔ اقتدار کے صاحبوں کا فریق بن کر دعوت کے کام کو متنازع بنانا اور متاثر کرنا حکمت کے منافی عمل ہے۔

مولانا کے الفاظ یہ ہیں:

(طلبہ سے مخاطب ہوتے ہوئے) فرمایا: آپ لوگ جب دعوت کا کام کریں تو کبھی

حکومت حاصل کرنے کی کوشش نہ کرنا، ایمان حکومت تک پہنچاؤ۔ (صفحہ۴۰۲)

اگر تعلیمی وتربیتی اداروں اور دعوتی کام کے لئے بڑے پیمانہ پر منصوبہ بندی کے ذریعہ ایسے افراد تیار کئے جائیں، جو مختلف محاذوں پر اسلام کی سربلندی کا کام کریں تو یہ کام ایسا ہے جو اہل اقتدار کا فریق بننے سے سو مرتبہ زیادہ افضل کام ہے، اس لئے کہ سیاست میں فریق بننے کے بعد ایک تو دعوتی کام میں تاثیر باقی نہیں رہتی، ایسا دعوتی کام سیاسی مخالفت کے نذر ہوجاتا ہے۔ دوم یہ کہ براہ راست سیاست میں آجانے کے بعد سیاسی خرابیوں سے بچاؤ اور مخالفت برائے مخالفت کی سیاست اور سیاسی گٹھ جوڑ سے بچنا دشوار تر ہے۔ اس کی بڑی خرابی جو ظاہر ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ سارے دینی، دعوتی وعلمی کام سیاست کی نذر ہوجاتے ہیں۔ سیاست کی ان خرابیوں کی وجہ سے مجددین امت اور مصلحین امت نے ہر دور میں حکمرانوں سے حکومت میں فریق بننے کی بجائے ان تک ایمان کی دعوت پہنچانے اور ان کی اصلاح کی کاوش کی ہے۔ اس کے یہ اثرات ہیں کہ بادشاہوں کی ساری خرابیوں کے باوجود اسلام کا تسلسل ہم تک پوری طرح پہنچا ہے، ادھر ہماری حالت یہ ہے کہ ہم نئی نسلوں تک ایمان پہنچانے میں ناکام ہیں۔ بعض مؤثر دینی جماعتیں معاشرہ کو دینی واخلاقی اعتبار سے سنبھالنے کی قیمت پر ساری توانائیاں وقتی سیاست میں صرف کررہی ہیں۔

سیاست کی بہتری کی صورت یہی ہے کہ اہل سیاست تک ایمان ویقین کی بات پہنچانے کے لئے بہتر حکمت عملی تشکیل دی جائے، اسی دعوتی کام سے ہی اہل سیاست میں ایسے لوگ سامنے آئیں گے، جو ریاست ومعاشرہ کی تشکیل کے کام کو اپنا کام شمار کریں گے۔

صحبت کا تعلیم سے زیادہ اہمیت کا حامل ہونا

کتاب میں صحبت اہل اللہ پر بھی زیادہ زور دیا گیا ہے۔ بلکہ صحبت کو تعلیم سے زیادہ اہمیت کا حامل قرار دیا گیا ہے۔

فرمایا: خیال ہوتا ہے کہ (مجلس کے) اس سلسلہ کو بند کر دیا جائے، تاکہ طلبہ کے مطالعہ میں حرج نہ ہو، اس سے حرج ہوتا ہوگا۔

مولانا نذر الحفیظ صاحب نے کہا، تعلیم کے ساتھ صحبت بھی بہت ضروری ہے، اسی صحبت کی کمی کی وجہ سے بقول آپ کے تحریف وانحراف پیدا ہوگیا ہے۔

حضرت نے فرمایا: بات صحیح ہے۔ صحبت تعلیم سے زیادہ ضروری ہے، اس کی اہمیت تعلیم سے بڑھکر ہے۔ پھر اقبال کا یہ مشہور شعر پڑھا۔

صحبت پیر روم سے مجھ پر یہ نکتہ فاش
لاکھ حکیم سربہ جیب، ایک کلیم سربکف

(صفحہ۶۱۴)

تشریح

تعلیم کیا ہے، تعلیم، نقوش، الفاظ، اصولوں اور ہدایات کا ڈھانچہ اور اس کا مجموعہ ہے، جب کہ تزکیہ اور تہذیب نفس وہ روح ہے، جس کے شامل ہوجانے سے الفاظ اور ہدایات کے ڈھانچہ میں جان آجاتی ہے، شخصیت کی تعمیر کی صورت پیدا ہوتی ہے اور سیرت وکردار میں انسانیت سے ہمہ آہنگی پیدا ہوجاتی ہے اور تزکیہ اور تہذیب نفس کا عمل مزکی ومربی سرانجام دیتا ہے، اور اہل اللہ کی صحبت ہی زندگی میں معنویت و روح پیدا کرتی ہے۔

بدقسمتی سے موجودہ دور میں عقلیت کی تحریکوں کے غلبہ کے زیر اثر زندگی میں فیصلہ کن انقلاب کے سلسلہ میں اس سب سے قیمتی نکتہ سے اعراض کی روش اختیار کی گئی ہے اس کا نتیجہ ہے کہ علم میں ترقی ہونے کے باوجود سیرت وکردار کا بحران پیدا ہوتا جارہا ہے۔

جب تک تعلیم کے ساتھ صحبت اہل اللہ کے اہتمام کی صورت پیدا نہ ہوگی، تعلیم ہمیں حب جاہ وحب مال سے پاک افراد فراہم کرسکے اور اخلاقی بحران میں کمی پیدا ہو سکے اور بڑھتی ہوئی معاشرتی خرابیوں کی روک تھام کی صورت پیدا ہو سکے، ممکن نہیں۔

جدید تعلیمی اداروں سے یہ توقع رکھنا کہ وہ طلبہ کی تربیت کے سلسلہ میں صحبت اہل اللہ کے نکتہ پر غوروفکر سے کام لیں گے، عبث ہے، البتہ دینی درسگاہوں کے فضلاء سے بجا طور پر یہ امید رکھی جاسکتی ہے کہ وہ تعلیم ہی کی طرح صحبت اہل اللہ کے خصوصی اہتمام کے ذریعہ طلبہ کی صلاحیتوں کو ضایع ہونے سے بچانے اور انہیں معاشرہ کا قیمتی فرد بنانے کے

لئے کوشاں ہوں گے۔

دل کے امراض سے
حفاظت کی صورت

فرمایا: دل کے امراض سے محفوظ ہونے کے لئے سب سے مؤثر چیز صلحاء واولیاء کی صحبت ہے۔ فرد دیکھے کہ وہ کس طرح خدا سے تعلق رکھتے ہیں اور کس طرح لوگوں سے معاملہ کرتے ہیں، دوسرے یہ کہ امراض کو معلوم کرکے ان کے علاج کی فکر کرے۔ (صفحہ۶۶۹)

صحبت اور ذکر میں سے زیادہ مؤثر کیا ہے؟ کے سوال کے جواب میں فرمایا، دونوں چیزیں مؤثر ہیں اور ضروری، مگر دونوں کی تاثیر مختلف ہے، ذکر کا ایک خاص اور محدود اثر ہوتا ہے، جب تک مرشد اور شیخ زندہ ہے (مگر شرط یہ ہے کہ وہ کامل ہو) اس کی صحبت سے فائدہ اٹھانا چاہئے، اور زیادہ سے زیادہ وقت اس کے ساتھ گذارے، ذکر کے آثار اس میں دیکھے اور اس کی زندگی کی حرکات وسکنات پر غور کرے، اس کے بعد خود ذکر کی بھی توفیق ہوگی اور اس میں جی لگے گا۔ شیخ کامل کی صحبت میسر نہ ہو اور اس کی صورت میں ذکر کا اثر نہ دیکھے تو مجرد ذکر میں غفلت وسستی کا بھی امکان ہے اور اس کی پابندی نہ کرنے کا بھی خدشہ ہے۔ (صفحہ۲۶۲)

تشریح

اہل اللہ ذکر وفکر کے غیر معمولی مجاہدوں اور اپنے روحانی استادوں کی طویل عرصہ کی صحبت کے وجہ سے اخلاص ویقین کی جن کیفیات سے ہمہ وقت سرشار رہتے ہیں، ان سے مستحکم تعلق کے نتیجہ میں ایمان ویقین کی یہ پاکیزہ کیفیات منتقل ہونے لگتی ہیں اور تقویٰ کی استعداد میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔ یہ نکتہ ایسا ہے، جسے ذہانت اور علم کی مدد سے نہیں سمجھا جاسکتا، اس کے لئے اہل اللہ کے اجماع پر اعتماد کرکے، ان کے سامنے خودسپردگی اختیار کرنی پڑتی ہے۔ اس خودسپردگی کے نتیجہ میں ذہانت اور علم کی زیادتی کی وجہ سے فرد وافراد اپنی ذات سے معاشرہ اور ملت کو جو نقصان پہنچا سکتے ہیں اور نئی دعوتوں کے ذریعہ امت

میں تقسیم کا جو فتنہ پیدا کرسکتے ہیں، اس سے بچاؤ کی صورت پیدا ہوگی اور شخصیت میں استحکام، ٹھیراؤ، مزاج میں توازن واعتدال اور دوسروں کو اپنی ذات سے اذیت پہنچانے سے بچاؤ اور افراد کو ساتھ لے کر چلنے کی استعداد پیدا ہوگی۔

مولانا علی میاں جیسی ممتاز علمی وفکری شخصیت کی طرف سے اس پر زور واصرار اہل علم کے لئے لمحہ فکریہ ہے۔

اداروں اور جماعتوں کی اہل اللہ سے بے نیازی کے نتائج

فرمایا: کسی مدرسے، ادارے اور تحریک کی ترقی اور اس میں برکت اور افادیت اس وقت تک نہیں ہوسکتی، جب تک اس زمانے کے صلحاء اور اہل قلوب سے اس کا تعلق نہ ہو اور وہ اس سے خوش نہ ہوں اور جب کوئی مدرسہ یا ادارہ اپنے زمانہ کے اہل قلوب سے بے تعلق وبے نیاز ہوجاتا ہے تو وہ فتنوں میں گھر جاتا ہے۔ اور مصائب وآزمائشوں کا اس کو سامنا کرنا پڑتا ہے۔ (صفحہ ۶۴۶)

تشریح

تجربہ ومشاہدہ کی بات ہے کہ جو ادارہ، جو جماعت اور جو مدرسہ، اہل اللہ سے بے نیاز اور صرف نظری کا مظاہرہ کرتا ہے، اس ادارہ کے ذمہ دار اور اس سے وابستہ افراد باطنی بیماریوں کے ادراک سے قاصر ہوتے ہیں، اس کی وجہ سے وہ بے شمار داخلی مسائل ومشکلات کا شکار ہوکر، باہم دست وگریباں رہتے ہیں، صبر وحکمت وبصیرت جیسے اوصاف سے محروم رہتے ہیں یا کم از کم ایک دوسرے کے لئے محبت اور خیر سگالی کے جذبات سے عاری ہوتے ہیں۔

اس طرح کے ادارے اور جماعتیں بظاہر چاہے کتنے ہی مالی وسائل سے مالا ومال ہوں اور ظاہری تنظیم بھی کتنی ہی مستحکم ہو، لیکن دلوں میں ایک دوسرے سے کدورت کی وجہ سے وہ خیر وبرکت سے ہمکنار ہوں، مشکل تر ہے، اس لئے کہ اللہ کی سنت یہی ہے کہ تزکیہ اور تہذیب نفس کے مراحل سے گذرے بغیر نفسی خرابیوں سے بچاؤ اور حکمت وفراست کی استعداد عطا نہیں ہوتی، تزکیہ اور تہذیب نفس کا عمل اپنے دل کو اہل اللہ کے دل سے متصل

کئے بغیر نہیں ہوتا، یہ امت کا تسلسل ہے، امت کے اس تسلسل کی خلاف ورزی کی وجہ سے ادارے اور جماعتیں امت کو کچھ دے سکیں، یہ تو دور کی بات ہے، وہ اپنے ساتھ وابستہ افراد کو اپنی نفسی خرابیوں کے مضمرات سے بچا سکیں، دشوار تر ہے۔"

فرمایا: سلف سے حسن ظن اور موجودہ بزرگوں سے خوشنودی سے انابت اور دعاؤں میں تضرع پیدا ہوتا ہے اور برکت ہوتی ہے، اس کے برخلاف ان سے سوء ظن اور ان کے عدم احترام سے پوری زندگی پر اثر پڑتا ہے۔ نہ تزکیہ قلب کی توفیق ہوتی ہے، نہ انابت واخبات حاصل ہوتا ہے اور نہ دعاؤں میں تضرع پیدا ہوتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ برکت پوری طرح ختم ہوجاتی ہے، کسی چیز میں برکت نہیں رہتی اور بہت ڈرنے کی بات ہے۔ کبھی تو ایمان سلب ہوجاتا ہے۔ (صفحہ ۵۸۳)

مذکورہ ملفوظ کی توضیح میں فرمایا: آج ایک جماعت اسی کام میں لگی ہوئی ہے، اس کا کام ہی سلف کے کارناموں پر پانی پھیرنا اور ان سے بدظن کرنا ہے۔ (صفحہ ۵۸۴)

عرب ممالک میں دعوتی کام کی ضرورت

مولانا علی میاں عالم عرب میں دعوتی کام کی ضرورت پر غیر معمولی زور دیتے ہیں۔ انہوں نے مختلف ملفوظات میں طلبہ کو اس طرف توجہ دلائی ہے۔ اس کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ اخبارات، میڈیا اور لٹریچر نے ایک عرصہ سے عالم عرب کے ذہین اور متوسط طبقات کو مغربی فکر، سیکولرزم اور تہذیب جدید کا اسیر بنایا ہے۔ اور عالم عرب کے علم ودانش کے مرکزوں پر عرصہ سے جدیدیت کے حامل دانشوروں، ادیبوں اور مفکروں کا قبضہ رہا ہے۔ لٹریچر اور میڈیا پر ان کی اس اجارہ داری کا سید قطب اور اخوان المسلموں کے ادیبوں ودانشوروں نے ایک حد تک توڑ کرنے کی کاوش کی، لیکن اخوان المسلموں کو ہر دور میں سازش کے ذریعہ کچلنے کی کاوش ہوئی اور اسے کام کرنے نہیں دیا گیا۔

عالم عرب میں دعوتی کام کی ضرورت اس لئے بھی ہے کہ وہاں برصغیر ہند کے مقابلہ میں تصوف کی شخصیتوں کا فقدان رہا، بلکہ تصوف واہل تصوف سے ذہنی طور پر دوری

کی فضا غالب رہی، اس کی وجہ سے معاشرہ میں اخلاقی وروحانی تربیت کی بہتر اور مؤثر صورت پیدا نہ ہوسکی۔

عرب کے متوسط طبقات میں علمی مذاق اور مطالعہ کا ذوق ضرور رہا، لیکن دل اور روح کی تسکین کی فکر کم ہے، اس لئے وہاں مادی تہذیب کے اثرات غیر معمولی طور غالب ہیں۔ دولت وسرمایہ کی کثرت کی وجہ سے وہاں مغربی طرز کی معاشرت اور زندگی کو خوبصورت سے خوبصورت اور لذیذ سے لذیذ تر بنانے کی فکر عام ہوئی۔

عالم عرب میں پڑھے لکھے طبقوں میں مولانا علی میاں اور مولانا مودودی کی فکر کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ لیکن جدیدیت کی طوفان خیزی اور طاقتور میڈیا کے پیدا کردہ منفی اثرات کے مقابلہ کے سلسلہ میں ان دو مفکروں کا کام ظاہر ہے، زیادہ نتیجہ خیز ہو، مشکل ہے۔ اس کے لئے مسلسل فکری، علمی، دعوتی اور تربیتی کام کی ضرورت ہے۔

یہ خوشی کی بات ہے کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے فاضلوں نے عربی زبان میں کام پر خصوصی توجہ دی ہے، لکھنو سے عربی زبان میں پندرہ روزہ ''تعمیر حیات'' عرصہ سے نکل رہا ہے، جو پاکستان سے نکلنے والے سارے مذہبی رسالوں سے منفرد نوعیت کا رسالہ ہے، جس میں دور جدید کے مسائل میں امت کی رہنمائی جیسے مضامین شایع ہوتے ہیں۔

مولانا علی میاں کے تیار کردہ شاگرد عالم عرب کے اخبارات ورسائل میں بھی مستقل لکھتے رہتے ہیں، اور ان کی عربی تصنیفات بھی مستقلا شایع ہوتی رہتی ہیں، یہ کتابیں ہمارے طرح کی روایتی کتابیں نہیں ہوتی، بلکہ خالص علمی، فکری ونظریاتی نوعیت کی کتابیں ہوتی ہیں۔''

''تقریبا پچیس روز کے بعد حضرت (مولانا علی میاں) آج اردن کے سفر سے واپس تشریف لائے تھے، سفر اصل میں اردن ہی کا تھا، حرمین میں بھی واپسی میں چند روز قیام رہا، پھر بمبئی میں کچھ دن رک کر لکھنؤ واپس تشریف لائے۔

آج کی مجلس میں اس سفر کے تاثرات بیان کرتے ہوئے فرمایا: اب کے سفر میں دو چیزوں کا بڑی شدت سے احساس ہوا: ایک یہ کہ عرب ممالک میں دعوتی کام کرنے کی بڑی ضرورت ہے، عربی اسی نیت سے پڑھنی چاہیے اور اس پر ایسا عبور ہونا چاہیے کہ

عربوں کو خطاب کرسکیں اور جھنجھوڑ سکیں، عربوں میں بہت سی کمزوریوں کے باوجود اتنی شرافت اب تک ہے کہ وہ بات کو غور سے سنتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ ہمارے ہندوستان کے مدارس اور علماء ومشائخ کی قدر آئی، جن کی وجہ سے الحمدللہ آج بھی ایک حد تک یہاں دین کی قدر ہے، اور اس پر عمل ہوتا ہے، حضرت تھانویؒ، حضرت مولانا الیاس صاحبؒ اور بہت سے علمائے ربانیین اور مشائخ، عرب ممالک میں اس کی بڑی کمی ہے، علم وادب تو ہے، مگر جن کو علمائے ربانیین کہتے ہیں ان کی تعداد بہت کم ہے، عوام پر علماء کی گرفت نہیں، بے پردگی عام ہے، مسجدوں میں ستر اسی فیصد ننگے سر نظر آتے ہیں، سعودی عرب پھر بھی غنیمت ہے، اس کو ہم انشاء اللہ لکھیں گے۔ (صفحہ ۱۹۷)

فرمایا: آج ہمارے مدارس میں اس کی بڑی کمی ہے، حالات حاضر اور جدید سے واقفیت بالکل نہیں ہے۔ الحمدللہ یہاں دارالعلوم میں ہم، مولانا مسعود عالم، مولانا ناظم صاحب ادب ہی پر گفتگو کرتے، یہی ہمارا موضوعِ سخن تھا، ہندوستانی سے زیادہ عرب ادباء سے متعلق گفتگو ہوتی، دارالعلوم کی تعلیم اور پھر اس صحبت کا بڑا فائدہ ہوا۔ ہمارے طلبہ وفضلاء کو اس کی بڑی ضرورت ہے کہ عالم عربی کے ادب سے، اس کے طبقاتِ رجال سے واقفیت ہو، ان کے نظریات، رجحانات، ان کے ذوق اور اسلوب کا علم ہو، اور وہاں ان کے بارے میں عام تاثر کیا ہے، اس سے آگاہی ضروری ہے، اگرچہ ان سے اتفاق نہ ہو، مگر واقفیت ضرور ہو۔ دعوت میں اس سے بڑی مدد ملتی ہے، کسی معمولی آدمی کی زیادہ تعریف کی یا کسی بڑے شخص کی معمولی تعریف کی تو سب پر پانی پھر جائے گا اور بات کا کوئی وزن نہیں رہے گا، آج مدارس میں اس کی کمی ہے۔ (صفحہ ۱۹۸)

عرب ممالک میں دینی حمیت کی کمی

دریافت کیا گیا کہ عرب ممالک میں دینی حمیت اور غیرت کی کمی کی کیا وجہ ہے؟

فرمایا: ایک تو یہ کہ وہاں تزکیہ اور سلوک کا وہ طریقہ نہیں رہا، جو یہاں تھا، یعنی تصوف کے سلاسل نہیں رہے، جن کا عوام پر ایک اثر تھا، جو ان میں دینی غیرت اور اخلاقی

بلندی اور شریعت کا احترام پیدا کرتے تھے، ایک تو اس چیز کی کمی، دوسرے مغربی تہذیب کا اثر، مغربی مفکرین نے بڑی دانشمندی کے ساتھ عرب ممالک پر اپنا اثر ڈالا، انہوں نے صحیح سوچا کہ جب عرب ممالک دین سے دور ہوں گے تو سارے مسلمانوں کا دین سے رشتہ کمزور ہوجائے گا، پھر یہاں جیسی آزادی کی تحریکات اٹھیں، جس سے عام پیمانے پر مغربی تہذیب سے نفرت پیدا ہوگئی تھی، سرِ بازار ولایتی کپڑوں کو جمع کرکے آگ لگادی جاتی تھی، اور ان کی چیزوں کو روند دیا جاتا تھا، پھر وہ واقعہ سنایا، اپنے کسی رشتہ دار کا کہ ان کو کوئی تمغہ ملا تھا، مگر انگریزوں کی نفرت میں جس کو وہ پیروں سے روندتے تھے، عرب ممالک میں ایسی کوئی تحریک نہیں پیدا ہوئی، جس سے مغربی تہذیب سے جذباتی طور پر نفرت ہوجاتی، آزادی کی تحریک کا ایک بڑا فائدہ یہاں یہ بھی ہوا کہ مغربی تہذیب سے طبعی طور پر نفرت ہوگئی! (صفحہ ۶۹۸)

پڑھی ہوئی چیز بیکار نہیں جاتی

آدمی بہت سی چیزیں پڑھتا ہے، لیکن کچھ یاد نہیں رہتا، اکثر لوگوں کو اس کی شکایت ہوتی ہے، اس پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا: کوئی بھی مطالعہ ضائع نہیں جاتا، آدمی سمجھتا ہے کہ کچھ فائدہ نہیں ہوا، لیکن دراصل بڑا فائدہ ہوتا ہے، وہ چیز ذہن کے کسی خانے میں جمع ہوتی ہے اور موقع پر یاد آجاتی ہے، اس وقت آپ کو تعجب ہوتا ہے اور پڑھی ہوئی چیز کی قدر آتی ہے، مطالعہ ذہن کو غذا پہنچاتا ہے، بلکہ اس میں خون پیدا کرتا ہے، چاہے ایک حرف یاد نہ ہو، جس طرح غذا سے خون بنتا ہے، چاہے اس کا احساس نہ ہو، اسی طرح مطالعے سے بھی خون بنتا ہے، پھر مکرر فرمایا: ہم ایک نفسیاتی بات بتارہے ہیں کہ ہر مطالعے کا فائدہ ہوتا ہے، کوئی پڑھی ہوئی چیز بیکار نہیں ہوتی، ذہن بھی بسا اوقات چوری کر لیتا ہے اور چھپا کر رکھتا ہے، موقع پر نکال دیتا ہے۔

امیر البیان شکیب ارسلان نے لکھا ہے: **من قرا شیئا فقد استرقه، فقد استحقه** ۔(۱) (جس نے کوئی چیز پڑھ لی تو اس نے اس کو اپنا غلام بنالیا تو وہ اس کا مستحق ہوگیا)۔

ہم نے پہلے بہت سی چیزیں پڑھیں، جب ''ماذا خسر'' لکھنے بیٹھے تو ذہن سے چیزیں امنڈنے لگیں۔ (صفحہ ۶۹۹)

مطالعہ کے سلسلہ میں مولانا کا یہ تجربہ بالکل صحیح ہے کہ مطالعہ ضایع نہیں ہوتا، مطالعہ کے نتیجہ میں حاصل ہونے والے نکات ذہن میں ذخیرہ کی صورت میں موجود ہوتے ہیں۔ مطالعہ ہر صورت میں کارگر ہوتا ہے، اس لئے مطالعہ کے لئے صبر واستقامت کی ضرورت ہوتی ہے۔ شروع میں فرد کو یہ شکایت رہتی ہے کہ وہ جو کچھ پڑھتا ہے وہ بھول جاتا ہے۔ لیکن جب مطالعہ میں وسعت اور تنوع ہونے لگتا ہے تو ذہن میں اخذ مطالعہ کی صلاحیت بڑھنے لگتی ہے۔

تنقید میں تنقیص کے نقصانات

مولانا کا بیان کردہ یہ نکتہ بہت اہم ہے کہ تنقید کے وقت مخالف کی تنقیص سے احتراز کرنا چاہئے، تنقید میں (وہ چاہے اپنے دشمن کے خلاف ہی ہو) اس میں سنجیدگی، نرمی اور شائستگی ہونا ضروری ہے، دوسری صورت میں تنقید میں جذباتیت سے مخالفوں کی نفسیات میں اشتعال پیدا کئے بغیر بات سننے کا ماحول پیدا ہونا دشوار ہوتا ہے۔

جب غیروں کے ساتھ تنقید میں اس اصول کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے تو اپنوں کے خلاف تنقید کرتے وقت تو بے جا سختی، شخصیت کے وقار کو مجروح کرنا، دل آزاری سے کام لینا، یہ تو انہیں مزید دور کرنے کی روش ہے۔

اس سلسلہ میں مولانا کا ایک ملفوظ پیش کیا جاتا ہے۔

فرمایا: جب ہم نے قادیانیت پر کتاب لکھی تو اس میں جذباتیت والا طریقہ اختیار نہیں کیا، ایک سنجیدہ طرز اپنایا، مولانا امین احسن اصلاحی صاحب (تدبر قرآن کے مصنف جو اس وقت ایک پرچہ نکالتے تھے) نے لکھا کہ مولانا کو جہاں غصہ آنا چاہئے، وہاں بھی غصہ نہیں آتا، فرمایا، دراصل جذباتیت اور غصہ سے (بات کی) اہمیت کم ہوجاتی ہے اور استدلال کمزور پڑجاتا ہے۔ (صفحہ ۵۱۲)

ہدایت کے لئے متفکر ہونا

فرد کو راہ ہدایت پر گامزن ہونے اور بھٹکنے سے بچنے کے لئے اللہ کی دربار میں التجا

کرتے رہنا چاہئے اور اس سلسلہ میں سب سے زیادہ خائف ہونا چاہئے، اس لئے کہ ہدایت، اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ تکبر سے یا دوسرے گناہان کبیرہ سے ہدایت سے دوری اور گمراہ تحریکوں کے نذر ہوجانے یا نفس کے حوالے کردینے کی سزا مل سکتی ہے۔ اور زندگی بھر حق وصداقت سے محرومی کا خطرہ پیدا ہوسکتا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک اہم بات جو فرد کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے، وہ ہے وہ اپنے دور کے گمراہ فرقوں اور اجماع امت کی مخالف تحریکوں اور شخصیتوں کی فکر کا تجزیاتی مطالعہ کرنا ضروری ہے، تاکہ زندگی کے کسی بھی موڑ پر اگر اس طرح کے فرقوں اور تحریکوں سے واسطہ پیدا ہو تو فرد خالی ذہن نہ ہو، ان فرقوں کے دلائل اور ان کے غلط ہونے کا انہیں پورا ادراک حاصل ہو، ورنہ ذہین سے ذہین فرد کے لئے ان فرقوں کے جال میں پھنسنے سے بچنا مشکل ہے، اور ان کے لئے خطرہ ہی خطرہ ہے۔ مولانا نے مختلف ملفوظات میں اس طرف توجہ دلائی ہے۔ یہاں صرف ایک ملفوظ پیش کرنے پر اکتفا کی جاتی ہے۔

''ہمارے فضلا اور اونچے درجہ کے طلبہ کو قادیانیت سے پوری طرح واقف رہنا چاہئے، کہیں بھی واسطہ پڑسکتا ہے، تعجب آمیز انداز میں فرمایا، حیرت ہوتی ہے محمد علی لاہوری جیسا شخص جس نے ''سیرت خیر البشر'' جیسی کتاب لکھی، اور حکیم نور الدین جیسا صاحب علم بھی قادیانیت سے متاثر ہوا اور اس کے جال میں پھنسا تو ہدایت صرف اور صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جب چاہے چھین سکتا ہے۔ کوئی کچھ نہیں کرسکتا۔ اس لئے ہر وقت اپنے ایمان کی فکر کرنا چاہئے۔

اللھم اھدنی فیمن ھدیت وعافنی فیمن عافیت. (صفحہ۴۸۹)

توجہ کے ذریعہ تسخیر کی کاوش

ایک ملفوظ میں ''توجہ'' کا ذکر بھی ہے کہ ہم گاندھی کے جانشین ونوبھاوبے سے ہندو اور مسلمانوں کے درمیاں بڑھنے والی خلیج کو کم کرنے کی غرض سے ملاقات کے لئے گئے انہوں نے تو سنجیدگی سے بات سننے کی بجائے اپنے پورے یوگ کے ساتھ ہمارے قلب پر توجہ کی، اس پر ہم نے درود شریف پڑھنا شروع کیا، اس طرح ان کی

توجہ بے اثر رہی۔ (صفحہ۴۹۴)

ہمارے ہاں بھی بعض بزرگ ایسے ہیں، جو توجہ کے ذریعہ باصلاحیت افراد کو مسحور کرتے ہیں، پھر جب وہ متاثر ہوکر قریب آتے ہیں تو دوچار ملاقاتوں میں ہی انہیں خلافت کی مسند پر فائز فرماتے ہیں، اس طرح اپنے حلقۂ مریدوں میں توسیع کے لئے کوشاں ہوتے ہیں، ہمارے ہاں عام طور پر بڑے بڑے ذہین اور پڑھے لکھے لوگوں کو یہ معلوم ہی نہیں ہے کہ توجہ کی صلاحیت ایک نفسیاتی نوعیت کا عمل ہے، جو مشقوں سے غیر مسلموں، بلکہ ملحد عاملوں اور نفساتی ماہروں تک کو بھی حاصل ہوجاتی ہے۔ توجہ کا بزرگی سے کوئی تعلق نہیں ہے، بزرگوں کے ہاں تو اصل چیز طالبوں کی روحانی، اخلاقی اور ذہنی تربیت ہوتی ہے، تاکہ وہ سراپا اسلامی شریعت کے خادم بن جائیں۔

ادب واحترام کے بغیر ذہانت کا گمراہی وبربادی کا باعث ہونا

مولانا علی میاں نے مختلف ملفوظات میں یہ نکتہ بھی بیان فرمایا ہے کہ اساتذہ، بزرگوں اور اہل اللہ کے ادب واحترام کے بغیر محض ذہانت گمراہی اور بربادی کا باعث بن جاتی ہے، اس لئے کہ ذہانت کا حامل فرد ادب وآداب سے بے نیازی اور گستاخانہ مزاج کی وجہ سے اساتذہ اور بزرگوں کے فیوض وبرکات کے استفادہ سے محروم رہتا ہے۔

ملفوظ کے الفاظ یہ ہیں۔

''ندوے میں جب دوسری دفعہ اسٹرائک ہوئی تھی تو اس میں ایک انتہائی ذہین طالب علم نے حصہ لیا تھا، بلکہ اس کی قیادت کی تھی، مولانا سید سلیمان ندویؒ اس وقت معتمد تعلیم تھے، اس طالب نے سید صاحب کے بارے میں کہا کہ ان کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس طالب علم کا دماغ خراب ہوگیا اور وہ پاگل ہوگیا، اور اس کی حالت یہاں تک پہنچی کہ اس کے گھر والوں نے اس کو رسیوں سے باندھ دیا، میں جب اس کو دیکھنے کے لئے گیا تو رسیوں میں بندھا ہوا دیکھکر آنکھ میں آنسو آگئے۔ پھر سید صاحب کی دعا سے وہ اچھا ہوگیا۔

اس واقعہ کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا: ذہین طلبہ ایسے معاملات میں پیش پیش ہوتے

ہیں۔محض ذہانت کچھ کام نہیں دیتی، جب تک اس کے ساتھ ادب واحترام نہ ہو، ہزاروں ذہین ضایع ہوگئے اور زیادہ ذہانت گمراہی کا سبب بنتی ہے، بلکہ مضل ہوتی ہے۔ تاریخ پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ اسلام میں جتنے فرق ضالہ (گمراہ فرقے) پیدا ہوئے ہیں، ان کے بانی اکثر انتہائی ذہین تھے۔مگر لگتا ہے کہ جوانی میں ان سے کوئی ایسی غلطی ہوئی تھی جس کی وجہ سے ان کو سزا ملی تو کتاب وسنت کی عظمت، شریعت کا احترام اور اساتذہ وبزرگوں کا ادب یہ سب سے مقدم ہے، اس کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ (۶۰۶)

دراصل ذہانت اور علم کی مسند اکثر اپنے ساتھ غیرمعمولی خود اعتمادی، خودنمائی، جذباتِ سرکشی، بزرگوں کی بزرگی کی نفی، دعویٰ اور علمی زعم لاتی ہے، ان جذبات واحساسات کی تہذیب کے بغیر علم وذہانت نافع نہیں ہوسکتی، بلکہ ایسے صاحبانِ ذہانت اور صاحبانِ علم معاشرہ میں نئی دعوتوں اور نئے گروہوں کو جنم دے کر ملت کی کمزوری کا ذریعہ ثابت ہوتے ہیں۔

ذہانت اور علم کے صاحبان کے لئے سلامتی کی ایک ہی راہ ہے کہ وہ معاشرہ میں چھوٹا بن کر رہنے کا سلیقہ سیکھیں، اساتذہ واہل اللہ کے آداب بجالائیں، ان کی رائے کے مقابلہ میں اپنی رائے کو غیراہم سمجھیں، موت تک سیکھنے اور سمجھنے کا دروازہ بند نہ کریں اور خوداحتسابی سے کام لیتے رہیں، ان چیزوں سے کام لینے کے نتیجہ میں صاحبانِ علم وذہانت کے حامل افراد اپنے علم اور اپنی ذہانت سے معاشرہ کے لئے غیرمعمولی نفع رسانی کا ذریعہ بن جائیں گے۔ **(ماخوذ ''بیداری'' جولائی ۲۰۱۵ء)**

موجودہ دور میں تصوف کا کردار

محبت آمیز تنقیدی نظر

زیرنظر مضمون ابتدا میں تین چار صفحات کا تھا، جو اپنے نفس کو انتباہ دینے کے لئے لکھا گیا تھا، اس سے مقصود یہ تھا کہ نفس کو یاد دہانی کرائی جائے کہ یہ بیماریاں دورنِ خانہ تمہارے اندر موجود ہیں۔ اس لئے فرد کو ہوشیار اور چوکنا رہنا چاہے۔ چنانچہ مضمون کا عنوان ''نفس شناسی کی کچھ اہم چیزیں، نفس کے آئینہ میں'' رکھا گیا تھا، لیکن بعد میں مضمون میں کافی اضافہ ہوتا گیا، اب یہ نئے عنوان کے ساتھ شائع ہورہا ہے۔

موجودہ دور میں جہاں زندگی کے سارے شعبے مادیت کی عالمگیر لہر کی لپیٹ میں ہیں، وہاں تصوف کا ادارہ بھی اس کی زد میں ہے، لیکن اس کے باوجود تصوف واہل تصوف، افراد کی اصلاح کے سلسلہ میں جو کردار ادا کررہے ہیں، وہ قابل قدر ہے اور وہ سب سے زیادہ اہم کردار ہے، اس سلسلہ میں تصوف کی وہ شخصیتیں جو صاحب فقر وصاحب زہد ہیں، اللہ کی مخلوق کے استفادہ کے لئے لگ بھگ ہر وقت اپنی دستیاب رہتی ہیں، یہی شخصیتیں ہمارے لئے سرمایہ افتخار ہیں۔

ان شخصیتوں میں اس عاجز کی نظر میں حضرت مولانا عبدالحی صاحب مانسرہ والے، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب (مانسرہ کے) پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب (ایبٹ آباد) حضرت پروفیسر وجیہ الدین صاحب (لاہور) وغیرہ شامل ہیں، اس طرح کی دیگر شخصیتیں بھی ملک میں موجود ہوں گی، لیکن اس عاجز کو ان سے ذاتی طور پر شناسائی نہیں ہے۔

صاحبان تصوف کی جو نمایاں وامتیازی خصوصیات، جو صدیوں سے ان میں موجود رہی ہیں، وہ ان کا استغنا، فقر اور دنیا سے بے نیازی اور اللہ کے

بندوں کی اصلاح کے لئے ان سے رابطہ کے لئے ہر وقت ان کی دستیابی ہے، یہ دوخصوصیات صاحبانِ تصوف کی ایسی رہی ہیں، جس میں معاشرہ کا کوئی طبقہ ان کا ثانی نہ رہا ہے، ان کی ساری زندگی اور جدوجہد کا ہدف ہی یہی رہا ہے کہ اللہ کی مخلوق پر اپنے کردار سے یہ بات واضح کی جائے اور انہیں یہ پیام دیا جائے کہ دنیا میں رہتے ہوئے بھی دنیا واہل دنیا سے بے نیازی اور فقر کے ساتھ زندگی کیسے گذاری جاتی ہے۔ دوم اللہ کی مخلوق کی اصلاح وتربیت کا بے پناہ غم ودرد اور ان کے کام آنے کی ادا ہے۔

اہل اللہ کی یہ دوخصوصیات ایسی ہے، جو انہیں سب سے زیادہ عزیز بھی رہی ہیں اور وہ اس راہ میں کسی مصلحت اور کسی مصروفیت کو حائل ہونے نہیں دیتے، اس لئے کہ قرآن میں اللہ کے رسول ﷺ سے فرمایا جارہا ہے۔ وصبر نفسک مع الذین یدعون ربھم بالغدوی والعشی (اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ بیٹھنے کا پابند بنایئے، جو صبح وشام اللہ پکارتے رہتے ہیں)۔

ہم نے جن بزرگوں کو دیکھا ہے یا ہمارے بچپن میں جو بزرگ موجود رہے ہیں، جو اخلاق حسنہ، زہد وفقر میں ممتاز تھے اور جنہوں نے لوگوں کو ہر وقت فیض رسانی کے سلسلہ میں اپنے آپ کو وقف کیا ہوا تھا، ان میں حضرت مولانا حماد اللہ ھالیجویؒ، حضرت مولانا خان محمدؒ، حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰؒ، حضرت مولانا عبدالکریم بیر والے نمایاں ہیں۔ لیکن بڑے افسوس اور دکھ کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ معاشرہ میں اب اس طرح کی شخصیتیں کمیاب ہیں، اگر موجود ہیں تو گمنام ہیں اور معاشرہ میں بزرگ کی حیثیت سے ان کا تعارف یا ان کی طرف رجوع نہ ہونے کے برابر ہے۔

پاکستان میں ویسے بھی مادیت کے مسموم اثرات زیادہ ہیں۔ صاحبان تصوف کی طرف سے اللہ کی مخلوق سے دوری کی روش اور فقر سے تہی دستی کی وجہ سے تصوف واہل تصوف کا رہا سہا بھرم بھی متاثر ہے، البتہ ہندستان میں لوگوں کے مزاج میں سلامتی موجود ہے اور اصلاح کی طلب موجود ہے، اس لئے وہاں اصلاحی نوعیت کے جلسوں میں دو، دو تین، تین لاکھ افراد شریک

ہوتے ہیں۔ ہندستان کے مقابلہ میں پاکستان اس اعتبار سے بہت زیادہ حالت زوال میں ہے۔

اہل اللہ کی طرف سے جب کسی کو خلافت ملتی ہے تو اس خلافت کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ اب یہ شخصیت دوسروں کی تربیت کے مقام پر فائز ہوگئی ہے، اب اس کا بیشتر وقت دوسروں کی تربیت واصلاح کے کاموں میں صرف ہوگا۔ اب اسے راہ محبت کے طالبوں کو اپنی صحبت سے فیضیاب کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ وقت دینا ہوگا۔ خلافت ایک امانت ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اب اس امانت کا حامل فرد مریدوں سے دنیاوی مفادات ہرگز وابستہ نہ کرے گا اور انہیں دولت کے حصول کا ذریعہ ہرگز نہ بنائے گا۔ خلافت کی مسند عطا ہونے میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اب یہ شخصیت دینی، اخلاقی اور روحانی اعتبار سے اس قابل ہوگئی ہے کہ فقر، زہد اور اخلاق حسنہ سے مزین ہوگئی ہے۔ اس شخصیت سے معاشرہ کو محبت، رواداری، خیر اور دولت ودنیا کو بے وقعت سمجھنے کی ادائیں ہی ملیں گی اور معاشرہ میں ان اداؤں اور خصوصیات کو فروغ حاصل ہوگا۔

اگر صاحبانِ خلافت شخصیتوں میں یہ خصوصیات وادائیں قابل ذکر حد تک موجود نہیں ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ شخصیتیں آتش عشق میں جل کر پختہ ہونے سے پہلے ہی بھٹی سے نکالی گئی ہیں، ایسی شخصیتوں پر مضبوط عمارتوں کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی، بالکل اس طرح، جس طرح خام اینٹوں پر مستحکم عمارتوں کی بنیاد رکھنا سراسر خطرہ ہی خطرہ ہے۔

ہمارے ہاں صدیوں سے بزرگوں کے ہاں تہذیب نفس اور تزکیہ نفس کے لئے افراد سے ذکر وفکر کے غیر معمولی مجاہدے کرائے جاتے تھے۔ ان مجاہدوں کا دورانیہ بعض اوقات پچیس پچیس تیس تیس سال تک کا ہوتا تھا، البتہ فطرت سلیمہ کے حامل افراد کا دس بارہ سال کے مجاہدوں ہی سے کام ہوجاتا تھا۔ نفس کی وسیع تر دنیا میں داخل ہوکر، مجاہدوں کے ذریعہ اس کی مکر وفریب اور عیاریوں کی واردات سے آشنائی اور ان پر ضابطہ کے بغیر بزرگوں کے

ہاں خلافت عطا فرمانے کا تصور بھی نہیں تھا۔

آج سے سو سال پہلے تک حالت یہ تھی کہ بزرگ کی ساری زندگی کی جدوجہد سے دوچار پانچ افراد ہی باقائدہ سلوک طے کرکے دوسروں کی تربیت کے مقام پر فائز ہوتے تھے۔ حافظ محمد صدیق بھر چونڈیؒ سندھ کے بڑے بزرگ گذرے ہیں۔ ان کے کل دو خلفا تھے، ایک مولانا تاج محمود امروٹیؒ دوسرے حضرت غلام محمد دین پوریؒ، ان دونوں خلفا کا معاشرہ پر ایسا اثر تھا کہ لاکھوں افراد دور دراز سے آکر اصلاح کے لئے ان سے رجوع ہوتے تھے، ایسی شخصیتوں کی وجہ سے ہی معاشرہ میں خیر کے اثرات کافی حد تک موجود تھے، لیکن اب ایک ایک بزرگ کے سیکڑوں خلفاء موجود ہیں، لیکن معاشرہ پر ان کا اثر نہ ہونے کے برابر ہے اور زندگی میں تبدیلی کی صورت پیدا ہونے کے آثار ہی کم نظر آتے ہیں، اس کے دوسرے اسباب کے علاوہ ایک بنیادی سبب غیرمعمولی مجاہدوں کے بغیر ہی خلافت عطا فرمانے کی روش بھی ہے۔

اگرچہ یہ عاجز خود اصلاح نفس کے اعتبار سے قابل رحم حالت میں ہے، تاہم اللہ کا ایک فضل خاص یہ رہا کہ ۱۷ سال تک ایک ایسے بزرگ کی مسلسل صحبت حاصل رہی، جو فنائیت، فقر اور اخلاق حسنہ کے بلند مقام پر فائز تھا، ان کی اداؤں کو دیکھ دیکھ کر سیکھنے کا کچھ موقعہ ملا، پھر ان بزرگ کی خصوصی توجہات سے عرصہ تک راہ سلوک میں چلتے رہنے کا موقعہ ملا، ان کے وصال کے بعد بھی چار سال تک چلنے کا موقعہ ملا، جس سے پوری طرح اصلاح تو نہیں ہوسکی، لیکن نفس کی خوفناک قوتوں اور اس کے مکر وفریب کی ہولناک واردات کا ادراک ضرور حاصل ہوا، اس سلسلہ میں ہماری تحریروں یعنی تصوف کی توضیح وتشریح، اصلاح نفس کے معاملات اور بزرگانِ دین کی کتابوں کی ازسرنو تدوین وانتخاب پر ہماری بیس سے زائد کتابیں، یہ سب دراصل اس اہل اللہ کی ۱۷ سال تک کی صحبت ہی کا نتیجہ واثر ہے (یہ شخصیت حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان علیہ الرحمتہ کی تھی)۔

موجودہ دور ایسا ہے، جس میں زمانہ، اہل تصوف کی ایک ایک ادا پر تیز نگاہ رکھتا ہے۔ انہیں جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں بھی ایسی شخصیتیں موجود ہیں، جو دولت کے حصول کے سارے امکانات کے باوجود دولت کو ٹھکرائے ہوئے ہیں اور ان کے دلوں میں مال ودولت کی کوئی وقعت موجود نہیں، تو وہ ایسی شخصیتوں کے سامنے دل سے خود سپردگی اختیار کرنے پر تیار ہیں۔

ایک اہم نکتہ جو مال ودولت کے حصول کی کاوشوں کے حامل اہل تصوف کے لئے قابل غور ہے، وہ یہ ہے کہ اہل اللہ کی جس ادا نے وقت کے فرعونوں اور بادشاہوں کو ان کے سامنے جھکنے پر مجبور کیا ہے، وہ ان کی فقر محمدی کی دولت عظمیٰ ہی ہے۔ تصوف سے فقر محمدی کو نکالنے کے بعد تصوف میں رہتا ہی کیا ہے۔

موجودہ دور میں عام طور پر ہر شخص کی جدوجہد کا محور ومرکز دولت کا حصول ہی ہے۔ ہر شخص مجنون وار ہوکر، اپنی ساری توانائیاں اسی دولت کے حصول میں ہی خرچ کررہا ہے۔ اگر اہل تصوف بھی اس معاملہ میں ان کے مثل ہوجائیں اور وہ تصوف کو دولت کے حصول اور اپنے کاروبار میں اضافہ کا ذریعہ بنائیں تو پھر آخر عام دنیادار فرد اور اہل تصوف کے درمیاں جوہری فرق ہی کیا باقی رہا؟

یہاں ایک اہم سوال یہ ہے کہ آخر موجود دور کے تصوف کے بیشتر صاحبان کے ہاں دولت کی ریل پیل اور بنگلوں اور گاڑیوں کے تزین کا اتنا اہتمام اور ایسی دوڑ کیوں ہے؟

ہماری نظر میں اس کا ایک اہم سبب حقیقی اہل اللہ کی طویل عرصہ کی مسلسل صحبت کا غیرمعمولی فقدان اور ذکر وفکر کے صبر آزما مجاہدوں کی کمی ہے۔

طویل عرصہ کی صحبتِ اہل اللہ اور ذکر وفکر کے غیرمعمولی مجاہدے یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں۔ جو نفسی قوتوں کو مطیع کرکے، دل سے غیر اللہ کی

محبت، غیر اللہ کی مرعوبیت اور خوف وخطر کو ختم کر کے، فرد میں دولت ودنیا سے بے نیازی کے ملکہ کو راسخ کرتے ہیں اور دنیا کی خوبصورتی وتزین کے ان کے احساسات کو پامال کردیتے ہیں۔

جب صحبت اہل اللہ اور ذکر وفکر کی یہ دونوں سعادتیں حاصل ہوتی ہیں تو اس کے بعد اس بات کا امکان بہت کم ہوتا ہے کہ فرد مال ودولت یا مالداروں سے رابطے وتعلقات اور ان سے قرب کے لئے متفکر اور کوشاں رہے۔ اس صورت میں فقیرانہ زندگی اور زہد عادت ثانیہ بن جاتا ہے اور فرد کے پاس نہ چاہنے کے باوجود وسائل آتے بھی ہیں تو ان وسائل کو وہ شاہانہ ٹھاٹھ کے لئے استعمال ہرگز نہیں کرتا، بلکہ وہ ان وسائل کو یا تو خدمت دین کے کاموں میں استعمال کرتا ہے یا اللہ کی غریب مخلوق کی مدد میں خرچ کرتا ہے۔

آج ہمارا معاشرہ شدید اضطراب اور افراتفری سے دوچار ہے، ایمان ویقین کی کمی، مہنگائی کے دباؤ، تعلیم وتربیت کے اداروں کی تباہی، باطنی بیماریوں کی شدت، حب جاہ وحب مال اور اشتعال کی نفسیات نے لگ بھگ ہر گھر کے سکون کو غارت کردیا ہے۔ شادیاں ہیں کہ ناکامی سے دوچار ہیں۔ نئی نسل کو انٹرنیٹ اور موبائل کے دیو نے اس قدر قابو کر لیا ہے کہ اس کی نفسیات اور مزاج پر یہ دیو حاوی ہوگیا ہے اور اس نے اس سے شرم، حیا، عفت اور پاکیزہ احساسات کی دولت چھین کر اسے حیوانی جذبات سے سرشار کردیا ہے، معاشرے کے سارے مؤثر طبقات اہل سیاست، تاجر، ڈاکٹر، وکیل، ٹیکنیکل ماہرین وغیرہ ان سب نے اپنے آپ کو پیسہ کمانے کی مشین بنا لیا ہے اور ان پر دولت پرستی کا جنوں طاری ہوگیا ہے۔ غریب آدمی پس کر رہ گیا ہے، ان کا کوئی پرسانِ حال نہ رہا ہے۔

یہ ساری صورتحال اخلاقی وروحانی خرابیوں ہی کا نتیجہ ہے، یہ ایسی صورتحال ہے، جو ہم سب کے لئے لمحہ فکریہ ہے، بالخصوص تصوف سے وابستہ شخصیتوں کے لئے تو معاشرہ کی یہ حالت زار ان کی نیند اڑانے کا موجب

بننی چاہئے۔ لیکن اس کے لئے اہل تصوف کو اپنے حالات کا جائزہ لے کر خود احتسابی سے کام لینا ہوگا اور اکابر بزرگوں کے زین اصولوں کو پیش نظر رکھ کر ان اصولوں کے تحت اپنی اصلاح اور معاشرہ کی اصلاح کے لئے ہمہ جہتی منصوبہ بندی کے ساتھ کام کرنا ہوگا۔

یہ ساری تفصیل زیر نظر مضمون کے تمہید کے طور پر لکھی گئی ہے، جو خود چھوٹا سا مضمون بن گیا۔ **(محمد موسیٰ بھٹو)**

کثرت ذکر اور اپنی شخصیت کو مٹائے بغیر بغیر دین کے حقائق کا قلب پر کھلنا اور دین کا آسان ہونا اور شرح صدر کا حاصل ہونا، دشوار تر امر ہے، قرآن کی آیتیں اس سلسلہ میں بہت واضح ہیں۔ **وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَن ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ** . کثرت ذکر سے مراد متوجہ الی اللہ ہونے کے ملکہ کا راسخ ہونا ہے۔ یہ متوجہ الی اللہ اتنی بڑی نعمت ہے کہ ایک بڑے بزرگ کا قول ہے کہ مجھے فرمایا گیا کہ ہم تمہارے لئے دولت ودنیا کے دروازے کھول دیتے ہیں اور ان کا کوئی بھی حساب نہ ہوگا، بزرگ نے کہا کہ یا اللہ، مجھے قبول نہیں، اس لئے کہ اس سے توجہ الی اللہ متاثر ہوگی۔

دنیا کی زندگی کو ترجیح دینے کی وجہ سے آخرت کی فکر کا استحضار ہونا اور نفسی قوتوں کی معرفت کا حاصل ہونا اور باطنی بیماریوں سے بچاؤ کی صورت کا پیدا ہونا، وعظ ونصیحت کی باتوں کا اثر انداز ہو کر، زندگی کے رخ کا بدلنا اور دین کی باتوں کا حقیقی فہم حاصل ہونا دشوار ہے، اگرچہ بظاہر چاہے کتنا ہی علم حاصل ہو، لیکن اس علم سے دل میں فہم دین اور قبولیت حق کی استعداد پیدا ہو، دشوار ہے۔

بعض اوقات بزرگی کے نام پر شہرت اور مقبولیت حاصل ہوجاتی ہے، لیکن عنداللہ قبولیت کا شرف حاصل نہیں ہوتا، اس کی مثال وقت کے ایک عارف نے یہ دی ہے کہ ایک لالچی شخص نے بچوں سے کہا کہ فلاں جگہ مٹھائی تقسیم ہورہی ہے، بچے مٹھائی کے لئے دوڑنے لگے، ان کو دیکھکر لالچی شخص خود بھی دوڑنے لگا، اس سے اس کا سبب پوچھا گیا تو اس نے کہا کہ سارے بچے مٹھائی کے لئے دوڑ رہے ہیں تو ضرور مٹھائی تقسیم ہوتی ہوگی،

تبھی تو دوڑ رہے ہیں، اسی طرح بزرگی کے نام پر مقبولیت اور شہرت حاصل ہونے کے بعد بعض شخصیتوں کا یہی حال ہوتا ہے۔ اس طرح کے افراد سخت ابتلا وآزمائش میں مبتلا کردیئے جاتے ہیں، اس شہرت ومقبولیت کو وہ آخر وقت تک اپنی بزرگی اور مقبولیت عنداللہ سمجھ رہے ہوتے ہیں۔ اس طرح شہرت ومقبولیت اپنے باطنی روگوں کی حقیقت کو سمجھنے میں حجاب بن جاتی ہے۔

ایسا کیوں ہوتا ہے، اس کے بہت سارے اسباب ہوسکتے ہیں، اس کے کچھ اسباب درج ذیل ہو سکتے ہیں۔

یکم، نظر کو ایک نکتہ پر مرکوز کرکے، آنکھوں میں چمک پیدا کرنے اور توجہ کے ذریعہ لوگوں کو اپنا فریفتہ بنانے کی روش کو وظیفہ بنانا، دوم کشف، القا اور بہتر خوابوں کو ہر صورت میں بزرگی کی علامت سمجھکر، دعویٰ کی راہ پر گامزن ہونا، سوم درویشی کی بڑی علامت فقر واستغنا سے دستکش ہوکر، وڈیروں اور سرمایہ داروں کی معاشرت اختیار کرنا اور انہی کی طرح کا ٹھاٹھ باٹھ اختیار کرنا، چہارم خلوت میں اپنے نفس کو پامال اور ذلیل کرنے کی مشقوں اور اعمال کو ترک کرکے، اپنی شخصیت پر اپنی بزرگی کے نقش کو مستحکم کرنا، پنجم اپنی شخصیت کو اتنا اونچا سمجھنا کہ زندہ بزرگوں میں سے کسی بزرگ کو اہمیت نہ دینا اور نفس کی طرف سے ان میں خامیاں تلاش کرنے کی کوشش کا ہونا، ششم اپنی بزرگی اور اپنے تقویٰ پر ناز کرکے، گناہگاروں کو حقیر سمجھنے کی نفسیات کا ہونا، ہفتم اصلاح کی نیت سے اپنے ساتھ وابستہ ہونے والے افراد سے ملاقات اور ان سے تعلقات ورابطے کے دروازے مسدود کرنا اور مصروفیت کے نام پر بزرگوں کے تسلسل کی خلاف ورزی کرنا، ہشتم مجاہدوں کے بغیر خلافت کی مسند کو عام کرکے، اپنے حلقہ میں توسیع کرنا وغیرہ وغیرہ۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ہر طرح کی ابتلا وآزمائش سے محفوظ فرمائے، بالخصوص بزرگی کے نام پر آزمائش سے، اس لئے کہ اس سے بزرگی کا تقدس حائل ہوکر، فرد کو فریب نفس کے ادراک سے قاصر کر دیتا ہے، اس لئے بعض اکابر بزرگوں نے فرمایا ہے کہ لوگوں کی

اصلاح کے کام پر متعین ہونے کے باوجود کسی نہ کسی بزرگ کو اپنا سرپرست بنانا ضروری ہے، تاکہ نفس کو یہ انتباہ ہوتا رہے کہ وہ کامل نہیں ہے۔ اس کا بزرگ وسرپرست موجود ہے جس کی طرف اسے اصلاح کے لئے رجوع ہونا ہے۔

اگر فرد پر اللہ کے فضل خاص سے اپنی علمیت، اپنی بزرگی، اپنے تقویٰ اور لوگوں میں اپنی شہرت کے فریب نفس کی حقیقت اور اس کا راز کھل سکے اور وہ کچھ دیر کے لئے سہی، ان چیزوں سے بلند ہوکر، سوچ سکے تو اس پر لازم ہے کہ وہ ایسے اہل اللہ کا دامن تھامے، جو اللہ کی شان عظمت سے لرزاں وترساں رہتے ہیں، جو فقر، زہد ودرویشی اور لوگوں سے بے نیازی کو وظیفہ حیات بنا چکے ہیں۔ اس سلسلہ میں فرد کو اپنی بزرگی اور ماضی میں کئے ہوئے اپنے مجاہدوں کو حائل ہرگز نہ ہونے دینا چاہئے، اس لئے کہ ماضی کے مجاہدوں کے باوجود عدم احتیاط اور اصولوں کی خلاف ورزی کی وجہ سے وہ ابتلا وآزمائش میں مبتلا ہو چکا ہے، اس سے بچاؤ کی صورت یہی ہے کہ دوبارہ کسی اہل اللہ کے سامنے اپنے آپ کو پامال کیا جائے۔

بزرگی کی مسند پر فائز شخصیت کو یہ نکتہ ہمہ وقت پیش نظر رکھنا چاہئے کہ اکابر بزرگوں نے تصوف واہل تصوف اور خلفاء کے لئے جو بنیادی اصول متعین کئے ہیں، ان اصولوں کی خلاف ورزی سے بچتا رہے۔ بلکہ ان اصولوں کی خلاف ورزی کو اپنے لئے زہر قاتل سمجھنا چاہئے، چاہے نئی چیز اسے کتنی ہی خوشنما اور تصوف کے فروغ کا ذریعہ ہی کیوں نظر آئے، اس لئے کہ اکابر بزرگوں کے متعین کردہ اصول، قرآن وسنت پر ان کے غوروفکر اور اپنے زندگی بھر کے تجربات ومشاہدات کا نچوڑ ہیں، ان اصولوں میں مذکورہ بیان کردہ نکات بھی شامل ہیں۔ ان اصولوں سے باہر خطرات ہی خطرات ہیں اور فتنے ہی فتنے ہیں۔ اگرچہ بظاہر شخصیت کو لوگوں میں مقبولیت وشہرت کی وجہ سے وہ فتنے نظر نہ آئیں، لیکن زندگی کے ایک موڑ پر اس پر یہ آزمائشیں واضح ہوکر سامنے آئیں گی، لیکن پھر رجوع کی صورت مشکل ہوجائے گی۔ واضح ہوکہ یہ تجزیہ اپنے ہی جیسے افراد کے واردات نفس کا آئینہ ہے

اور اپنی اصلاح اور انتباہ نفس کے لئے اسے قلمبند کیا گیا ہے۔

(۲)

تصوف، سلف صالحین کا قائم کردہ ایسا ادارہ ہے، جس سے ملت اسلامیہ کی تاریخ دعوت عزیمت اور احیائے اسلام کی قیمتی اور لازوال یادیں وابستہ ہیں۔ تصوف، جہاں مسلم امت کے افراد میں تجدید ایمان اور روحانی قوتوں کو بیدار کرنے کا ذریعہ رہا ہے، وہاں تصوف نے ہر دور میں فکری انقلاب بھی برپا کیا ہے، یہ فکری انقلاب ایسا ہے، جو تصوف اور اہل تصوف کی امتیازی خصوصیت رہی ہے اور اہل تصوف کی شناخت ہی یہ فکری انقلاب رہا ہے، فکری انقلاب سے ہماری مراد مادیت پرستی اور عقلیت کی بنیاد پر دنیا ہی کو مقصود بنانے کے جو نظریات ہر دور میں اٹھے ہیں، اہل اللہ نے ان نظریات کے خلاف بند باندھا ہے اور دنیا سے بے نیازی اور فقر کی زندگی کی عملی مثالیں قائم کرکے، ان مادی نظریات سے مسحور افراد کے سامنے مادیت کے طلسم کو توڑنے کا کردار ادا کیا ہے۔ جس کا، امت کو جو بڑا فائدہ ہوا ہے، وہ یہ ہے کہ امت مجموعی حیثیت سے کبھی بھی مادیت، مادہ پرستی کی قوتوں اور مادی نوعیت کے سحر میں مبتلا نہ رہی، اکابر بزرگوں کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو ان سب کے ہاں جو مشترکہ نکتہ نظر آتا ہے، وہ فقر محمدی کا نکتہ ہے۔ انہوں نے اپنے اس کردار کے ذریعہ ہر دور میں خوشحال مادی زندگی اور دنیا کو فیصلہ کن اہمیت دینے والے نظریات اور اس کے زیر اثر مادیت کی طوفانی لہروں کا مقابلہ کرکے، لوگوں کو ہمت وحوصلہ کے ساتھ فقر کی زندگی پر گامزن ہونے پر قائم رکھا ہے۔

اس سلسلہ میں بزرگوں کی خانقاہیں صدیوں سے امت میں مادیت پرست تحریکوں کے خلاف مزاحمت کا مرکز رہی ہیں۔

عصر حاضر میں امت کو جو سب سے بڑا چیلنج درپیش ہے، وہ عالمی مغربی تہذیب اور سرمایہ دارانہ نظام کے غلبہ کے زیر اثر دنیا اور مادی زندگی پر فریفتہ ہونے، دنیا کی لذتوں، آسائش، اور تعش کے سامان سے دلبستگی، مادی نعمتوں سے زیادہ سے زیادہ متمتع ہونے اور دولت جمع کرنے کا جنون ہے، جس میں امت کے تقریباً سارے طبقات مبتلا ہیں۔ محروم

طبقات اس سلسلہ میں احساس کمتری اور اور نفسیاتی امراض کا شکار ہیں کہ وہ خوشحال مادی زندگی اور اشیائے لذت سے محروم ہیں اور یہ محرومی ان کے لئے بے شمار نفسیاتی مسائل کا موجب بن گئی ہے۔

موجودہ دور کے اس سب سے بڑے چیلنج سے مقابلہ کے سلسلہ میں تصوف سے وابستہ شخصیتوں کو جو کردار ادا کرنا چاہئے، دکھ اور اذیت کی بات یہ ہے کہ اہل تصوف کی اکثریت نہ صرف یہ کہ اس میں ناکام ہے، بلکہ وہ خود مادیت کی بڑھتی ہوئی لہروں کی نذر ہوکر کروڑ پتی اور ارب پتی بننے کی راہ پر گامزن ہیں۔

اس طرح وہ اپنی اس روش اور کردار کے ذریعہ افراد امت میں زندگی کے جو نقوش اور خطوط متعین اور منتقل کررہے ہیں اور انہیں عملاً جو پیام دے رہے ہیں، وہ یہ ہے کہ عملی زندگی میں مادہ پرستی کے سیلاب کا مقابلہ کرکے، فقر محمدی کی راہ پر گامزن ہونا لاحاصل ہے، نیز اس دور میں سلف کی اختیار کردہ دنیا سے بے نیازی، استغنا اور زہد وغیرہ سب ناقابل عمل چیزیں ہیں۔ اصل چیز بزرگوں سے روحانی وابستگی ہے اور تھوڑا بہت ذکر وفکر کرنا ہے۔

اس وقت پاکستان میں چھوٹی بڑی ۹۵ فیصد سے زیادہ خانقاہیں اور ان کے مسند نشین صاحبان کردار کا یہی نمونہ پیش کر رہے ہیں۔ کچھ بزرگ وہ ہیں، جنہیں غیر معمولی ذہنی صلاحیتوں کی وجہ سے ملک کے بڑے مالداروں یا دوسرے ممالک میں بھی پذیرائی حاصل ہے۔ ان بزرگوں کی تو عملی زندگی سرمایہ داروں کی زندگی کا زندہ نمونہ ہے۔ بڑی بڑی گاڑیاں، بڑے بڑے بنگلے، بڑے لوگوں کی آمد ورفت، اصلاح کے آرزومند مریدوں سے دوری، موجودہ تصوف کا یہ ایسا منظر ہے، جو اس سے پہلے نظروں نے نہ دیکھا ہوگا۔

(۳)

موجودہ دور کے اہل تصوف کے جن حالات کا شکوہ کیا گیا، یہ شکوہ ایسا ہے، جو ملک بھر کے علمی حلقوں میں عام ہے، ہم جو ایک عرصہ سے تصوف کی اہمیت وضرورت پر مسلسل لکھ رہے ہیں، ہم سے ملک بھر کے اہل علم کا اکثر یہی سوال ہوتا ہے کہ آپ ہمیں کس

تصوف کی دعوت دے رہے ہیں۔ مروجہ تصوف، جہاں وزراء سے ملنا آسان ہے، جب کہ بزرگوں سے ملنا دشوار ہے، جہاں بڑی بڑی گاڑیوں، شاندار کوٹھیوں اور دولت کی ریل پیل ہے۔

ملک بھر کے علمی حلقوں کی یہ شکایت اس قابل ہے کہ اس پر غور وفکر سے کام لیا جائے۔

ہماری نظر میں موجودہ دور میں ظالمانہ سرمایہ دارانہ نظام نے ہر عام وخاص فرد کی زندگی اتنی مشکل بنادی ہے کہ ہر فرد کو جائز روزی کے لئے غیر معمولی تگ ودو کئے بغیر چارہ کار نہیں رہا۔ چونکہ تصوف سے وابستہ شخصیتیں بھی اسی ماحول کا حصہ ہیں، اس لئے عالمی سرمایہ دار کی طرف سے پیدا کردہ سنگین معاشی دباؤ کا مقابلہ کرنا اور زندگی کے جدید لوازمات کی کسی حد تک تکمیل ضروری ہے۔

جہاں معاشرے کے دوسرے طبقات معاشی جدوجہد کے لئے کاروبار اور وسائل کے حصول کے لئے کوشاں ہیں، وہاں اہل تصوف کے لئے بھی یہ جدوجہد ضروری ہے اور اس سلسلہ میں ان پر اعتراض بالکل بیجا ہے۔

لیکن اس سلسلہ میں اہل تصوف یعنی بزرگی کے مقام پر فائز شخصیتوں سے جو غلطی ہورہی ہے، وہ یہ ہے کہ حقیقی معاشی ضروریات اور زندگی کے لوازمات اگر پچیس فیصد ہیں، تو وہ اس پر قناعت کرنے کی بجائے ضروریات کی ان چیزوں میں مصنوعی ضروریات کو شامل کرکے ان میں سو فیصد اضافہ کردیتے ہیں، مثلاً سواری کے لئے ایک اچھی گاڑی کی ضرورت ہے تو بہتر سے بہتر نئی گاڑیوں کی طلب وحرص انہیں حد تجاوز میں رہنے نہیں دیتی اسی طرح، ایک اچھے اور وسیع گھر کی ضرورت ہے تو وہ اس پر اکتفا کرنے کی بجائے بنگلوں کے لئے نئے پلاٹ لینے کے ساتھ ساتھ کراچی، لاہور اور اسلام آباد وغیرہ میں بنگلے بنانے کی آرزو انہیں مضطرب کردیتی ہے۔ اسی طرح بنک بیلنس میں اضافہ کی آرزو ہے، جو انہیں براہ راست یا بالواسطہ طور پر نئے نئے کاروبار شروع کرنے اور مریدوں سے مالی تعاون لینے پر مجبور کرتی ہے۔

ایک غضب پیر صاحبان کے ان مریدوں نے ڈھایا ہے، جو بظاہر تو صورت وشکل میں صاحبان شریعت ہیں، لیکن ان کی ذہنی وعلمی طور پر نشوونما عالمی سرمایہ دارانہ اور مادہ پرستانہ ماحول اور مغربی نظام تعلیم میں ہوئی ہے۔ جو سیکولر طرز زندگی کے دلدادہ ہیں، اور وہ

اسلامی معیشت ومعاشرت سے ایک حد تک بے گانہ ہیں۔ انہیں بزرگوں اور روحانیت کی ضرورت اس لئے درپیش ہے، تاکہ کچھ تو سیکولر طرز زندگی کو وجہ جواز مل سکے اور کچھ روحانی سکون حاصل ہو سکے اور ضمیر کو یہ کہکر مطمئن کرنے کی صورت پیدا ہو سکے کہ ان کا تو بزرگوں سے تعلق قائم ہے۔ جب بزرگوں سے تعلق قائم ہے تو ان کے دین وایمان کو کیا خطرہ لاحق ہے؟ اس طرح کے مالداروں کے گھیراؤ نے بھی اہل تصوف کو دوسروں کی طرح مادیت کی دوڑ میں شریک ہوکر، سلف کے زریں اصولوں سے انحراف کی راہ پر گامزن کیا ہے، جو بہرحال المیہ ہے۔

(۴)

اکابر بزرگوں نے اہل تصوف کے لئے جن بنیادی اصولوں کو لازم کیا ہے، ان میں زہد، استغنا اور اہل دنیا سے بے نیازی کی روش سرفہرست ہے۔

اس سلسلہ میں بزرگوں کی تحریروں کے کچھ اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں، تاکہ اندازہ ہو سکے کہ انہوں نے اسے کتنی غیر معمولی اہمیت دی ہے۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ اپنے مکتوبات میں اپنے خلیفہ ملا طاہر بدخشی کو لکھتے ہیں:

''مخلوق میں اپنے مقبول ہونے کی شہرت سے لرزاں وترساں رہنا، جیسا کہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ (ترجمہ، آدمی کی بُرائی کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ لوگ دین ودنیا میں (شہرت کی بنا پر) اس کی طرف انگلیاں اٹھائیں، مگر جسے اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے)۔

اپنے افعال ونیتوں کو ناقص سمجھنا، اگرچہ وہ روز روشن کی طرح واضح ہوں۔

اپنے احوال ومواجید (کشف وکرامات) پر عدم توجہ کرنا، اگرچہ وہ درست ومطابق شریعت ہی کیوں نہ ہوں۔''

''اگر کوئی مرید (اصلاح کی) طلب کے ساتھ آئے اور (اورحق تعالیٰ کے ساتھ) مشغول رہنے کا ارادہ ظاہر کرے تو اسے تم اپنے لئے ببر شیر کی طرح سمجھو اور اس سے ڈرتے رہو کہ ایسا نہ ہوکہ وہ تمہارے لئے خرابی کا موجب ہو اور یہ امر اس کے لئے

استدراج ثابت ہو۔ اگر بالفرض کسی مرید کے آنے سے خوشی محسوس ہو تو اس خوشی کو کفر اور شرک کی طرح بُرا سمجھیں اور اس کا تدراک استغفار اور ندامت کے ذریعہ اس حد تک کریں کہ دل سے خوشی کا اثر بالکل زائل ہوجائے۔ بلکہ خوشی کی بجائے دل میں غم اور خوف کی کیفیت پیدا جائے۔

اور اپنے خلفاء کو اس بات کی تاکید کریں کہ مرید کے مال میں طمع اور ان سے دنیاوی فائدے کی آرزو اور توقع ہرگز نہ رکھیں، کیونکہ یہ آرزو مرید کی اصلاح وہدایت کی راہ میں رکاوٹ بنے گی اور بزرگ کے لئے فتنہ کا موجب ثابت ہوگی۔ کیونکہ حق تعالیٰ کی طرف سے خالص دین کا مطالبہ ہے، **الالله الدین الخالص** (سورۃ زمر آیت ۳) (آگاہ رہو کہ خالص دین اللہ ہی کے لئے ہے)۔ اس کی مقدس بارگاہ میں شرک کی کسی طرح کی کوئی گنجائش موجود نہیں۔''

''یہ نکتہ بھی ذہن نشین ہونا چاہئے کہ دل پر طاری ہونے والی ہر قسم کی تاریکی اور قساوت کا ازالہ توبہ واستغفار اور شرمندگی اور التجا کے ذریعہ آسانی سے ہوسکتا ہے، لیکن دل پر جو تاریکی اور کدورت کمینی دنیا کی محبت کی وجہ سے طاری ہوتی ہے، جو دل کو غلیظ اور ناپاک کردیتی ہے، اس کا ازالہ بہت دشوار ہوتا ہے۔ آنحضورﷺ نے صحیح فرمایا ہے کہ ''**حب الدنیا رأس کل خطیئة**'' (دنیا کی محبت ساری بُرائیوں کی جڑ ہے) اللہ تعالیٰ ہم کو، آپ کو دنیا کی محبت، دنیا داروں کی محبت اور ان سے میل جول سے بچائے، کیونکہ یہ محبت زہر قاتل ہے، ہلاکت خیز بیماری ہے، اور عظیم تر بلا ہے اور پھیلنے والی بیماری ہے۔ (دفتر اول مکتوب نمبر ۷۱۔ مترجم حضرت مولانا زوار حسین شاہ صاحبؒ)

حضرت عبدالوھاب شعرانیؒ اپنی کتاب ''ہم سے عہد لیا گیا'' میں لکھتے ہیں:

''سیدی ابوالحسن شاذلی رحمتہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ دنیا ابلیس کی بیٹی ہے، پس جو کوئی ضرورت سے زیادہ دنیا لے گا، وہ شیطان کا داماد بن جائے گا اور اس کے پاس شیطان کی آمد و رفت اپنی بیٹی کی وجہ سے زیادہ ہوگی۔

میں کہتا ہوں کہ لینے کی مثل دنیا کی آرزو کرنا بھی ہے، کیونکہ آرزو کرنا مثل پیغام بھیجنے کی ہے، اور پیغام بھیجنے کے بعد بھی داماد خسر میں ملاقات اور آمد ورفت عادۃ ہونے

لگتی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ جس نے ابلیس کی بیٹی سے نہ نکاح کیا، نہ اس کو پیغام بھیجا، ابلیس اس کے پاس نہیں پہنچ سکتا، چنانچہ انبیاء علیہ السلام کے پاس شیطان نہیں پہنچ سکتا۔

اور اس عہد پر پوری طرح عمل کرنے والوں میں سے فضیل ابن عیاض اور امام شافعی رحمھما اللہ وغیرہم تھے اور اس عہد سے معلوم ہوگیا کہ فقراء کاملین، کیمیا بنانے اور مطالب ومقاصد بتلا کر روپیہ پیسہ لینے سے مستغنی ہوتے ہیں، کیونکہ جب وہ بے محنت وبے مشقت ملنے والے سونے کے ڈھیروں کو چھوڑ دیتے ہیں اور ان میں سے کچھ نہیں لیتے، تو ان کی نسبت یہ کیونکر خیال کا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی جانوں کو کیمیا بنانے کے لئے جڑی بوٹیاں یا دھونیکی دوائیں خریدنے یا مقاصد ومطالب کے لئے مٹی کھودنے کی مشقت میں ڈالیں گے، تاکہ اس ذریعہ سے یہود ونصاری کے گندے مال اور ان کی خیرات وصول کریں، جو کہ طالب معلوم کرنے کے لئے الگ رکھتے ہیں۔ (صفحہ ۹۷ ترجمہ مولانا ظفر احمد عثمانیؒ)

بیسویں صدی کے عارف اور مفکر مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اپنی کتاب ''طالبان علوم دین کا مقام اور ان کی ذمہ داریاں'' میں لکھتے ہیں:

''اسلام کی تاریخ میں، خاص طور پر اس کی دعوت وعزیمت کی تاریخ اور اس کی اصلاحی تحریکوں کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ عہد نبوی سے لے کر آج تک علم اور نفعِ خلائق کا، اصلاح وانقلابِ حال کا اور زہد وایثار کا ساتھ رہا ہے، یہ دونوں بالکل ہم سفر ہیں، آپ اسلام کی پوری تاریخ کا جائزہ لیں گے تو معلوم ہوگا کہ ان دونوں کا کہیں ساتھ نہیں چھوٹا ہے، اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کے ذریعہ امت کو نفع پہنچایا، اور کسی بڑے فتنہ سے محفوظ فرمایا، ان میں سب سے بڑا فتنہ 'ردت' کا فتنہ تھا، اور دوسرا فتنہ خلقِ قرآن کا تھا، جیسا کہ بعض لوگوں نے کہا ہے: **نصر الله هذه الامة يا. اعان الله هذه الامة بابی بکر الصدیق یوم الردة وباحمد بن حنبل یوم الفتنة**، اور اس کے بعد جو فلسفے کے حملے تھے، جن کے مقابلہ کے لیے جو لوگ آئے، امام غزالیؒ ہوں یا امام ابوالحسن اشعریؒ ہوں، پھر اس کے بعد جو فتنے تھے، ان کے مقابلہ کے لیے امام ابن تیمیہؒ وغیرہ آئے، پھر

ہندوستان میں صوفیائے کرام، جنہوں نے مادیت وغفلت اور سلطنت کے اثر سے جو جاہ پرستی، دولت پرستی اور نفس پرستی پیدا ہو رہی تھی، اس کو روکا، پھر اس کے بعد غیر مسلموں کے اثر سے اسلامی معاشرے میں جو بدعات، مشرکانہ عقائد داخل ہوگئے تھے، اور وحدۃ الوجود کا جو اثر فلاسفہ اور صوفیوں سے لے کر ادباء اور شعراء تک کے دماغوں میں سرایت کر گیا تھا، اس کے مقابلے کے لیے حضرت مجدد الف ثانیؒ آئے، پھر اس کے بعد قرآن مجید کے براہِ راست مطالعہ اور حدیث سے اشتغال نہ ہونے کی وجہ سے جو ایک جاہلیت ہندیہ اور مقامی اثرات تھے، اور اتباعِ سنت کا جو ذوق کم ہوگیا تھا، اور عقیدہ میں رخنہ پڑ گیا تھا، اس کے سدباب کے لیے حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے اخلاف وخلفاء کو اللہ تعالیٰ نے تیار کیا۔

غرض کہ پوری تاریخ بتاتی ہے کہ اصلاح کا کام، عزیمت کا کام اور سطح سے بلند ہوکر امت کے نفع کا کام اور زہد وایثار، دونوں میں اللہ تعالیٰ نے کوئی فطری اور طبعی رشتہ قائم کر دیا ہے، جو اسلام کی پوری تاریخ میں ٹوٹنے نہیں پایا، اس لیے میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ اس کے لیے بھی آپ اپنے کو تیار کریں، کیوں کہ دوسری قوموں میں بھی کوئی کام زہد وایثار کے بغیر نہیں ہوا ہے، اگرچہ ان کے مزاج الگ، ان کے نتائج مختلف اور ان کے احکام بھی دوسرے ہیں، اس لیے اپنے آپ کو ارزاں فروشی سے بچائیں، صرف دولت دنیا کو اور عہدوں کو اپنا مطمح نظر نہ بنائیں، جہاں سے کام آجائے، مانگ آجائے، اور امید ہوجائے، بس آپ آنکھ بند کر کے چلے نہ جائیں اور زہد وایثار سے کام لیں، اسی زہد وایثار کے وعدے سے قرآن مجید بھرا ہوا ہے، اس وقت نہ میں استیعاب کرسکتا ہوں اور نہ آپ کو ضرورت ہے۔

پوری تاریخ شاہد ہے کہ زہد وایثار سے جو حقیقی آسودگی اور صحیح عزت حاصل ہوتی ہے وہ کہیں نہیں حاصل ہوتی ہے، اور یہی اصل مقصد ہے، جو لاکھوں کروڑوں روپے کے مالک کو بھی حاصل نہیں ہے، وہ ایک لقمہ کو حلق سے اتارنے کے لیے بعض اوقات ترستے ہیں، ہنری فورڈ کہتا تھا کہ میری ساری دولت لے لو اور میرا ہاضمہ درست کردو، اور اس قابل بنادو کہ میں کچھ کھا پی سکوں، حقیقی ضرورت کا سہولتوں اور عزت کے ساتھ پیدا ہونا

اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہوتا ہے۔ (صفحہ ۲۱۵ ۔ ۲۱۶)

حضرت فرید الدین شکر گنج کی ملفوظات کی کتاب ''اسرار الاولیاء'' ہے۔ اس میں آپ فرماتے ہیں:

''شیخ شہاب الدین رحمتہ اللہ علیہ کے فرزند نے باپ سے خرقہ کا سوال کیا تو فرمایا ''کل آنا، تمہیں خرقہ دیا جائے گا۔ اسی رات فرزند نے خواب میں دیکھا کہ دو آدمیوں کو فرشتے گلے میں آگ کی زنجیریں ڈالے اوپر کی طرف لے جارہے ہیں۔ آپ نے فرشتوں کا دامن پکڑ کر پوچھا، یہ کون ہیں؟ کہا، یہ پیر ہے اور وہ مرید۔ اس پیر نے اس مرید کو خرقہ دیا تھا، لیکن اس نے اس کا حق ادا نہیں کیا، بلکہ گلی کوچوں اور بازاروں میں پھرتا تھا اور بادشاہوں اور امراء کی صحبت میں رہتا تھا۔ ہمیں حکم ہوا کہ اس تاریک ضمیر پیر اور اس گمراہ مرید کو آگ کی زنجیروں میں جکڑ لو اور دوزخ میں لے جاؤ۔ خواب سے بیدار ہوئے تو شیخ صاحب کے پاس آئے۔ شیخ صاحب صاحب نے مسکرا کر پوچھا کہ خرقہ پوشوں کا حال دیکھ لیا ہے کیا؟ فرمایا، اے فرزند! خرقہ وہ شخص پہنتا ہے، جو دونوں جہانوں سے قطع تعلق کرے اور اپنے پیروں اور مشائخ کے طریقہ پر کاربند رہے۔ تو ابھی ستر پردوں میں بند ہے، خرقہ پہننے کا وقت ابھی تیرے لئے نہیں آیا۔ واپس چلا جا، ورنہ تیری بھی وہی حالت ہوگی، جو خواب میں اس پیر اور مرید کی دیکھی۔ فرمایا کہ جب تک انسان اپنے آپ کو دنیاوی آلائشوں سے صاف نہ کرے، اسے خرقہ نہیں پہننا چاہیے اور نہ ہی پیر کو چاہیے کہ بغیر صاف کئے اسے خرقہ دے، کیونکہ خرقہ انبیاء واولیاء کا لباس ہے۔ جو شخص دنیاوی آلائشوں میں ملوث ہوگا، وہ خرقے کا حق ادا نہیں کر سکے گا او جب حق ادا نہیں کر سکے گا تو گمراہی میں پڑے گا۔ (واضح ہو کہ خرقہ اس زمانہ میں بزرگی، درویشی اور خلیفہ ہونے کی علامت ہوتا تھا۔ مرتب)

فرمایا، اے درویش! خرقہ پہن لینا تو آسان ہے، لیکن اس کی حق ادائی مشکل کام ہے۔ اگر صرف خرقہ پہن لینے سے نجات حاصل ہوتی تو سارے خرقہ پہن لیتے۔ خرقہ پہن کر کام کرنا پڑتا ہے۔ اگر تو نے خرقہ پوشوں جیسے اعمال کئے تو بہتر، ورنہ یہی خرقہ قیامت کے دن مدعی بن کر پوچھے گا کہ تو نے مجھے پہنا تو ضرور، لیکن میری حق ادائی کیوں نہ کی۔

اس وقت فرشتوں کو حکم ہوگا کہ تیرے گلے میں آگ کا خرقہ پہنائیں اور دوزخ میں لے جائیں۔ فرمایا کہ اگر تو خرقہ پہننا چاہتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی رضامندی کی خاطر پہن، نہ کہ خلقت کے دکھانے کیلئے، تاکہ وہ تیری عزت کریں۔ اگر تو ایسا کرے گا تو قیامت کے دن بے بس اور مجبور ہوجائے گا اور گرفتار کیا جائے گا۔ فرمایا کہ اس راہ میں پیر میں ذاتی قوت ہونی چاہیے، تاکہ اگر کوئی مرید ہونے کی خاطر حاضر خدمت ہو تو نور معرفت سے اس کے قلوب ثلاثہ کو دیکھے اور دنیاوی کدورت، کینہ، کھوٹا پن سے صاف کرکے کچھ مدت اپنے پاس رکھ کر، مجاہدہ کا حکم کرے۔ بعد ازاں جب اس میں حرص وہوا کی کوئی کدورت باقی نہ رہ جائے تو پھر اگر خرقہ دے تو جائز ہے، لیکن اگر پیر میں اس قسم کی قوت نہ ہو اور کسی کو خرقہ وکلاہ دے دے گا تو خود بھی گمراہی میں پڑے گا اور اسے بھی گمراہی میں ڈالے گا۔ (صفحہ ۵۸)

حضرت غلام علی شاہ اپنی ملفوظات کی کتاب جس کا ترجمہ محمد نذیر رانجھا صاحب نے کیا ہے، لکھتے ہیں: بزرگوں کے ہاں یہ روایت تھی کہ دس سال کے مجاہدوں سے پہلے انہیں سلوک طے کرا کر خلافت کے منصب پر فائز نہیں کیا جاتا تھا، ایک بزرگ نے اس اصول کی خلاف ورزی کرکے کچھ مریدوں کو دس سال سے پہلے ہی خلافت کی مسند عطا کردی، انہی دنوں اس علاقہ میں ایک بڑا فتنہ پیدا ہوا، بزرگ کے یہ خلافت یافتہ افراد اس فتنہ کی نذر ہوگئے، اس طرح وہ نفس پرستی کی دلدل میں مبتلا ہوگئے۔''

ملفوظات کی یہ کتاب اس وقت میرے سامنے نہیں ہے، لیکن ان کے ملفوظ کا مفہوم کچھ اس سے ملتا جلتا ہے۔

چند اکابر بزرگوں کے کچھ حوالے پیش کئے گئے ہیں، ورنہ یہ موضوع کافی جامع ہے، جس پر تفصیلی مقالہ لکھا جا سکتا ہے۔

ضرورت ہے کہ اکابر بزرگوں کے پیش کردہ ان اصولوں کی روشنی میں جائزہ لے کر سلف کے اس عظیم ادارہ تصوف کو انہی کے متعین کردہ خطوط پر استوار کرنے کی کوشش کی جائے، تاکہ جس طرح ماضی میں اس ادارہ نے امت کو مادیت پرستی کے سیلاب میں بہنے سے بچانے کا کردار ادا کیا تھا، اب بھی وہ مادیت پرستی کی طوفان خیزیوں میں افراد امت

کے مؤثر سہارے کا ذریعہ بن سکے۔

امت کے اس مسلمہ ادارہ تصوف کے بہتر تسلسل کو قائم رکھنے کی صورت بھی یہی ہے۔

بزرگان دین نے اس سلسلہ میں جو کچھ فرمایا ہے، وہ سب حضورﷺ کی سیرت سے ہی ماخوذ ہے۔ آپﷺ کی سیرت کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ آپ کی ساری انقلابی زندگی اعلیٰ درجہ کی روحانیت کا کامل نمونہ تھی، کفار سے مقابلہ کے وقت پیٹ سے پتھر باندھنا، گھر میں چالیس چالیس دن تک چولہے کا نہ جلنا، زندگی بھر اس عادت کا معمول ہونا کہ رات کو سونے سے پہلے تک حاصل ہونے والی ساری رقم واموال کو اللہ کی راہ میں خیرات کرنا، خود بھوکا رہ کر دوسروں کو کھلانا، لباس میں اعلیٰ درجہ کی سادگی کا ہونا، گھر کا سب سے سادہ ہونا وغیرہ۔

فتوحات کے باوجود حضورﷺ کی طرز معاشرت اور زندگی کے رنگ ڈھنگ میں کوئی فرق واقع نہ ہوا۔

تصوف واہل تصوف نے دراصل حضورﷺ کے اسی انقلابی روحانی پہلو کو زندگی کے ہر موڑ پر پیش نظر رکھا، امت کی تاریخ میں اہل تصوف کی یہی اہمیت ہے، جس کی وجہ سے وہ امت کے دوسرے سارے طبقات سے امتیازی شان رکھتے ہیں اور اسی مثالی کردار کی وجہ سے ہی اہل تصوف اور بزرگان دین اسلام کے تسلسل کو اب تک قائم رکھنے میں کامیاب رہے ہیں۔ موجودہ خانقاہ کے وارثین، تحفظ اسلام اور اسلامی روحانیت کے فروغ میں بھی اسی وقت قابل ذکر کردار ادا کر سکتے ہیں، جب وہ ملعون دنیا کو بے وقعت سمجھکر فقر محمدی کے اجزاء سے بہرہ ور ہوں گے۔ **(ماخوذ ''بیداری'' جولائی ۲۰۱۵ء)**

قومیت اور جدید قومی پرستی

اثرات ونتائج پر ایک نظر

مغرب نے انسانیت کو جو بُرے تحفے دیئے ہیں، ان میں مادیت پرستی کی ہمہ گیر فکر کے ساتھ ساتھ قوم پرستی کا نظریہ بھی شامل ہے، جس نے انسانیت کو قومیتوں کی بنیاد پر تقسیم در تقسیم کرکے، ایک دوسرے سے متصادم کیا ہے۔ جدید قوم پرستی دراصل زبان، علاقائیت اور جداگانہ معاشرتی شناخت اور تاریخی ورثہ کی بنیاد پر قومیتوں کو جداگانہ وطن کی صورت دینے کی علمبردار ہے۔ یورپ دسیوں چھوٹے چھوٹے ملکوں میں منقسم ہوا، یہ جدید قوم پرستی ہی کا پھل ہے۔ جدید قوم پرستی نے خلافت عثمانیہ کو ختم کرکے، عربوں کو چھوٹے چھوٹے ملکوں میں تقسیم کرکے، ان کی قوت کو مفلوج کردیا۔ اسی قوم پرستی نے ہم سے مشرقی پاکستان علیحدہ کروا کر اسے بنگلہ دیش کی صورت دی۔

یہی قوم پرستی سندھ میں بھائیوں کو بھائیوں سے متصادم کرنے اور امن وامان کی فضا کو غارت کرنے کا ذریعہ بن چکی ہے۔

پاکستان پہلے دن سے ہی قومیتوں کے مسئلہ سے دوچار رہا ہے۔ لیکن اس مسئلہ کو سمجھکر، اسے بہتر حکمت عملی سے حل کرنے کی کوئی قابل ذکر کاوش نہیں ہوئی۔

یورپ کو تو قوم پرستی کے ایک نئے بت کی ضرورت اس لئے درپیش ہوئی کہ لوتھر کی نشاۃ ثانیہ کی تحریک سے یورپ، عیسائیت کے اثرات سے جو اسے متحدہ کئے ہوئی تھی، اس سے باہر نکل آیا اور عیسائیت کے سیاسی غلبہ کے خاتمہ سے وہاں قومیتوں کو متحد کرنے کی کوئی قوت موجود نہیں تھی۔ چنانچہ قومیتوں کا نیا بت تراش کر، اسے باقائدہ نظریہ کی صورت دے کر چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہوئی۔

مغرب نے قوم پرستی کے اسی نسخہ کو عالم اسلام کی قوت کو مفلوج کرنے کے لئے استعمال کیا اور جگہ جگہ قوم پرستی کی تحریکیں کھڑی کرکے اور انہیں طاقتور بنا کر پہلے عالم عرب کو چھوٹے چھوٹے ملکوں میں تقسیم کیا، اس کے بعد پاکستان میں قوم پرستی کی تلوار سے اس

کے دوٹکرے کرادیئے اور بقیہ پاکستان میں بھی قوم پرستی کی تحریکوں کو غذا فراہم کی، مغرب نے ہمارے ہاں قوم پرستی کی تحریکوں کو مستحکم کرنے کے لئے جو کوششیں کیں، وہ تو اس کے سامراجی مقاصد کا حصہ ہیں، لیکن ہمیں کیا ہوا کہ ہم نے قوم پرستی کے بت کے خوفناک ہتھیار کو ناکام بنانے اور اپنی نسلوں کی اسلامی بنیادوں پر تعلیم تربیت اور ذہن سازی کے کام سے غافل رہے۔

سندھ میں ۱۹۸۵ء سے پہلے سندھی قوم پرستی کی تحریک ہی نئی نسل میں مقبول تھی، لیکن ۱۹۸۵ء کے بعد مہاجر قوم پرستی کی تحریک اس زور شور سے اٹھی کہ سندھی قوم پرستی کی تحریک ذہن سازی اور نظریاتی طور پر طاقتور ہونے کے باوجود مہاجر قوم پرستی کی تحریک کے مقابلہ میں کمزور رہی۔

''مہاجر'' کی اصطلاح کو قومیت کی تحریک میں تبدیل کرنا بہت بڑی زیادتی ہے۔ اس لئے کہ مہاجر تو ایک پاکیزہ اصطلاح ہے، جو تحفظ اسلام کے لئے ہجرت کرنے والوں کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ قوم پرستی کی مہاجر تحریک نے جلد ہی عسکریت کی صورت اختیار کی اور مہاجر نوجوانوں میں جوش خروش پیدا کرکے، انہیں سخت ترین تنظیم کی جکڑ بندیوں میں جکڑا، پھر مہاجر قوم پرستی کی تحریک کو یہ سہولت یہ بھی حاصل ہوئی کہ ضیاء الحق اور مشرف کی حکومت کی انہیں سرپرستی حاصل رہی۔ نیز قومی پریس نے مہاجر تحریک کو پاکستان کی سب سے طاقتور سیاسی جماعت کی حیثیت سے پیش کرنا شروع کیا، قوم پریس نے یہ کردار رضا کارانہ طور پر ادا کیا یا اضطراراً، اس سے بحث نہیں، لیکن قوم پرستی کی مہاجر تحریک کو مہاجر آبادی کی دل کی آواز بنانے میں قومی پریس اور میڈیا نے فیصلہ کن کردار ادا کیا۔

اس وقت مرکزی حکومت کی کوشش یہ ہے کہ قوم پرستی کی مہاجر تحریک سے عسکریت کے عنصر کو ختم کرکے اس تنظیم کو ایک سیاسی جماعت کی حیثیت سے قائم وبرقرار رکھا جائے۔ موجودہ حکومت جسے اس معاملہ میں فوج کی مکمل تائید حاصل ہے، اگر وہ اس مقصد میں کامیاب ہوئی تو مہاجر قومیت کی تحریک سیاسی جماعت کی حیثیت سے متحدہ پاکستان کے لئے کوئی زیادہ نقصان دہ ثابت نہ ہوگی۔ اس لئے کہ مہاجر قوم پرستی کی تحریک نظریاتی اعتبار سے طاقتور نہیں ہے۔ بلکہ اس تحریک کے پس پشت اسلام دشمنی، جارحانہ سیکولرزم، ہندی تہذیب کی آمیزش کی بنیاد پر لٹریچر موجود نہیں ہے۔

مہاجر آبادی ویسے مزاجا قوم پرستی کی تحریک سے مناسبت نہیں رکھتی، اس لئے کہ مہاجر آبادی کا مفاد کسی ایک علاقہ تک محدود ہونے کی بجائے پوری دنیا میں پھیل جانے سے وابستہ ہے، اس لئے یہ آبادی دنیا بھر میں موجود ہے۔ کسی ایک علاقہ میں سکڑ کر رہنا، اس کے مزاج کے منافی ہے، لیکن چونکہ پروپیگنڈہ اور پبلسٹی سے ذہن مسحور ومفلوج ہوئے بغیر نہیں رہتے، اس لئے مہاجروں کی جدید نسلیں مہاجر قوم پرستی کی تحریک سے بُری طرح متاثر ہیں۔

ہمارا مشاہدہ ہے کہ ایک زمانہ میں پشتون قومیت کا بہت شہرہ تھا اور قوم پرست پٹھان لیڈروں کی آواز پر پٹھان بہت آسانی سے جمع ہوجاتے تھے، لیکن پٹھان چونکہ محنت کش آبادی ہے، ان کا مفاد پورے پاکستان سے وابستہ ہے، اس لئے پشتون قوم پرستی کی تحریک پٹھان آبادی کو زیادہ دیر تک مسحور کرنے میں ناکام ثابت ہوئی۔

سندھی قوم پرستی کی تحریک اس اعتبار سے نظریاتی لٹریچر سے مالا مال ہے۔ اور اس کی پشت پر سندھ کے کلچرلی تقدس، سندھ دھرتی ماتا، ہندی تہذیب، جارحانہ سیکولرزم، جدلیاتی مادیت اور ترقی پسندی پر مشتمل لٹریچر کا انبار ہے، جو سندھی زبان میں پچھلے ستر سال میں تیار ہوا ہے۔

ہماری نظر میں پاکستان جیسے نظریاتی ملک میں قوم پرستی کی تحریکوں کے فروغ پذیر ہونے کا ایک بنیادی سبب یہ ہے کہ نظام تعلیم کو سیکولر بنیادوں پر تشکیل دیا گیا، جس سے اسلامی نظریہ (جو ہمارا ریاستی نظریہ ہے) اس سے نہ صرف یہ کہ حمیت ووابستگی کا تعلق پیدا نہ ہوسکا، بلکہ ذہن خالی رہا، خالی ذہن کو قوم پرستی جیسے دیو نے گھیر لیا۔

قوم پرستی جیسے نظریات کے فروغ پذیر ہونے کا دوسرا بنیادی سبب یہ ہے کہ ہمارے ہاں حکمرانوں اور بیوروکریسی میں ایسی بالغ نظر شخصیتیں معدوم رہیں، جو مختلف اہم قومیتوں کے صدیوں کے مزاج اور ان کی زبان اور علاقائی کلچر، ذہنیت اور ان کے مسائل کی نوعیت کو سمجھکر بہتر حکمت کے ساتھ ان کے کلچرلی وعلاقائی مسائل کے حل کی صورت پیدا کرتے، اس طرح انہیں قوم پرستی جیسے نظریات میں پناہ لینے پر مجبور نہ کرتے۔

بہرحال کچھ بھی ہو، قوم پرستی کی تحریک ہمارے ہاں یعنی سندھ میں طاقتور ہوچکی ہے۔ محض وقتی وہنگامی اقدامات سے اس کی روک تھام کی صورت ممکن نہیں۔ اس کے لئے

حکمت، بصیرت وفراست مومنہ کے ساتھ بہتر پالیسیوں کی تشکیل کی ضرورت ہے۔

ذیل میں ہم قومیت، قوم پروری اور قوم پرستی کے موضوع پر اپنا ایک پرانہ مضمون دے رہے ہیں۔ جو ۱۹۸۷ء میں ہماری سندھی کتاب میں شائع ہو چکا ہے۔

(۲)

قوم پرستی کی تحریک کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ آخر یہ تحریکیں کیوں پروان چڑھتی ہیں اور اس کے داخلی اور خارجی اسباب کیا ہیں۔ دوسرا قابل غور پہلو یہ ہے کہ آیا اسلامی دائرے میں قومیت اور قوم پروری کی گنجائش موجود ہے یا نہیں۔ نیز جدید نیشنلزم کیا ہے اور اس نے دنیا کو کیا دیا ہے؟ زیر نظر مضمون میں ہم اس موضوع کے کچھ پہلوؤں سے تفصیل سے گفتگو کرنے کی کوشش کریں گے۔

جہاں تک جائز قومیت اور لسانی اکائیوں کی روایات، آداب، رسوم ورواج زبانوں، انفرادی تشخص اور حدبندیوں کا تعلق ہے تو اس بارے میں یہ نکتہ واضح ہونا چاہئیے کہ اسلام نہ صرف یہ کہ قومیتوں کی ان حد بندیوں کو کھلے دل سے قبول کرتا ہے، بلکہ وہ ان کو خاص دائروں میں پروان چڑھانے کی ہر ممکن اجازت دیتا ہے۔ اس کی شہادت قرآن کی دو آیات سے بھی ملتی ہے۔

وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوباً وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا.

(تمہیں مختلف قبیلوں میں اس لئے تقسیم کیا ہے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔)

وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافُ أَلْسِنَتِكُمْ وَأَلْوَانِكُمْ.

(اور یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے کہ اس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا۔ اس طرح تمہیں مختلف رنگوں اور زبانوں میں پیدا کیا۔)

اس مسئلہ کو پوری طرح سمجھنے کے لیے عالم اسلام کے ممتاز اسلامی دانشوروں کے حوالہ جات پیش کرنا یہاں افادیت سے خالی نہ ہوگا۔

علامہ اقبال جو دور جدید کی نیشنلزم کے سب سے بڑے نقاد ہیں، وہ بھی جائز اور فطری قوم پروری کو پوری اہمیت دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں ''اگر قومیت کے معنی حب الوطنی اور ناموس وطن کے لئے جان قربان کرنے کے ہیں تو یہ اسلام کے خلاف نہیں۔ قومیت کا

اسلام سے اس وقت تصادم ہوتا ہے، جب وہ ایک سیاسی تصور بن جاتی ہے اور اتحادِ انسانی کا بنیادی اصول ہونے کا دعویٰ کرتی ہے اور یہ مطالبہ کرتی ہے کہ اسلام شخصی عقیدے کے پس منظر میں چلا جائے اور قومی زندگی میں ایک حیات بخش عنصر کی حیثیت سے باقی نہ رہے۔'' (حرف اقبال، طبع دوم صہ۱۷۲)

''وطن کا لفظ جو اس قول میں مستعمل ہوا ہے، محض ایک جغرافیائی اصطلاع ہے اور اس حیثیت سے اسلام سے متصادم نہیں ہوتا، اس کی حدود آج کچھ ہیں اور کل کچھ، کل تک اہل برما ہندوستانی تھے اور آج برمی ہیں۔ ان معنوں میں ہر انسان فطری طور پر اپنے جنم بھومی سے محبت رکھتا ہے اور بقدر اپنی بساط کے اس کے لئے قربانی کرنے کو تیار رہتا ہے، بعض نادان لوگ اس کی تائید کرتے ہوئے حب الوطن من الایمان کا مقولہ حدیث سمجھ کر پیش کرتے ہیں، حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں، کیونکہ وطن کی محبت انسان کا فطری جذبہ ہے۔ جس کی پرورش کے لئے اثرات کی کچھ ضرورت نہیں۔ مگر زمانۂ حال کے لٹریچر میں وطن کا مفہوم محض جغرافیائی نہیں، بلکہ وطن ایک اصول ہے۔ ہیئت اجتماعیت انسانیہ کا ایک قانون ہے، اس لئے حب وطن کو ایک سیاسی تصور کے طور پر استعمال کیا جائے تو وہ اسلام سے متصادم ہوتا ہے'' (مقالات اقبال صفحہ۲۲۳)

''تاریخ اسلام'' کے مصنف مولانا اکبر نجیب آبادی لکھتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جب نسلی تعلقات کے تقاضے بھی فطری ہیں تو پھر قبائلی یا نسلی محبت یا عصبیت کو کیسے مٹایا یا فنا کیا جا سکتا ہے؟ اس سوال کا جواب ذرا بھی مشکل نہیں۔ نسلی وقبائلی خصوصیت ومحبت ہرگز فنا نہیں ہونی چاہئیے۔ اس کا باقی رہنا ضروری ہے اور وہ مٹائی نہیں جا سکتی۔ لیکن وہ اس خصوصیت کے مقابلہ میں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق پیدا ہوتا ہے، ہرگز نہیں لائی جا سکتی۔ نسلی وقبائلی تعلق خدائی تعلق کی ضد ہرگز نہیں ہے، بلکہ خاندانی ونسلی تعلق خدائی تعلق کو سمجھنے کے لئے وہی مرتبہ رکھتا ہے، جو حروف تہجی کو عالم کو فاضل بننے کے لیے ہے کہ جب تک حروف، تہجی نہ سیکھے جائیں، کتاب خوانی کی نوبت نہیں آئیگی، نسلی وخاندانی، قبائلی وقومی خصوصیات اس وقت تک ضرور حاصل رہینگی، جب تک تعلقات ربی پر اثر انداز نہ ہوں۔ مثلا ہمارا حقیقی بھائی اور ایک غیر قوم کا شخص دونوں توحید باری تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار اور پرستار ہیں تو ہم مجبور ہیں کہ اپنے بھائی سے زیادہ محبت کریں،

لیکن اگر ہمارا حقیقی بھائی خدانخواستہ مشرک یا منکر خدا ہے اور دوسرا غیر قوم شخص موحد اور خدا پرست ہے تو اس کے مقابلہ میں ہمارا تعلق اس دوسری قوم کے شخص سے زیادہ ہوگا اور وہی ہم کو زیادہ عزیز ہونا چاہئیے۔''

مولانا مزید لکھتے ہیں۔ تمام نوع انسان ایک آدم کی اولاد ہیں۔ جس طرح ایک درخت کی شاخیں، شاخ درخشاں ہوکر بڑھتی اور پھیلتی ہیں، اسی طرح انسانی نسلیں قوموں، قبیلوں اور خاندانوں میں منقسم ہیں۔ فطرتِ انسانی کا تقاضا ہے کہ جس قدر قرابت اور رشتہ داری کا قریبی تعلق ہوتا ہے۔ اسی قدر ہمدردی اور محبت زیادہ ہوتی ہے، جوں جوں یہ تعلق بعید ہوتا جاتا ہے، محبت اور ہمدردی بھی کم ہوتی جاتی ہے۔'' (مقدمہ تاریخ ہند جلد دوم، مصنف مولانا اکبر نجیب آبادی)

مولانا محمد حنیف ندوی لکھتے ہیں۔ وحدت انسانیت کے سلسلے میں ایک اہم سوال ابھر کر یہ سامنے آتا ہے کہ کیا اسلام قومیتوں کے وجود کو تسلیم نہیں کرتا اور کیا ہر قوم وملک ان تہذیبی خصوصیات کو ماننے سے انکار کرتا ہے، جو تاریخ کے ناگزیر عمل سے معرضِ وجود میں آتی ہیں، کیا وحدتِ انسانیت کا مطلب یہ ہے کہ نہ صرف سب کی زبان ایک ہو، سب کی پوشاک یکساں ہو، بلکہ رسم و رواج کے معاملے میں بھی سب مسلمان ایک ہی اسلوب زیست کو اپنائیں اور اپنی علاقائی ومقامی خصوصیت تہذیبی سے بہرحال دست بردار ہوجائیں، اس سلسلے میں اختصار کے ساتھ یہ بات سمجھ لینا چاہئیے کہ اسلام نے وحدت انسانی کے پہلو بہ پہلو تہذیب وتمدن کی اس بوقلمونی اور رنگارنگی کو ماننے سے کبھی انکار نہیں کیا، جو ہر قوم کا طرۂ امتیاز ہے۔

اس تاریخی حقیقت کو کون نہیں جانتا کہ اسلام کے پرچم تلے دنیا کی جس قدر قوتیں جمع ہوئی ہیں، ماضی میں قبولیت وپذیرائی کی اس سے شاندار روایت کی کہیں نظیر نہیں ملتی۔ لیکن اس کے باوجود کسی جگہ بھی اسلام نے مختلف قوموں کی ان خصوصیات کو اپنانے میں بخل سے کام نہیں لیا، جس میں افادیت کا کوئی عنصر پایا جاتا تھا یا جن میں حسن وفن کی کوئی بھی خوبی تھی، مصر میں قبطیوں، مغرب اقصیٰ میں اقوام بربر، ایران میں عجمیوں اور ہندوستان میں رہنے والوں نے جب اسلام کو اپنی نجات وکامرانی کا ذریعہ مانا تو اپنے تہذیبی وجدان سے دست کش ہوکر نہیں، بلکہ اسلامی تہذیب میں ایک نیا رنگ بھر کر اور اس کے اصولی

روپ میں اپنی مخصوص تابنا کیوں کو اجاگر کر کے۔'' (اساسیات اسلام، صفحہ ۱۲۴، ۱۲۵)

اخوان المسلمین کے بانی حسن البناء اپنی کتاب ''ہماری دعوت'' میں لکھتے ہیں یہ بات کیسے کہی جاتی ہے کہ مصری قومیت کسی مسلم کے تقاضائے ایمان سے سازگار نہیں ہوسکتی! ہمیں فخر ہے کہ ہم اس وطن عزیز کے مخلص ہیں۔ اس کے لئے ہم تگ ودو کرتے ہیں اور جب تک ہمارے جسموں میں جان رہے گی، یہ جسم اس کے لئے وقف رہیں گے کیونکہ جو ترقی ہمیں مطلوب ہے، یہ اس کا پہلا زینہ ہے، وطن عربی ایک کل ہے اور اس کل کا یہ ایک جزو ہے۔ لہذا بہبود مصر کے لئے جو بھی جدوجہد ہوگی، وہ حقیقت میں عربیت، مشرقیت اور اسلام کے لئے ہوگی۔''

''اگر وطنیت کے ان علمبرداروں کے نزدیک وطنیت (اپنے علاقہ سے محبت) کی روح یہ ہے کہ وطن (علاقہ، سے محبت ہو، ہر ذرۂ وطن سے عشق ہو، طبیعت کو اس سے شفتگی اور انیست ہو، اس کے در ودیوار میں آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کا سکون ہو تو انہیں سمجھنا چاہئیے کہ حب وطن تو ہر انسان کی فطرت میں ہے اور اسلام نے ان جذبات کو ختم نہیں کیا بلکہ پروان چڑھایا ہے۔'' (اخوان المسلمون کا تربیتی نظام، صہ ۱۵۱)

اخوان المسلمون کے ایک اور دانشور عبدالبدیع صقر کہتے ہیں۔ اگر قومیت سے مراد اُس سرزمین کی محبت ہے، جہاں کوئی قوم رہتی اور بستی ہو تو یہ ایک مستحسن چیز ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ آدمی اپنے وطن خاص سے اس طرح محبت کرے، جو اسے اس کی طرف اپنی نسبت کرنا ہے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں، جب تک کہ کسی دوسری قوم پر ظلم وزیادتی نہ ہورہی ہو نیز یہ کہ اس جذبہ کی وجہ سے کوئی قوم کسی کی دشمن نہ بن جائے۔

اگر قومیت سے مراد زبان ہے تو اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ زبان آپس کے خیالات کے سمجھنے کا ایک اہم ذریعہ ہے اور اپنے ہم زبان سے محبت کرنا ایک فطری بات ہے لیکن اگر قومی فلسفہ کو اس لئے اپنایا جائے کہ اس سے اسلام اور عالم اسلام کو نقصان پہنچے اور مسلم قوم کو اس کے عظیم الشان مقصد سے ہٹا کر ایک محدود مقصد کی طرف لے آیا جائے تو یہ غلط ہے۔'' (''ہم دعوت کا کام کیسے کریں'' صفحہ ۱۴۱)

پاکستان کے ممتاز عالم مولانا محمد طاسین صاحب لکھتے ہیں۔

پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کے مشہور خطبۂ حجتہ الوداع کے الفاظ کو غور سے پڑھئے تو

ان سے نسل، وطن، رنگ اور زبان کی بنیاد پر پیدا ہونے والی قدرتی تنظیموں کی نفی نہیں ہوتی یعنی ان سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ عربی وعجمی اور گورے وکالے کی انسانوں کے اندر جو تقسیم ہے، وہ سرے سے غلط وباطل ہے، لہٰذا اسے مٹا دینا چاہئیے بلکہ ان سے جو ثابت ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ یہ امتیازات وجہ فضیلت نہیں۔ وجہ فضیلت صرف تقویٰ ہے۔

''نسب وقرابت کی بناء پر وجود میں آنے والے خاندانی اداروں کو قرآن مجید اپنے مجوزہ انسانی معاشرے میں ہمیشہ قائم رکھنا چاہتا ہے، اس کا ثبوت قرآن مجید کی ان آیات سے فراہم ہوتا ہے، جو خاندان اور اس کے مختلف امور مسائل سے تعلق رکھتی ہیں نہ صرف خاندان کے قیام سے بلکہ اس کے استحکام اور اس کی خوشگواری سے بھی تعلق رکھتی ہیں۔ عائلی مسائل سے قرآن مجید کی جو غیر معمولی دلچسپی ہے، اس سے ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خاندانی اداروں کو اپنے مجوزہ معاشرے میں وہ حیثیت دیتا ہے، جو کسی عمارت کے اندر اینٹوں کی ہوتی ہے، جس طرح عمارت کی پختگی کے لئے اینٹوں کی پختگی ضروری ہوتی ہے اسی طرح اسلام اپنے معاشرہ کے لئے خاندانی اداروں کو مضبوط تر بنانا چاہتا ہے۔''

ان اقتباسات میں قومیت کی جن چیزوں کا اثبات وجواز موجود ہے، وہ فطری نوعیت کی چیزیں ہیں، لیکن جدید قوم پرستی پرانی نسلی عصبیت کی طرح کوئی قبائلی اور نسلی تصادم کی نئی شکل نہیں ہے، بلکہ یہ قوم پرستی زبان، علاقائی حیثیت اور دھرتی کے تقدس اور صدیوں کے تہذیبی وکلچرلی امتیاز کی بنیاد پر جداگانہ وطن کی علمبردار ہے۔ جہاں اس وطن کی دھرتی، اور اس کی چیزوں کی پرستش کی جا سکے اور اسے معبود قرار دیا جا سکے اور اس کے نام پر دین وایمان کی قربانیاں دی جا سکیں۔

(۳)

یورپ میں قوم پرستی کا بیج جس شخص نے بویا تھا، وہ اٹلی کا مشہور مفکر میکاولی تھا، جو ۱۴۴۹ء میں پیدا ہوا اور ۱۵۲۷ء میں فوت ہوا۔ میکاولی کے ذہن میں قومیت کے تصور نے کیونکر جنم لیا؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے مشہور مصنف پروفیسر سبین اپنی کتاب ''سیاسی نظریہ کی تاریخ'' میں لکھتے ہیں:

''میکاولی کے کتاب لکھنے کے وقت (۱۴۹۲ء میں) اٹلی پانچ ریاستوں میں منقسم تھا

جنوب میں نیلسن کی بادشاہت تھی تو شمال مغرب میں میلان کی، مشرق میں حکومت تھی اور درمیان میں فلورنس اور پاپائی کی ریاستیں موجود تھیں۔ ۱۵۱۲ء میں فلورنس کی حکومت زوال کا شکار ہوگئی۔ چونکہ اٹلی میں مضبوط حکومت موجود نہیں تھی، اس لئے اٹلی انتشار اور عدم استحکام کا شکار ہوگیا۔ میکاولی نے اس صورتحال کا ذمہ دار پوپ حضرات کو قرار دیا۔ چونکہ پانچ ریاستوں میں منقسم ہونے کی وجہ سے ملک کی سلامتی کو نقصان پہنچ رہا تھا، اس لئے میکاولی نے ایک مضبوط اقتدار کے لئے کوششیں شروع کردیں۔ دراصل میکاولی میں قوم پرستی کے جذبات بیرونی مداخلت کرنے والوں کی وجہ سے پیدا ہوئے۔'' (''سیاسی نظریہ کی تاریخ مصنف پروفیسر سبین صہ۳۳۶، آکسفورڈ پریس)

میکاولی ہی کی طرح اٹلی ہی کے مسولینی نے اٹلی میں قوم پرستی کی تحریک کو منظم کرنے کی کوشش کی۔ مسولینی نے اپنے ملک کے ایک دوسرے فرد ''کوسوتھ'' کے ساتھ مل کر اس فکر کو مذہب کی حیثیت دی۔ ۱۸۳۱ء میں مسولینی نے اٹلی کے نوجوانوں کی ایک باقاعدہ تنظیم قائم کی، جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ لوگوں میں قومی تاریخی شعور پیدا کریں۔ مسولینی کا موقف یہ تھا کہ ماضی کی تکالیف اور شان وشوکت قوم کی روح کو بیدار کرنے کا باعث ہوتے ہیں۔ اپنے موقف کی وضاحت کے لئے اس نے ''آدمی کے فرائض'' نام سے ایک کتاب لکھی۔

جرمنی میں قوم پرستی کے حق میں جن مفکروں نے میدان ہموار کیا، ان میں نٹشے اور ہیگل کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ فرانسیسی مفکر گومینز اور انگریز مصنف سٹیوراٹ نے بھی آریہ نسل کی برتری کے لئے بہت سی کتابیں لکھیں۔ قوم پرستی کے حق میں لکھی گئی ان کتابوں سے انیسویں صدی کے آغاز میں جو لوگ متاثر ہوئے، ان میں ہٹلر کا نام سرفہرست ہے۔ ہٹلر نے اپنے اسکول کے زمانہ میں ہی ان کتابوں کا مطالعہ کرلیا تھا۔ اس مطالعہ سے اس کے ذہن میں یہ بات رچ بس گئی تھی کہ دنیا کی بہترین اور ذہین قوم آریائی نسل ہے اور سامی نسل کے لوگ ملعون، ناپاک اور قابل گردن زونی ہیں۔ ۱۹۲۴ء میں ہٹلر اپنے ایک ساتھی توڈراف کے ساتھ گرفتار ہوا۔ جیل میں اس نے ''میری جدوجہد'' کے نام سے ایک کتاب لکھی، اس کتاب میں اس نے جذباتی انداز میں جرمنی کی آریائی نسل کی برتری اور اسے تقدس ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور غیرآریائی قوموں کے

خلاف بہت زیادہ زہر اگلا ہے۔ ہٹلر کے نزدیک حق وباطل کا اصل معیار آریہ نسل ہی تھا۔ اس کا موقف یہ ہے کہ دنیا پر حکومت کرنے کا حق جرمنی کی آریہ نسل کو ہی ہے۔ ہٹلر کو جب حکومت حاصل ہوئی تو اپنے دور حکومت میں (یعنی ۱۹۳۳ء سے ۱۹۴۵ء تک) اس نے نسل پرستی (نسل پرستی دراصل قوم پرستی ہی کا شاخسانہ ہے) کی بنیاد پر یہودیوں کا قتل شروع کردیا۔ یہ کام اس نے اپنے وزراء گوئیلز ہیمہ یورمن کے ذریعے کیا۔ اس قتل میں محتاط اندازے کے مطابق چالیس لاکھ یہودی مارے گئے۔ دراصل اس قتل عام کے ذریعے ہٹلر یہودیوں کا خاتمہ کرنا چاہتا تھا، صرف اس لئے کہ اس کی نگاہوں میں یہودی اس کی نسل کی برتری کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھے۔ ہٹلر اور اس کی نازی پارٹی نے نہ صرف دوسری قوموں کا قتل عام کیا، بلکہ اس نے بڑے پیمانے پر غیرآریائی مفکروں اور مصنفوں کی کتابوں کو بھی نذر آتش کیا۔ اس ضمن میں ہم یہاں مشہور مصنف ولیم ایل مور کی نازی جرمنی کی تاریخ سے متعلق کتاب The Rise and Fall of the third reich کا حوالہ دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ ولیم شور لکھتے ہیں:

''ہٹلر کے چانسلر بن جانے کے ساڑھے چار ماہ بعد ۱۰ مئی ۱۹۳۳ء کی شام کو برلن میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا، جس کی مثال مغربی دنیا کے قرون وسطے سے لے کر اب تک نہیں ملتی۔ آدھی رات کو ہزاروں طلبا کی ایک مشعل بردار پریڈ برلن یونیورسٹی کے سامنے انٹرڈین لنڈین چوراہے پر مکمل ہوئی۔ وہ مشعلیں کتابوں کے پہلے سے جمع شدہ ایک ڈھیر پر پھینکیں گئیں اور جوں جوں کتابوں سے آگ کے شعلے بڑھکتے، اس ڈھیر پر مزید کتابیں ڈالی جاتیں رہیں۔ یہاں تک کہ بیس ہزار کتابیں نذر آتش ہوگئیں۔ کتابیں جلانے کے اس طرح کے واقعات جرمنی کے دوسرے شہروں میں بھی دہرائے گئے۔''

مسٹر شور نے کچھ مشہور مصنفوں کے نام بھی دیئے ہیں، جن کی کتابیں جلائی گئیں۔ ان میں مشہور سائنسدان آئن اسٹائن کی کتابیں بھی شامل تھیں۔ مسٹر شور لکھتے ہیں ''یہ قسمت کی ستم ظریفی ہے کہ امریکہ میں (ایٹم) بم کی ایجاد کا سہرا زیادہ تر دو سائنسدانوں کے سر ہے۔ ان میں ایک جرمنی کے آئن اسٹائن تھے اور دوسرے اٹلی کے فرمی۔ ان دونوں سائنسدانوں کو نسل پرستی کی بنیاد پر نازی اور فاشی ڈکٹیٹر نے جلاوطن کردیا تھا۔''

(۴)

نیشنلزم نے انسانیت کو جو نقصان پہنچایا ہے اس کا اندازہ دو عالمگیر جنگوں میں ہونے والے نقصانات سے لگایا جا سکتا ہے۔ یہ بات تو سب کو معلوم ہے کہ دو عالمگیر جنگیں اس لئے ہوئی تھیں کہ بڑی طاقتوں کی چھوٹے ملکوں اور ان کے وسائل سے استفادے اور تسلط کے لئے باہمی مفاہمت ختم ہوگئی تھی اور ہر طاقتور قوم نے اپنے قومی مفاد کی خاطر جنگ کو قومیتی جنگ کی صورت دیدی تھیں۔ پہلی اور دوسری عالمگیر جنگ میں جو ہولناک تباہی ہوئی اس کے اعداد وشمار درج ذیل ہیں۔

پہلی جنگ عظیم		دوسری جنگ عظیم	
روس	۱۷ لاکھ	روس	۷۵ لاکھ
جرمن	۱۷ لاکھ	جرمنی	۳۵ لاکھ
فرانس	۱۴ لاکھ	فرانس	۲ لاکھ
برطانیہ	۹ لاکھ	امریکہ	۳ لاکھ
بلغاریہ	۱۰ لاکھ	جاپان	۱۲ لاکھ
آسٹریا ہنگری	۱۲ لاکھ	چین	۲۲ لاکھ
امریکہ	ایک لاکھ ۳۶ ہزار	برطانیہ	۲ لاکھ ۵۰ ہزار
سریا	۳ لاکھ	ہنگری	ایک لاکھ ۵۰ ہزار

جدید نیشنلزم نے دنیا کو جس فساد انگیز صورتحال سے دوچار کر دیا ہے، اس سے مغربی دنیا کے دانشور اور فلاسفر چیخ اٹھے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر نیشنلزم کے شیطان کا سرغرور نہ توڑا گیا اور ابلاغ کے ذریعہ انسانیت نوازی کی تعلیم نہ دی گئی تو نیشنلزم، انسانیت کو تقسیم در تقسیم کر کے تباہ کر دیگی۔

ہم عبرت ونصیحت کی خاطر چند مغربی فلاسفروں اور دانشوروں کے اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ سب سے پہلے ممتاز مغربی فلاسفر برٹرنیڈ رسل کے کچھ اہم حوالہ جات ملاحظہ ہوں:

''تمام مغربی ملکوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کو سکھایا جاتا ہے کہ ان کی سماجی وفاداری

ووابستگی سب سے زیادہ ریاست کے ساتھ ہونی چاہئیے۔ وہ ریاست جس کے وہ شہری ہیں، اور ریاست کی طرف سے ان پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ حکومت جیسا کہے، ویسا ہی کیا جائے۔ اس خیال سے کہ شاید ریاست کے اس مطالبہ پر اعتراض کیا جائے، انہیں تاریخ، سیاست اور اقتصادیات کی غلط تعلیم دی جاتی ہے اور انہیں دوسرے ملکوں کے عیب بتائے جاتے ہیں اور سمجھایا جاتا ہے کہ وہ لڑائیاں جس میں ان ریاستوں نے خود حصہ لیا ہے، وہ دفاعی نوعیت کی تھیں، لیکن دوسرے ملکوں کی لڑائیاں دفاعی نہیں بلکہ جارحانہ تھیں۔ انہیں ذہن نشین کرایا جاتا ہے کہ جب ان کا ملک کسی دوسرے ملک کو مفتوح کرتا ہے تو اس کا مقصد تمدن کی ترقی، انجیل کی روشنی، بہتر اخلاق کی تقویت اور نشہ آور چیزوں کا خاتمہ وغیرہ ہوتا ہے، انہیں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ دوسرے ملکوں کے ہاں اخلاق کی کوئی کسوٹی موجود نہیں۔ (معاشرہ اور تعلیم، صفحہ ۱۰۶، ۱۰۷)

''چونکہ قوم پرستی پھیلانے میں سرمایہ داروں اور صنعتکاروں کا بڑا ہاتھ ہے، اس لئے کہ قوم کی یک جہتی، اتحاد اور ریاست کی بہتری اور فروغ کے لیے قربانی قوم پرستی کے جذبے کی بدولت ہی دی جا سکتی ہے۔ اس طرح سرمایہ داروں اور صنعتکاروں کو دوسری قوموں کی منڈیاں مل جاتی ہیں، اس لئے سرمایہ دار طبقہ مختلف طریقوں سے قوم پرستی کے جذبہ کو بڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ پبلسٹی کے ذرائع سے بھی کام لیتا ہے تو دوسرے طریقے بھی اختیار کرتا ہے۔ غرض کہ وہ کروڑہا روپے خرچ کرتا ہے۔

نیشنلزم ذاتی ملکیت سے گہرا تعلق رکھتا ہے، اگرچہ اس کے دوسرے اسباب بھی ہیں۔ سرمایہ دار کے نقطہ نگاہ سے پسماندہ ملک دو اسباب کی وجہ سے اس کے لئے منافع بخش ہیں۔ ایک مال کی کھپت اور منڈی کی حیثیت سے، دوم خام مال کے حصول کے لئے۔ پسماندہ ملک جب سرمایہ دار ملکوں کے زیر تسلط ہوتے ہیں، اس وقت وہ ان کے لئے زیادہ مفید ثابت ہوتے ہیں۔ فرانسیسی دولت کے لئے افریقہ، امریکی دولت کیلئے وسط امریکہ، انگریزی سرمائے کیلئے ہندوستان بہترین مراکز ہیں۔ اسی طرح جو شخص اپنے وطن سے باہر سرمایہ لگاتا ہے، اسے علاقائی لحاظ سے نہ سہی، معاشی لحاظ سے ضرور شہنشاہیت سے دلچسپی ہوتی ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ اگر قومیت کی موزوں تبلیغ کی جائے تو اس کے

اخراجات کا کافی حصہ ٹیکس دینے والوں کے سر تھونپا جا سکتا ہے۔ طاقتور قوموں کے قومی جذبہ نیشنلزم کا اصل سبب یہی ہوتا ہے، عام شہری جو قوم پرستی کے نشہ میں چور ہوتا ہے، وہ بیچارہ (سرمایہ داروں) کے ان ناپاک ارادوں سے لاعلم ہوتا ہے۔ جن کی کوششوں سے وہ اس بیماری کا شکار ہوتا ہے، (نظام تعلیم اور معاشرہ، مصنف برٹرینڈ رسل صفحہ ۱۷۷ مترجم جی آر عزیز)

''قوم پرستی کا جذبہ ایک ہسٹریائی مرض ہے جس میں بدقسمتی سے لوگ مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ہسٹریا کی اس کیفیت سے بچنے کے لئے لوگوں کو اخلاقی اور ذہنی طور پر مستحکم کرنے کی ضرورت ہے۔ قوم پرستی ہمارے دور کی سب سے خطرناک برائی ہے۔ جو شراب نوشی اور بددیانتی جیسی خرابیوں سے بھی سے زیادہ بُری ہے۔ قوم پرستی کی وجہ سے ہماری تہذیب خطرے میں مبتلا ہوگئی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ہر جگہ دولت کو اس تباہ کن بُرائی کی اشاعت اور پروان چڑھانے کے لئے خرچ کیا جارہا ہے، جب تک قوم پرستی کا زہر کم نہیں ہوتا، تب تک تمدن کے باقی رہنے کی ضمانت نہیں دیجا سکتی۔

قوم پرستی کی تعلیم پر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ جس ادارے میں افراد کو انسانوں کے قتل کی تعلیم دی جاتی ہے، اس ادارے میں مہذب انسانی مقاصد کی تعلیم دینا بے حد مشکل ہے۔ اس پر تیسرا اعتراض یہ ہے کہ نفرت کی تعلیم جو قوم پرستی کا لازمی حصہ اور نتیجہ ہے، وہ بذات خود ایک خراب چیز ہے۔ لیکن ان اعتراضوں کے ساتھ ساتھ قوم پرستانہ تعلیم کے خلاف ایک خالص عقلی اعتراض بھی ہے، یعنی قومیت کی تعلیم کئی غلط سلط اور واہیات باتوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ دنیا کے ہر ملک میں بچوں کو پڑھایا جاتا ہے کہ ان کا ملک ایک بہترین ملک ہے، ظاہر ہے کہ یہ بات سوائے ایک ملک کے باقی تمام ملکوں کے بارے میں غلط ہے۔ چونکہ مختلف قومیں اس بات پر متفق نہیں ہوسکتیں کہ آخر وہ کونسا ملک ہے جو بہترین ہو، باقی دوسرے سب بیکار اور خراب ہیں۔ اس لئے بہتر یہ ہوگا کہ دوسرے ملکوں کو ذلیل کرنے اور اپنی قوم کی خوبیوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کی روش ترک کر دیجائے۔ بدقسمتی سے ہماری موجودہ نئی نسل میں نیک لوگ کاہل اور سست ہیں جب کہ بُرے لوگ تیز تر ہیں۔ (مذکورہ کتاب صفحہ ۱۱۱)

اپنی کتاب THe Criss of Civilis Ation میں لکھتا ہے۔

''قومیت پرستی کا احساس نفرت سے پیدا ہوتا ہے اور مدارت پر ورش پاتا ہے۔ ایک قوم کو اپنی ہستی کا احساس ہی اس وقت ہوتا ہے جب وہ کسی دوسری قوم سے متصادم ہو۔ پھر ان اقوام کا جذبۂ پیکار اپنی قومی وحدت کی تکمیل پر ہی ختم نہیں ہوجاتا۔ جوں ہی کوئی قوم اپنے حق استقلال وخودمختاری کو مسلط کرلیتی ہے تو پھر ان اقوام کو دبانا شروع کردیتی ہے جو اپنے لئے خودمختاری کی مدعی ہوں ان تمام وجوہات کی بناء پر اس نتیجہ پر پہنچا جائے گا کہ کسی نظامِ حکومت کے لئے قومیت پرستی کی بنیاد بڑی ہی خطرناک ہے۔ (صفحہ ۱۶۶)

(Pillsburs) اس باب میں لکھتا ہے، قومیت کی تشکیل اور جامعیت میں سب سے مؤثر جذبہ نفرت کا ہے۔ اور تاریخ بتاتی ہے کہ قریب قریب تمام قومیں بڑی بڑی لڑائیوں یا دوسری قوموں سے طویل مخاصمت کی پیدا کردہ ہیں۔ (Pillsburg-P-83)

فلسفۂ اجتماعیات کا عالم، پروفیسر Will lam Brend

اپنی کتاب Foundation of Human conflicts کے مقدمہ میں (۱۹۴۴ء میں) لکھتا ہے۔ اغلب یہی ہے کہ موجودہ جنگ کے بعد اقوام یورپ چند سال تک عملی نبرد آزمائی میں نہ الجھیں گے، کیونکہ ان میں سے بعض تو بہت تھکی ہوئی ہوں گی اور بعض کو ان کے فاتحین دبا کر رکھیں گے، لیکن قومیت پرستی (Nationalrsm) یعنی وہ جذبہ جو جنگ کا اصلی ذمہ دار ہے باقی رہے گا۔ اس لئے مستقبل میں جنگ (کے امکانات) کو ختم کرنے کے لئے آج کی سیاست دانی کی پرکھ اسی سے ہوگی کہ موجودہ جنگ کے بعد قومیت پرستی کے اس جذبہ کے متعلق کیا تدابیر اختیار کی جاتی ہیں۔''

یہی پروفیسر مزید لکھتا ہے۔ آج ایک براعظم کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک زرخیز کھیت ہے، جس میں انسانوں نے نہایت نامعقولیت سے دیواریں کھڑی کر رکھی ہیں۔ یعنی وادیوں کے اطراف وجوانب، سڑکیں دریا وغیرہ جن کا مصرف اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ انہوں نے ایک گروہ کو دوسرے سے الگ کر رکھا ہے۔ اور جذبۂ وطنیت وہ سیمنٹ ہے جو ان زندہ اینٹوں کو باہمدگر مربوط کئے ہے، جس سے انسان خود ساختہ جیل خانوں میں محبوس

ہیں۔ (صفحہ۵۷)

''وطنیت کا جذبہ اتحاد انسانی کے راستہ میں سب سے بڑا پتھر ہے ..... انسان کے سامنے دو ہی راستے ہیں یا تو یہ کہ وہ اپنی قومیت کو قائم رکھے۔ اور اس طرح دنیا میں جنگ کا سلسلہ جاری رہے اور یا کسی قسم کے بین الاقوامی اتحاد کا راستہ اختیار کرے۔ (صفحہ۷۵)

تاریخ قومیت کا عالم (Fredrick Hertz) اپنی کتاب۔

Nationality in History and Politics میں رقمطراز ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ مختلف اقوام میں باہمی لڑائیوں کا سبب اس کے سوا شاید ہی کچھ اور ہو کہ یہ قومیں انسانوں کی مختلف جماعتیں تھیں، جنہوں نے اپنے اپنے الگ نام رکھ لئے تھے (اسی کا نتیجہ ہے کہ) ایک انگریز کے نزدیک کسی فرانسیسی، ہسپانوی یا اطالوی کا نام نفرت اور تحقیر کا خیال پیدا کرتا ہے۔ لیکن خالی انسان کا لفظ اگر اس کا اطلاق صحیح طور پر کیا جائے، جذبۂ احترام پیدا کرنے میں کبھی ناکام نہیں رہتا۔ (صفحہ۳۲۸)

برٹرینڈ رسل اپنی کتاب (THe State of the world) میں لکھتا ہے۔

مسئلہ کس قدر پیچیدہ کیوں ہو۔ یہ واقعہ ہے کہ ہمارے دور کی دونوں عالمگیر لڑائیاں نیشنلزم کی پیدا کردہ ہیں۔ اور یہی چیز ہمارے زمانہ میں سب سے بڑی سیاسی قوت ہے۔ ان دونوں لڑائیوں کی تہہ میں وہی اصول کارفرما تھا، جس کی رُو سے دنیا کو آزاد قومی مملکتوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور جس کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ مختلف مملکتیں ایک دوسرے سے بڑھنے کی فکر کرتی رہیں اور اس طرح ایک دوسرے سے برسرپیکار ہیں۔ ان حالات میں کبھی صالح معاشرتی نظام قائم ہی نہیں ہوسکتا۔ یہی نہیں کہ یہ دو عالمگیر لڑائیاں کیوں ہوگئیں، رونا تو اس بات کا ہے کہ جب دنیا میں جنگ نہیں ہورہی ہوتی اُس وقت بھی امن قائم نہیں ہوتا۔'' (صفحہ۱۲۔۱۱)

''نیشنلزم انسانی تاریخ میں سب سے بڑا مفسدہ ہے اس لئے کہ اس سے پہلے کوئی فسادِ انسانیت نہ عالمگیر ہوا کرتا تھا نہ انسانی زندگی پر محیط کلی۔''

برٹرنڈ رسل (THe Hope fora chang world 1953) میں لکھتا ہے۔ ہمارے زمانہ میں جو چیز معاشرتی روابط کو قومی حدود سے آگے بڑھانے میں مانع

ہے، وہ نیشنلزم ہے۔ اس لئے نیشنلزم نوع انسانی کی تباہی کے لئے سب سے بڑی قوت ہے۔ پھر تماشا یہ ہے کہ ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ دوسرے ملکوں کی نیشنلزم بڑی خراب چیز ہے لیکن اس کے اپنے وطن کی نیشنلزم بڑی اچھی چیز ہے۔

(Aldous Huxley) اپنی کتاب۔ (The perennial PhilosoPhy)

میں لکھتا ہے۔ نیشنلزم ایک بُت پرستانہ، مشرکانہ مذہب کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ ایسا مذہب جو فساد اور تفریق انسانیت کے لئے ایسا طاقت ور ہے کہ کوئی توحید پرست مذہب فلاح ووحدتِ انسانیت کے لئے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ نیشنلزم یا نسل پرستی کا جذبہ بالکل پاگلوں کا مسلک ہے۔ (صفحہ۱۸۴۔۲۰۳)

وہ اپنی دوسری کتاب (Science, Liberty and Peace)

میں لکھتا ہے ''لارڈ ایکٹن نے ۱۸۸۲ء میں لکھا تھا کہ نیشنلزم کا مقصود آزادی یا خوش حالی نہیں، اس کے نزدیک مملکت ہی تمام مقاصد کا معیار ہوتی ہے، اس لئے وہ مملکت کی خاطر سب کچھ قربان کر دیتی ہے۔ اس لئے اس کا انجام مادی، اخلاقی ہر قسم کی تباہی ہوگا۔ ایکٹن کی یہ پیشن گوئی کس طرح پوری ہوتی چلی جارہی ہے؟ نیشنلزم نے جس قدر مادی نقصان پہنچایا ہے، اس کی تلافی شاید پوری کی پوری نسل بھی نہ کر سکے۔ باقی رہی اخلاقی تباہی، سو یہ تباہی لاکھوں مردوں، عورتوں، بالخصوص بچوں کے لئے ناقابل تلافی ہے۔ نیشنلزم کی طرف سے جسے ہم نے وحدت انسانیت اور خدا کے عقیدہ کو چھوڑ کر، ایک بُت پرستانہ مذہب کی حیثیت سے اختیار کر رکھا ہے۔ ہمیں صرف یہی دو تحفے نہیں ملے۔ اس کی وجہ سے ساری دنیا قریب پچاس ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکی ہے، جنہیں اقوام عالم کہا جاتا ہے، ان میں سے ہر قوم کا ''مملکتی مذہب'' ہے یعنی خدا کے بجائے قوم کی پرستش، جسے اقدار کا مظہر سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا ان پچاس دیوتاؤں میں سے ایک دیوتا کا پُجاری باقی انچاس پجاریوں کو ملیش تصور کرتا ہے۔ نیشنلزم اخلاق کی تباہی کا باعث اس طرح بنتی ہے کہ اس کی رو سے عالمگیر انسانیت، خدائے واحد اور احترام آدمیت کے تمام عقائد باطل قرار پاجاتے ہیں اور اُن کے بجائے علیحدگی، تکبر، انانیت، خود اکتفائیت کے عقائد پیدا ہوجاتے ہیں، جن کا نتیجہ نفرت اور جنگ کا جواز ہی نہیں بلکہ وجوب ہوتا ہے۔''

ہکسلے، اپنی ایک کتاب (End and Means) میں لکھتا ہے، ہر نیشنلزم ایک بُت پرستانہ مذہب ہے جس میں مملکت نے خدا کی حیثیت اختیار کر رکھی ہے ..... یہ خدا بڑے سخت فرائض عائد کرتا ہے اور بڑی عظیم قربانیاں مانگتا ہے۔ چونکہ نوع انسانی کے دل میں نیکی کی تڑپ ہے اس لئے وہ اس خدا کی پرستار بن جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کی پرستش کی ایک وجہ اور بھی ہے اور وہ یہ کہ اس سے انسان کے اسفل جذبات کی تسکین ہوجاتی ہے۔ نفرت اور دشمنی کے جذبات کی تسکین نیز جرائم کی لذت۔''

''لیگ آف نیشنز نے ''قوم'' کی جو تعریف متعین کی ہے، اس کی رُو سے قوم کے معنی ہیں ''ایسی سوسائٹی جسے جنگ کے لئے منظّم کیا جائے۔'' (جہاں تک اخلاق کا تعلق ہے) اس باب میں کمیونسٹ ہوں یا نازی، فاشسٹ ہوں یا عام نیشنلسٹ، سب یکساں ہیں، سب کا ایمان یہ ہے کہ حصول مقصد کے لئے ہر قسم کا ذریعہ اختیار کرلینا جائز ہے اور سب کے نزدیک ''مقصد'' سے مراد ہے، انسانوں کے ایک گروپ کا دوسرے گروپ پر غلبہ وتسلط۔ اس غلبہ وتسلط کے لئے ہر قسم کا تشدد اور فریب جائز ہے۔ یہ سب یہی وعظ کہتے ہیں کہ ہر فرد کو اپنا سب کچھ اسٹیٹ کے سپرد کردینا چاہئیے۔''

نیشنلزم کے متعلق ڈین انج لکھتا ہے ''ہمارے سامنے ایک باطل مذہب ہے یعنی مذہب نیشنلزم۔ یہ مذہب، لامذہبیت سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔''

مزید لکھتا ہے: یورپ کو اس تباہی سے کچھ نہیں بچا سکتا، سوائے اس کے کہ یہ پھر ہوش میں آجائے (اور نیشنلزم کی لعنت کو چھوڑ دے) ورنہ اگر اقوام کے فیصلوں پر یہ بھوت اسی طرح سوار بنا تو مستقبل بڑا تاریک اور پُر خطر نظر آتا ہے۔ (صفحہ ۲۰۰)

ہرٹز لکھتا ہے: دور حاضرہ کی قومیت پرستی، مذہب کے باب میں اپنے آپ کو عجیب الجھن میں پاتی ہے۔ ایک طرف اس کی یہ حالت ہے کہ وہ اپنے متبعین کے جذبۂ اطاعت ووفاکیشی کو خدا اور قوم کے درمیان بانٹنے کے لئے تیار نہیں۔ یہ قوم کو ایک بت بناتی ہے اور قومیت پرستی کو خود مذہب کی حیثیت دیتی ہے۔ لیکن (دوسری طرف) نیشنلسٹ طبقہ میں اتنی جرأت بھی نہیں کہ وہ اپنی مذہب دشمنی کا اظہار کھلے بندوں کریں، کیونکہ اس سے ان کے بہت سے متبعین کے جذبات کے مجروح ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ (صفحہ ۱۲۱)

(J.M.Murray) اپنی کتاب (adam and Eve) میں لکھتا ہے چونکہ انسانوں کے دل سے خدا کا عقیدہ نکل گیا ہے، اس لئے اس خالی مکان پر نیشنلزم کے شیطان نے قبضہ کرلیا ہے۔ اب انسانوں کو ایک ایسے مذہب کی ضرورت ہے جو نیشنلزم کے جذبہ پر غالب آسکے۔ (صفحہ ۶۶۔۶۱)

امریکہ کا مشہور مورخ (Georgea. Dorsey)

اپنی کتاب (Civi Lisation) کا خاتمہ ان الفاظ پر کرتا ہے میں خوش ہوں کہ میں زندہ ہوں مجھے امریکی ہونے پر فخر ہے، لیکن مجھے اس سے بھی زیادہ فخر ایک انسان ہونے پر ہے (اس لئے کہ) آج ہماری قومیت پرستی، نوع انسانی کی بدترین دشمن اور تہذیب کے لئے شدید خطرہ ہے۔ (صفحہ ۹۵۸)

یورپ نے دوسری جنگ عظیم کے بعد نیشنلزم کی تباہ کاریوں سے بہت کچھ سیکھا ہے، اب یورپ متحدہ طاقتور کی حیثیت اختیار کرتا جارہا ہے۔

چنانچہ یورپی یونین کے تحت سارے یورپی ملکوں کی خارجہ پالیسی ایک ہے۔ یورو کے نام سے کرنسی ایک ہے، ان سارے ملکوں میں رہنے والے مقامی افراد کے لئے دوسرے ملکوں میں رہنے اور ملازمت اختیار کرنے کے لئے ویزا کی پابندی ختم ہے۔

لیکن یورپ کے برعکس ہماری حالت یہ ہے کہ اسلام کی ملت واحدہ کی تعلیم کے باوجود ہم قوم پرستی کے بت کی پوجا میں مصروف ہیں۔ اور ہم اپنے دین سے نہیں تو دنیا کے تجربات سے بھی سیکھنے کے لئے تیار ہیں۔ **(ماخوذ ''بیداری'' جون ۲۰۱۵ء)**

جماعت اسلامی کی جدوجہد

فکر اور حکمت عملی پر ایک نظر

(ایک سوال نامہ کے جواب میں)

(۱)

پاکستان کو قیام پاکستان کے وقت سے جو چیلنج درپیش رہے ہیں، ان میں سب سے بڑا چیلنج یہ ہے کہ عالمی سامراج، پاکستان کی ملت اسلامیہ کا رشتہ اسلام اور اسلامی تہذیب سے توڑ کر، مغربی تہذیب (جو مادر پدر آزاد اور خالص مادہ پرست تہذیب ہے) سے جوڑنا چاہتا ہے۔ اس مقصد کے لئے عالمی سامراج نے ابتدا میں یہ کام کمزور جمہوریت سے لینا چاہا، اس کے بعد فوجی آمریت کا راج قائم کرکے، اس کو آلہ کار کے طور پر استعمال کرنا چاہا، جب فوجی آمریت متزلزل ہونے لگی تو جمہوریت کے ذریعہ یہ مقصد حاصل کرنا چاہا، اس طرح کبھی فوجی آمریت تو کبھی جمہوریت کے ذریعہ اشرافیہ کو وہ آگے بڑھاتا رہا۔

اس بار الیکشن کے ذریعہ وہ ن لیگ کی حکومت کو مادہ پرست سرمایہ دارانہ نظام اور اس کی تہذیب کے فروغ کے لئے استعمال کرنا چاہتا ہے۔

پاکستان میں جس جماعت کو پہلے ہی دن سے عالمی سامراج کے ان مقاصد اور اس کی حکمت عملیوں کا پوری طرح شعور حاصل تھا، وہ جماعت اسلامی ہے۔ جماعت اسلامی کی شروع سے کوشش یہ تھی کہ اسے معاشرہ سے جو بھی قوت حاصل ہے، اس قوت کے ذریعہ وہ عالمی سامراج کی اس کوشش کو ناکام بنائے۔ چونکہ جماعت اسلامی فکری، علمی اور نظریاتی نوعیت کی تحریک تھی اور اس سے زیادہ تر جدید تعلیم یافتہ افراد ہی متاثر ہوئے، اس لئے جماعت اسلامی کے کارکن مغربی تہذیب اور اس کی نظریاتی بنیادوں کے فہم اور اس کے مقابلہ اور غلبہ اسلام کی جدوجہد سے سرشار رہے۔ لیکن طویل عرصہ تک مسلسل کام

کرتے رہنے کے باوجود پاکستان میں جماعت اسلامی نہ تو عالمی سامراج کا سیاسی سطح پر بڑی حد تک مقابلہ کرسکی اور نہ ہی علمی، نظریاتی اور دعوتی محاذ پر وہ فیصلہ کن کردار ادا کرسکی۔ جماعت اسلامی کی ستر باہتر سالہ جدوجہد پر طائرانہ نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسلامی نقطہ نگاہ سے معاشرہ کی تبدیلی کا وہ کام نہ کرسکی، جس کام کے ذریعہ معاشرے مستحکم ہوتے ہیں اور قوموں اور ریاستوں کو مضبوط بنیاد فراہم ہوتی ہے۔

اگرچہ مسلم لیگ (ن لیگ) کی حکومت سے بہتر توقعات وابستہ ہیں، ن لیگ کی حکومت پی پی کی سابقہ حکومت سے ان شاء اللہ بہت بہتر ثابت ہوگی۔ معیشتی نظام کی بہتری، امن وامان اور سیاسی استحکام کے اعتبار سے یہ حکومت بہتر اقدامات کرے گی، لیکن مسلم لیگ کوئی نظریاتی جماعت نہیں ہے۔ نہ ہی اس کے ایجنڈے میں مادہ پرست عالمی تہذیب سے مقابلہ اور افرادِ معاشرہ کو اس تہذیب کی ہولناکیوں سے بچانے کا ایجنڈہ شامل ہے۔ اس کام کے لئے جماعت اسلامی شروع سے نہایت پُر عزم رہی ہے اور اس کی فکر اور جدوجہد میں یہ سارے نکات شامل ہیں۔ لیکن آج جماعت اسلامی افرادی قوت اور سیاسی قوت کے اعتبار سے جس مقام پر کھڑی ہے۔ وہ ایسا مقام ہے، جہاں وہ نہ تو سیاسی محاذ پر کوئی فعال کردار ادا کرنے کے قابل ہے اور نہ ہی دعوتی محاذ پر معاشرہ میں تحرک برپا کرسکتی ہے۔ یہ ایسی صورتحال ہے جو ملک کے دردمند حلقوں کے لئے از حد تشویشناک ہے۔

اس امر کا تفصیل سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ آخر جماعت اسلامی مصر اور ترکی کی معاصر اسلامی تحریکوں کی طرح عوام کو اپنا ہمنوا بنا کر سیاسی، نظریاتی اور دعوتی محاذ پر آگے بڑھنے کا معرکہ کیوں سرانجام نہ دے سکی۔

(۲)

۲۰۱۳ء کے الیکشن میں جماعت اسلامی جیسی دینی سیاسی جماعت کی ناکامی نے ملک کے دردمند علمی حلقوں میں اذیت کی لہر پیدا کی ہے۔ اس لئے کہ ان حلقوں کی نظر میں ملک کے ریاستی نظام میں فیصلہ کن اور بہتر تبدیلی اور ریاست کی اسلامی خطوط پر تشکیل کا کام جماعت اسلامی کے ذریعہ ہی ہوسکتا ہے، اس سلسلہ میں جماعت اسلامی سے

غیر معمولی توقعات وابستہ کی گئی ہیں۔ لیکن ماضی کے انتخابات کی طرح موجودہ الیکشن میں بھی جماعت اسلامی کی قابل ذکر پیش رفت نہ ہونے پر دردمند علمی حلقوں میں جماعت کے بارے میں یاس کی کیفیت پیدا ہوئی ہے اور اس تاثر کو فروغ ملا ہے کہ جماعت اسلامی کا الیکشن کے ذریعہ اقتدار کے ایوانوں میں داخلہ دشوار تر کام ہے اور آئندہ الیکشن میں بھی اس سے بہتر نتائج کی امید رکھنا مشکل ہے۔

سیاست میں جماعت اسلامی کی عدم پیش رفت کے سلسلہ میں جماعت کے حامی دوسرے دانشوروں کی رائے یہ ہے کہ چونکہ جماعت، سیاست کی مروجہ خرابیوں میں ملوث ہونے کے لئے تیار نہیں، اور عالمی استعمار بھی جماعت کو آگے بڑھنے دینا نہیں چاہتا، اس لئے الیکشن کے نتائج موجودہ نتائج سے بہتر ہوسکیں، مشکل تھا، ہماری نظر میں یہ نقطہ نگاہ زیادہ صحیح نہیں، اس لئے کہ اسی طرح کی بلکہ اس سے کئی سو گنا زیادہ رکاوٹیں مصر اور ترکی کی اسلامی تحریکوں کو درپیش تھیں، لیکن وہ تحریکیں اپنی فکر کی سلامتی اور بہتر حکمت عملی کی سے افراد معاشرہ کو ہمہ آہنگ بنا کر، اقتدار پر فائز ہوکر ریاستی اداروں کی اسلامی سمت میں پیش قدمی کے معاملہ میں حوصلہ افزا حد تک کامیاب ہیں۔ اگرچہ ترکی میں جسٹس پارٹی کی حکمت عملی کو سست رفتاری کا نام دیا جارہا ہے۔ لیکن وہاں کے حالات کو پیش نظر رکھکر اس رفتار کو غنیمت سمجھا جائے گا۔

ہماری نظر میں جماعت اسلامی کی فکر میں بعض ایسی خامیاں موجود ہیں، جس کی وجہ سے اس کے لئے افرادِ معاشرہ کی فکری، اخلاقی اور روحانی تبدیلی کی سمت میں پیش قدمی دشوار تر ہے۔ اور اخلاقی اور روحانی تبدیلی کے بغیر جماعت جیسی نظریاتی جماعت کی سیاست میں کامیابی کی امید رکھنا بے جا ہے۔

(۳)

الیکشن سے پہلے راقم الحروف کو جماعت اسلامی پاکستان کے حوالے سے ایک تفصیلی سوالہ نامہ ملا تھا، جس میں مقالہ نگار خاتون نے لکھا تھا کہ وہ جماعت اسلامی کے سلسلہ میں پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھ رہی ہیں، جو آخری مرحلہ میں ہے۔ آپ براہ کرم اس سوال نامہ کا تفصیل سے جواب دیں، محترمہ کی طرف سے متعدد بار یاد دہانی کرائی گئی، ان کے اصرار

پر راقم الحروف نے سوالہ نامہ کو پُر کرنے کے ساتھ ساتھ اس موضوع پر الگ سے مقالہ لکھکر بھی اسے ارسال کیا۔

الیکشن کے نتائج کے بعد ضرورت محسوس کی گئی ہے کہ اس مقالہ کو کچھ تغیر وتبدل کے ساتھ ''بیداری'' میں شائع کیا جائے۔ تاکہ جماعت اسلامی کے اہل علم واہل دانش میں اپنی فکر اور اپنی حکمت عملی پر ازسرنو غور وفکر کی صورت پیدا ہو۔ اگر ایسا نہ بھی ہو سکے تو اسلامی بیداری کی تحریک کے ایک ادنیٰ کارکن کا، جماعت کے سلسلہ میں زندگی بھر کے غوروفکر کا حاصل تو سامنے آئے گا۔

یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ اس مضمون کو تنقید برائے تنقید کے نقطہ نگاہ سے نہ پڑھا جائے، اس لئے کہ اسلامی تحریک کسی ایک گروہ کی تحریک نہیں ہوتی، وہ مسلم امت اور مسلم معاشرہ کی تحریک ہوتی ہے، مسلم امت کے بہی خواہوں اور دردمندوں کی تنقید کی حیثیت برائے تنقید والی نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ اس طرح کی تحریک کو اپنی تحریک سمجھکر خود احتسابی کا مظاہرہ کرتے ہیں، تاکہ اپنی خامیوں اور کوتاہوں کو سمجھکر فکر وحکمت عملی پر ازسرنو غوروفکر ہو اور اپنی پرواز کی بلندی کی صورت پیدا ہو، اس طرح امت کے حوالے سے وابستہ توقعات پر پورا اترنے کی کاوش ہو۔

زندہ جماعتوں اور تنظیموں کی خصوصیت یہی ہوتی ہے کہ جو بہتر نکات ان کے ہاں نہیں ہوتے، وہ دوسروں سے اخذ کرکے آگے بڑھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اس طرح قدرت جماعتوں کو ازسرنو ابھرنے کا موقعہ فراہم کرتی ہے۔

(۴)

جماعت اسلامی کے بارے میں آپ کے سوالات کی تہہ میں جو جذبہ کام کررہا ہے، وہ یہ ہے کہ ملک کے ریاستی نظام جس میں سیاسی واجتماعی نظام وغیرہ سب شامل ہے، اس میں جماعت اسلامی نظریاتی پیش قدمی کرسکی ہے یا نہیں۔ اگر نہیں کرسکی ہے تو اس کے داخلی اسباب کیا ہیں، آپ نے یہ سوال بھی دہرایا ہے کہ جماعت اسلامی کے پیش نظر جو نظریہ ہے، وہ محض سیاسی تبدیلی کا ہے یا وہ ایک ہمہ گیر وہمہ جہتی نظریہ ہے۔ آپ کے باقی سارے سوالات میری نظر میں انہی دو اہم سوالات کا شاخسانہ یا اس کا ذیلی حصہ ہیں۔

بہتر ہوگا کہ ہم گفتگو کا آغاز بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے عالمی اسلامی فکری لہر سے کریں۔

بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں ترکی میں سعید الزمان نورسی نے اور مصر میں اسی دور میں حسن البناء نے اور برصغیر ہند میں اسی زمانہ میں مولانا مودودی نے اپنی تحریروں کے ذریعہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور احیائے اسلام اور غلبہ اسلام کی آواز بلند کی۔ الجہاد فی الاسلام جیسی اہم کتاب مولانا مودودی نے تیسری دہائی میں ہی لکھی، جماعت اسلامی دراصل مولانا مودودی کی اسی فکر کا نتیجہ ہے کہ ایک منظّم جماعت کے ذریعہ افراد کار کی ایک ایسی ٹیم تیار کی جائے، جو اسلام کا نمونہ ہوں، اسلامی سیرت وکردار کے حامل ہوں، تہذیب جدید اور مغربی نظریات کے طلسم سے آزاد ہوکر معاشرہ کو اسلامی بنیادوں پر تبدیل کرنے کی جہدوجہد کے علمبردار ہوں اور اسلامی ریاست کے قیام کی جدوجہد کے جذبات سے سرشار ہوں، قیام پاکستان کے بعد وقتی اور ہنگامی حالات نے جماعت اسلامی کو اپنی بیشتر قوت سیاسی محاذ پر صرف کرنے پر مجبور کیا، لیکن سیاسی جدوجہد دراصل جماعت اسلامی کے وسیع تر اسلامی فکر کا ایک حصہ تھا، اس فکر پر مشتمل جو لاکھوں صفحات تحریر ہوئے، اس میں مقصود معاشرہ اور ریاستی نظام کی اسلامی بنیادوں پر تعمیر وتشکیل کی جدوجہد کا کام تھا۔

۱۹۴۸ء میں ترجمان القرآن میں مولانا مودودی نے جماعت اسلامی کے ایک کارکن کے جواب میں لکھا تھا کہ قیام پاکستان کے بعد حالات نے ہمیں سیاسی جدوجہد کی راہ اختیار کرنے پر مجبور کیا ہے، ممکن ہے ریاست کی اسلامی خطوط پر تعمیر کے لئے ہماری سیاسی جدوجہد والی یہ حکمت عملی کامیاب ہو، لیکن اگر آگے چل کر ہمیں اندازہ ہوا کہ اس حکمت عملی کے بہتر اور صحتمند نتائج برآمد نہیں ہورہے ہیں تو اس علم کے بعد ہم اس حکمت عملی کو تبدیل کرکے کارکنوں کی تربیت اور معاشرہ کی اسلامی بنیادوں پر تیاری کے کام میں ہی اپنی ساری توانائیاں صرف کریں گے۔ ''ترجمان القرآن'' میں شائع ہونے والا مولانا کا یہ مضمون مولانا مودودی کی کتاب ''اسلامی ریاست'' میں بھی شامل ہے۔

اگرچہ جماعت اسلامی نے قرار داد مقاصد سے لے کر ایوب خان کی فوجی آمریت، بھٹو صاحب کی جمہوری آمریت، ۱۹۷۳ء کے دستور کی منظوری اور بہت ساری سیاسی مہمات میں اہم اور فیصلہ کن کردار ادا کیا ہے۔ لیکن مولانا مودودی نے ''اسلامی

حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے'' کے عنوان سے غالبا ۱۹۴۳ء میں لکھنو میں تقریر کی تھی۔ جو اسی عنوان سے شائع ہوئی ہے، اس میں مولانا نے اسلامی حکومت کے قیام کا جو نقشہ پیش کیا تھا، وہ یہ تھا کہ اسلامی تحریک کا پہلا ہدف فساد زدہ معاشرہ کی اسلامی بنیادوں پر تبدیلی وتربیت کا کام ہوتا ہے۔ جب معاشرہ کا قابل ذکر حصہ تربیت کے وسیع تر اداروں کے ذریعہ اسلامی نظریہ سے ہمہ آہنگ ہوجاتا ہے اور افراد معاشرہ میں خیر کی قوتوں کا ساتھ دینے اور بُرائی کی قوتوں کے خلاف شعور بیدار ہوتا ہے۔ تو اس کے بعد اسلامی تحریک کا ہدف ریاست کے اجتماعی اداروں کی اسلامی بنیادوں پر تبدیلی وتشکیل کا کام ہوتا ہے۔ مولانا مودودی نے اس کے لئے یہ مثال بھی دی تھی کہ جب دودھ میں زہر ہوتا ہے، اس دودھ سے بلور کر جو مکھن تیار ہوگا، وہ زہریلا ہی ہوگا۔ فساد زدہ معاشرہ سے جو لوگ قیادت کے منصب پر فائز ہوں گے، وہ فساد فی الارض ہی پھیلائیں گے، ان سے خیر کی امید رکھنا ممکن نہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ قیام پاکستان کے بعد جماعت اسلامی کی جدوجہد میں افراد کی تربیت اور معاشرہ کی اسلامی بنیادوں پر تبدیلی کے کام سے زیادہ سیاسی جدوجہد کا پہلو زیادہ غالب نظر آتا ہے۔

(۵)

اس بات کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ جماعت اسلامی نے مغرب کے ملحدانہ فکر اور مادہ پرست مغربی تہذیب کا اعلیٰ علمی اسلوب میں تعاقب کیا اور جدید مادی نظاموں کے مقابلہ میں اسلام کے مکمل نظام زندگی اور نظریہ حیات ہونے پر ایک بھرپور لٹریچر تیار کیا اور برصغیر ہند ہی نہیں، بلکہ عالم اسلام کے لاکھوں جدید تعلیم یافتہ افراد کو اسلام کے نظام زندگی ہونے پر قائل کیا اور اس سلسلہ میں ان کے شکوک وشبہات دور کرکے انہیں اسلام کے دروازہ پر لا کھڑا کیا اور ہزاروں سے زیادہ افراد کی زندگیوں کے رخ کو بدلا، مولانا مودودی کی فکر کو عالم اسلام میں بڑی پذیرائی حاصل ہوئی۔ عربی اور انگریزی زبان میں ان کی بیشتر کتابیں شائع ہوئیں اور ان کتابوں کو اعلیٰ علمی سطح پر پڑھا گیا۔

جماعت اسلامی کے حوالے سے دردمند علمی حلقوں میں اکثر یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ جماعت اسلامی فکری اعتبار سے ایک طاقتور فکری سرمایے کی حامل ہونے، کارکنوں کی

بہتر، فعال اور مؤثر ٹیم کے حاصل ہونے، مالی اعتبار سے بھی کسی حد تک وسائل سے بہرہ یاب ہونے، ملک کی ساری جماعتوں سے زیادہ بہتر تنظیمی صلاحیتوں کی حامل ہونے، اخبارات اور میڈیا میں بھی قابل ذکر حیثیت کے حاصل ہونے اور ساٹھ ستر سال تک مسلسل کام کرنے کے باوجود وہ ملک کے ریاستی نظام میں مؤثر تبدیلی اور ریاستی اداروں پر اثر انداز ہونے میں قابل ذکر حد تک پیش قدمی نہ کرسکی ہے تو آخر اس کے اسباب کیا ہیں۔

فکری سرمایہ سے مالامال ہونے اور بہتر اور طاقتور تنظیم کے باوجود جماعت کی فکر کا ایک نقص جس نے جماعت کے کارکنوں کی زندگی میں حقیقی رنگ بھرنے، جماعت کے لئے لوگوں میں نرم گوشہ پیدا کرکے صوفیائے کرام اور علمائے ربانیین کے حلقوں میں جماعت کے لئے ہمدردی اور خیر سگالی پیدا ہونے میں رکاوٹ پیدا کی، وہ نقص انسانی شخصیت میں دل کی فیصلہ کن اہمیت کو نہ سمجھنے اور دل کی خفتہ صلاحیتوں کو بیدار کرنے اور دل کے سلسلہ میں قرآن وسنت کی سلف صالحین کی توجیہات وتشریحات سے استفادہ نہ کرنے کا نقص ہے۔

جماعت کے لٹریچر کو مسلسل پڑھنے اور اسے ہضم کرنے اور جماعت کے سارے تربیتی نظام میں اسی فکر کو بنیاد بنانے سے جس قسم کے کارکن تیار ہوکر سامنے آتے ہیں، وہ اسلام کے دفاع، غلبہ اسلام اور احیائے اسلام کے جذبہ سے تو یقیناً سرشار ہوتے ہیں، اور کفر اور طاغوتی نظام اور تہذیب جدید کے خلاف نفرت سے بھی بھرپور ہوتے ہیں، وہ جماعت کے لئے وقت دینے، اس کے لئے مال خرچ کرنے اور دنیا بھر میں جہاد کے نام پر ہونے والی سرگرمیوں میں دامے درمے سخنے کردار بھی ادا کرنے میں آگے ہوتے ہیں۔ لیکن دل جو انوار الٰہی کا مرکز ہے، دل جو تقویٰ کا مقام ہے، دل جو محبت ومعرفت کا خزینہ ہے، دل جو ایمان اور ہدایت اور رجوع الی اللہ کا ذریعہ ہے، دل جو پاکیزہ اسلامی جذبات کا ہدف ہے، دل جو انسانی جوہروں سے بہرہ یابی کا ذریعہ ہے۔ دل جو فاتح عالم ہے۔ جماعت نے نہ صرف یہ کہ دل کی سلامتی اور قلب سلیم کی اہمیت کو اجاگر کرنے کی طرف توجہ نہیں دی، بلکہ اپنی فکر میں انسانی شخصیت کو بدلنے کے سلسلہ میں دل کی فیصلہ کن

حیثیت کو بڑی حد تک نظر انداز کیا، اس لٹریچر کو ہضم کرنے، اس فکر کے تربیتی پروگراموں میں شرکت سے اللہ کے ساتھ والہانہ محبت کے جذبات بیدار ہوسکیں اور اللہ کے بندوں کے ساتھ محبت کے جذبات فروغ پذیر ہوسکیں، کارکنوں کے باہمی تعلقات میں محبت کے جذبات جنم لے سکیں، حب جاہ وحب مال، حرص وہوس اور خود نمائی کے باطنی جذبات کی اصلاح ہو سکے، لوگوں کے قصوروں کو معاف کرکے، ان سے یک طرفہ طور پر خوشگوار تعلقات قائم رہ سکیں، ہر طرح کے حالات میں صبر وشکر کی فضا پیدا ہوسکے، اپنے ساتھ علمی اختلاف رائے کرنے والوں کی بات کو ٹھنڈے دل سے سننے کا مزاج پیدا ہو سکے۔ اشتعال، اور ردعمل کی نفسیات سے بلندی کی صورت پیدا ہو سکے، سب کے ساتھ احترامِ انسانیت کا معاملہ ہو سکے قیل وقال سے بچا جا سکے، تالیف قلب کی صلاحیت پیدا ہو سکے، حکمت وفراست کے ساتھ معاملات کو سلجھانے کی فضا پیدا ہو سکے، اللہ کے ذکر کے حوالے سے گفتگو سنتے رہنے کی صلاحیت ابھر سکے، نفلی عبادات سے ذوق وشوق کی فضا پیدا ہو سکے، معافی اور رحم دلی کے جذبات ابھر سکیں، ایک دوسرے سے ٹوٹنے اور دور ہونے کی بجائے رواداری اور جوڑ میں اضافہ ہو سکے۔ اداروں کو باہمی رسہ کشی اور خلفشار سے بچانے کی صورت پیدا ہو سکے۔ جماعت اسلامی کے فکری سانچہ وڈھانچہ میں ان ساری خوبیوں وصفات کی تربیت ونشوونما دشوار تر کام ہے، اس لئے کہ ان صفات وخوبیوں کا تعلق عقلِ محض کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے سے نہیں ہے اور نہ محض ضابطائی نوعیت کی کارروائیوں سے۔ بلکہ ان سب کا تعلق دل کی صلاحیتوں کی بیداری سے ہے۔ دل جب ایمان سے سرشار ہونے لگتا ہے۔ دل جب محبوب حقیقی کی محبت سے بھرپور ہوجاتا ہے۔ دل جب رذائل اور باطنی امراض سے پاک ہونے لگتا ہے اور وہ قلب سلیم کی طرف گامزن ہونے لگتا ہے تو یہ دل سارے انسانی جوہروں سے بہرہ ور ہونے لگتا ہے اور وہ انسانیت کے حقیقی درد سے آشنا ہونے لگتا ہے، اور اللہ کے دین اور اس کے لئے مضطرب ہونے لگتا ہے۔

دل کی صلاحیتوں کی عدم بیداری کی وجہ سے کئی نقصان ہوئے۔ ایک یہ کہ غلبہ دین کے کام کے لئے دل کی ساری توانائیاں صرف نہیں ہو پائی اور فراست مومنہ اور حکمت تک

رسائی نہ ہوسکی، دوسرے یہ کہ مسلم نفسیات سے آشنائی نہ ہوسکی کہ اس نفسیات کو متحرک کرکے، اس سے بہتر طور پر کام کس طرح لیا جائے اور اسلامی مقاصد کے لئے مسلم نفسیات کا استعمال کس طرح ہو۔

یقیناً دل کی صلاحیتوں کی بیداری بذریعہ عقل بھی ہوسکتی ہے، لیکن اس ذریعہ سے یہ کام بہت زیادہ دشوار تر ہے اور عقل کے ذریعہ دل کی گہرائیوں تک رسائی کا کام انتہائی صبر آزما جدوجہد کا متقاضی ہے۔

(۶)

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا کہ دل کے بارے میں ایک بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ اس کا مقام دماغ ہے یعنی وہ عقل ہی کا حصہ ہے۔ عقل سے مختلف نہیں۔ جب کہ قرآن شریف واضح طور پر نشاندہی کرتا ہے کہ دل کا مقام سینہ ہے۔ **فانها لاتعمی الابصار ولکن تعمل القلوب التی فی الصدور.** (پس آنکھیں اندھی نہیں ہوتی بلکہ سینہ میں جو دل ہیں وہ اندھی ہوتی ہیں)۔

قرآن، سینہ میں موجود اسی دل کو ایمان، ہدایت، تقویٰ، محبت ومعرفت وغیرہ کا بنیاد قرآن دیتا ہے۔ اور اسی دل کے بگڑ جانے سے سارے ایمان اور اسلام کے متزلزل ہوجانے اور اس پر مہر لگ جانے سے عبارت کرتا ہے۔

اس سلسلہ میں چند آیات ملاحظہ ہوں۔

ومن یومن باالله یهد قلبه. جو اللہ پر ایمان لاتا ہے اللہ اس کے قلب کو ہدایت سے سرفراز فرماتا ہے۔)

ولما یدخل الایمان فی قلوبکم. (اور ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل ہی نہیں ہوا)۔

وما جعل الله لرجل من قلبین جوفه. (اور اللہ تعالیٰ نے کسی شخص کے پہلو میں دو دل نہیں بنائے۔

ان فی ذالک لذکریٰ لمن کان له قلب. (بے شک اس قرآن میں نصیحت

ہے اس شخص کے لئے جس کا قلب زندہ ہے)۔

حبب الیکم الایمان وزینه فی قلوبکم. (اور تمہارے لئے ایمان کو محبوب بنا دیا ہے اور اس سے تمہارے دلوں کو مزین کر دیا ہے۔)

وانه لتنزیل رب العٰلمین نزل بروح الایمان علیٰ قلبک لتکون من المومنین. (اور بے شک یہ قرآن پروردگار عالم کا اتارا ہوا ہے اور اس کو امانتدار فرشتہ لے کر اترا ہے۔ (یعنی اس نے اس قرآن کو) تمہارے دل پر (القا) کیا ہے۔

اولئک الذین المتحن الله قلوبهم للتقویٰ (اور اللہ نے ان کے دل تقویٰ کے لئے آزما لئے ہیں)۔

ان الله یحول بین المرء وقلبه. (بے شک اللہ حائل ہوجاتا ہے فرد اور اس کے قلب کے درمیان) اس طرح کی مزید بیسیوں آیات ہیں، جن میں ایمان اور تقویٰ کا انحصار دل کی زندگی کو قرار دیا گیا ہے اور دل کی مردگی سے ہی ایمان کا زوال وابستہ کیا گیا ہے۔

بڑی مسرت کی بات یہ ہے کہ بعض جدید سائنسدانوں نے دل کے بارے میں جو تحقیق کی ہے، وہ یہی ہے کہ دل عقل کو پیغامات بھیجتا رہتا ہے اور دل کے یہ پیغامات بڑے طاقتور ہوتے ہیں۔ جب کہ عقل، دل کو جو پیغامات بھیجتا ہے، دل بعض اوقات ان پیغامات کو مسترد کر دیتا ہے۔ اس موضوع پر کافی تحقیقات ہوئی ہیں۔ اس سلسلہ میں منصورہ لاہور ہی کے ایک ادارہ اذان سحر پبلیکیشنز نے امریکہ میں کام کرنے والے ڈاکٹر مشتاق صاحب کی دل کے موضوع پر اہم کتاب شایع کی ہے۔

اگر جماعت اسلامی کے فکر میں دل کی یہ اہمیت واضح ہوجائے تو اس دل کی زندگی کے لئے صاحبان دل اور علمائے ربانیین سے دوری کی دیوار ازخود ختم ہوجائے گی اور ان سے قربت اور رجوع کی صورت پیدا ہوجائے گی اور دلوں کو اللہ کی محبت سے سرشاری کے ذریعہ اسلامی تحریک کو مطلوبہ افراد کی تیاری کا ہدف حاصل ہوجائے گا۔

دل کی سلامتی کے اہتمام کی صورت پیدا کئے بغیر جدوجہد کا بیشتر رخ، قیل وقال منصوبوں، بیانات اور تقاریر وتحریر سے آگے بڑھنے نہیں پاتا، دل کو اہمیت دینے اور اس کی اصلاح کے لئے جدوجہد کے بعد قول وعمل میں مغائرت کی یہ ساری صورتحال ختم ہوجائے

گی۔

(۷)

فکر کا ایک نقص جس نے جماعت کے کارکنوں میں سیرت وکردار کے اعتبار سے عوام میں باعث کشش ہونے نہیں دیا، وہ یہ ہے کہ ریاست کی تبدیلی کے اجتماعی کام کے مقابلہ میں اللہ کے ذکر کی وہ اہمیت نہ رہی، جو قرآن وسنت اسے دیتا ہے۔ ذکر کے سلسلہ میں جماعت کے کارکنوں کا یہ تصور کہ اقامت دین کے غلبہ کا کام خود ہی ذکر ہے۔ اور نماز اور قرآن کے علاوہ دوسرا ذکر کسی اہمیت کا حامل نہیں۔ اس نقطہ نگاہ کا ایک نقصان تو یہ ہوا کہ ذکر کے نور کی برکت سے شخصیت میں جو نکھار پیدا ہوتا ہے اور دنیا سے جو بلندی ہوتی ہے، وہ پیدا نہ ہوسکی، دوسرا نقصان یہ ہوا کہ ذکر کے نور کے جو اثرات افراد معاشرہ کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں، وہ پیدا نہ ہوسکے۔

قرآن واحادیث میں غلبہ دین کے کام کے علاوہ اللہ کی تسبیح وتحمید کے کام کو جداگانہ اور سب سے اہم کام کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ مثلا ایک جگہ ہے۔

اذھب انت واخوک بایٰاتی ولاتنیا فی ذکری.

اے موسیٰ، تو اور تیرا بھائی فرعون کے پاس جائے، میری آیتیں لے کر، لیکن کہیں میرے ذکر سے غافل نہ ہونا۔

دوسری جگہ ہے۔

یاایھاالذین آمنوا اذا لقیتم فئۃ فاثبتو وذکر اللہ کثیرا.

اے ایمان والو، جب کفار سے تمہارا مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور (اس وقت بھی) اللہ کا کثرت سے ذکر کرو۔

رسول اللہ ﷺ سے فرمایا جارہا ہے۔

فاذا فرغت فانصب والیٰ ربک فرغب.

پس جب آپ فارغ ہوجایا کریں تو (عبادت میں) میں محنت کیا کریں اور اپنے رب کی طرف توجہ رکھیں۔

قرآن میں ایک اور جگہ حضور ﷺ سے فرمایا جارہا ہے۔

ولقد نعلم انک یضیق صدرک بما یقولون فسبح بحمد ربک وکن الساجدین.

(ہم جانتے ہیں کہ آپ کا دل ان لوگوں کی باتوں سے تنگ ہوتا ہے۔ سو آپ اپنے رب کی تسبیح میں لگے رہئے اور سجدہ کو مشغلہ بنائے۔ (اس سے آپ کی تنگ دلی رفع ہوجائے گی)۔

ہماری اس تحریر سے یہ تاثر لینا صحیح نہ ہوگا کہ جماعت اسلامی کے ہاں سرے سے ذکر واذکار کا اہتمام نہیں، یا جماعت میں نیک اور متقی لوگوں کا وجود عنقا ہے، جماعت میں انفرادی طور پر ذکر واذکار سے مناسبت رکھنے اور نفلی عبادت کا اہتمام کرنے والے افراد موجود ہیں اور تقویٰ کے صاحبوں کی بھی کافی تعداد موجود ہے، یہی افراد ہی تو جماعت میں موجود خیر کا موجب ہیں۔ اور یہی افراد جماعت کی اصل کریم ہیں۔ لیکن جماعت کے فکر اور جماعت کے اجتماعی نظام میں جس طرح سیاسی جدوجہد پر زور ہے اور اقامت دین کے لئے کام کے لئے جذباتی اور ذہنی فضا موجود ہے۔ اس طرح جماعت میں ذکر واذکار اور نفلی عبادت کے اہتمام کے ذریعہ اندر کو آباد اور منور کرنے کا انتظام نہ ہونے کے برابر ہے، اور جماعت میں یہ مزاج راسخ ہے کہ غلبہ اسلام کے لئے کام کرنے سے تقویٰ اور ایمان میں رسوخ از خود پیدا ہوتا جائے گا اور اقامت دین کی جدوجہد بجائے خود ذکر وفکر ہے نیز ذکر وفکر میں زیادہ مجاہدوں کی ضرورت نہیں، اس لئے کہ اس سے اقامت دین کی جدوجہد متاثر ہوگی۔ جو توانائیاں ذکر وفکر میں صرف ہوں، وہی توانائیاں اگر غلبہ دین کی جدوجہد میں خرچ ہوں تو اس سے اقامت دین کے فریضہ کی سرانجامی کی صورت بھی پیدا ہوگی تو اس کے ساتھ ساتھ ذکر وفکر وعبادت کے تقاضے بھی پورے ہوتے جائیں گے اور اس کا ثواب ازخود حاصل ہوتا رہے گا۔

اگرچہ ذکر کے سلسلہ میں جماعت کے نائب امیر خرم مراد صاحب نے کافی کوشش کی کہ اخوان المسلموں کے ہاں ذکر واذکار کا جو سلسلہ ہے، اسے جماعت میں رائج کیا جائے اور فکر میں ذکر کے حوالے سے جو کمی وکوتاہی ہے، اسے دور کیا جائے، لیکن خرم مراد صاحب کی یہ کوششیں کامیاب نہ ہوسکیں، اس لئے کہ ایک تو جماعت کی مجموعی فکر میں ذکر واذکار کے حوالے سے گنجائش بہت کم ہے، دوم یہ کہ خرم مراد صاحب نے نائب امیر

جماعت ہونے کے بعد یعنی عمر کے آخری حصہ میں یہ کام شروع کیا۔

(۸)

جماعت اسلامی کی طرف سے اسلام کے لئے ہونے والی جہدوجہد کے آگے نہ بڑھنے میں بعض غیرضروری مباحث کو بھی عمل دخل حاصل ہے، مثلا جماعت کے دستور میں یہ نکتہ شامل کرنا کہ رسول خدا کے سوا کسی کو معیار حق نہ بنائے، کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھے، کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا نہ ہو۔

اس طرح کی دستوری شقوں سے ایک تو علمائے کرام کو یہ خطرہ لاحق ہوا کہ یہ تحریک اپنے متعلقین کا رخ صحابہ کرام اور سلف صالحین کے رخ سے دوسری سمت موڑنا چاہتی ہے اور یہ رخ خودرائی والی نوعیت کا ہے۔ اس کا دوسرا بڑا نقصان یہ ہوا کہ کارکنوں میں اپنی فکر کے بارے میں غیرمعمولی خوداعتماد پیدا ہوئی، جماعت اسلامی میں محترم قاضی حسین احمد صاحب کو اس طرح کی دستوری شق کے نقصانات کا پوری طرح ادراک حاصل تھا، اس لئے مولانا زاہد الراشدی صاحب کے بقول قاضی صاحب، امیر جماعت بننے کے بعد علمائے کرام کی تشفی کے لئے دستور کی اس شق کو نکالنے کے لئے تیار ہوگئے تھے۔

(۹)

فکر کی ایک دوسری غلطی جو معاشرہ میں جماعت اسلامی کے نفوذ اور اس کے پھیلاؤ کی راہ میں رکاوٹ ہے، وہ ہے سلف صالحین کے اسلامی فکر سے استفادہ نہ کرنے، بلکہ ان کی فکر سے بے اعتنائی اختیار کرنے اور مولانا مودودی کی فکر ہی کو حرف آخر سمجھنے کا رجحان ہے، حالانکہ جماعت اسلامی کے اہل علم واہل دانش کو یہ بات پیش نظر رکھنے کی ضرورت تھی کہ ایک مفکر اور فاضل شخصیت سے اسلام کی تشریح وتوضیح اور اس کے نصب العین کے تعین میں غلطی کا امکان کہیں زیادہ ہے، جب کہ امت کے ہزاروں لاکھوں علمائے ربانیں اور فضلاء کی تشریح اسلام اور فہم اسلام میں غلطی کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے، بلکہ اسلام کے نصب العینی فکری خطوط کے تعیین میں سلف صالحین کا اجماع، امت کے لئے سند اور حجت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے قرآن نے اللہ کی کتاب اور سنت رسول کے بعد

مومنین یعنی سلف صالحین کی راہ اختیار کرنے پر زور دیا ہے۔ مومنین کی راہ کے علاوہ دوسری راہ اختیار کرنے پر شدید انتباہ دیا ہے۔ (ملاحظہ ہو سورۃ النسآء آیت ۱۱۵)

سلف صالحین اور علمائے ربانیں نے عبادت اور کثرت ذکر وفکر کے ذریعہ اللہ کے ساتھ اپنے تعلق کو مستحکم کرنے پر غیرمعمولی زور دیا ہے، سلف صالحین نے علمائے ربانیں کی صحبت کے ذریعہ نفس پرستی کے بتوں کی ٹوٹ پھوٹ، باطن کی اصلاح اور تزکیے کے کام کو فیصلہ کن اہمیت دی ہے۔ سلف صالحین نے کروڑوں سے زیادہ افراد پر تجربات ومشاہدات کرکے بتایا ہے کہ ہر فرد کی عمومی نفسیات یہ ہے کہ رسمی اسلام کے باوجود وہ صبح سے رات گئے تک متعدد بار نفس کے بت کدہ پر سجدہ ریز ہوتا ہے، وہ حب جاہ سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوتا ہے تو حب مال کے بت کی پرستش کرنے لگتا ہے، اس پرستش سے بمشکل فارغ ہوتا ہے تو حسد اور بخل کے شیطان کی نذر ہوجاتا ہے۔ اس کے معا بعد خودنمائی، ریا اور جذبہ شہرت کا بت اسے گھیر لیتا ہے۔

سلف صالحین کی اسلامی فکر کا مرکزی نکتہ تہذیب نفس، ضبط نفس اور تربیت نفس کا نکتہ ہے۔ سلف صالحین نے زندگی میں اخلاص بےنفسی، اور للھیت پیدا کرنے پر زیادہ توجہ دی ہے، اس لئے کہ اللہ کے ہاں اعمال کی قبولیت کا دارومدار اخلاص نیت پر ہے، سلف صالحین نے دنیاوی جدوجہد کے مقابلہ میں آخرت کی فکر، آخرت میں اللہ کے سامنے جواب دہی کے احساس، آخرت کے استحضار، آخرت کے لئے تیاری کے کام پر سب سے زیادہ زور دیا ہے۔ سلف صالحین کا کہنا ہے کہ اگر انبیاء کرام کی تعلیمات کا ماحاصل بیان کرنے کے لئے کہا جائے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ فطرت میں محبوب حقیقی کے ساتھ موجود والہانہ محبت کے طاقتور نصب العینی داعیہ (تقاضہ) جسے معاشرہ اور تعلیم وتربیت کے ادارے دبا دیتے ہیں، اسے بیدار کرکے ارتقائی صورت دی جائے اور زندگی کو اللہ ورسول کی اطاعت کے مطابق متشکل کیا جائے۔ سلف صالحین اپنی ذات سے اللہ کی مخلوق کو نقصان نہ پہنچانے، بلکہ انہیں راحت پہنچانے پر زور دیتے ہیں۔ ان کی فکر، محبت سے دلوں کو جیتنے اور صبر وشکر کے ساتھ زندگی گزارنے کے نکتہ کے گرد گھومتی ہے، وہ دین کے فروغ اور اس کے غلبہ کے لئے کام کو اہمیت دیتے ہیں۔ اور وہ مسلمان حکمرانوں پر اثر انداز ہو

کر، معاشرہ میں موجود بگاڑ کے خاتمہ کے لئے کوشاں رہتے تھے، سلف صالحین کا کہنا ہے کہ معاشرہ کا سارا فساد، افراد کی نفسی خرابیوں اور باطنی بُرائیوں کی وجہ سے ہی پیدا ہوتا اور فروغ پذیر ہوتا ہے۔ افراد کی اصلاح کے لئے ہمہ جہتی کاوشیں کی جائیں تو فساد کی بنیاد متزلزل ہوجائیگی اور معاشرہ کے یہی افراد صالح قوتوں کو آگے بڑھانے اور ریاستی اداروں میں موجود خرابیوں کو دور کرنے کے لئے حکمت کے ساتھ کوشاں ہوں گے۔

سلف صالحین کی اسلامی فکر جو ہزاروں سے زائد کتابوں میں موجود ہے (جو قرآن وسنت پر غور وفکر کا نتیجہ ہے) اس میں دین کی یہی ترتیب ہے، سلف صالحین کی دین کی یہ ایسی ترتیب ہے، جو فطری نوعیت کی ترتیب ہے اور ہر وہ شخص جو خالی ذہن سے قرآن وسنت پر عرصہ تک غور وفکر کرے گا، وہ سلف صالحین کی دین کی اس ترتیب کو اپنے دل کی آواز محسوس کرے گا۔

(۱۰)

مولانا مودودی نے بڑے اخلاص اور فنائیت کے ساتھ جدید دور کے مادہ پرست نظریاتی سیلاب کے پس منظر میں قرآن وسنت پر غور وفکر کے نتیجہ میں دین کی ایک ترتیب پیش کی ہے، جس میں حکومت الٰہیہ کے قیام کی جدوجہد کے کام کو دین کے سارے کاموں پر ترجیح دی ہے، اس کام کی اہمیت سے انکار نہیں۔ بالخصوص موجودہ دور میں ریاست کے اجتماعی اداروں کو معاشرہ کی ذہن سازی اور بگاڑ کے سلسلہ میں جو حیثیت حاصل ہوگئی ہے، وہ نہایت فیصلہ کن اہمیت ہے، اس لئے مسلمانوں میں ایک ایسی طاقتور جماعت کا موجود ہونا ضروری ہے، جو ریاستی اداروں کی اسلامی بنیادوں پر تشکیل کے کام کو اپنا ہدف بنائے، لیکن اس کام کے لئے سلف صالحین کی تحریروں اور ان کی فکر سے بھرپور استفادہ کئے بغیر آگے بڑھنا نہ صرف دشوار ہے، بلکہ تقریبا ناممکن ہے۔ اس کی واضح مثال مصر اور ترکی کی موجودہ اسلامی تحریکیں ہیں، جو تصوف واہل تصوف اور علمائے ربانی کی فیض یافتہ ہیں۔ اخوان المسلمون کے بانی حسن البناء، شاذلی سلسلہ کے ایک بزرگ کے تربیت یافتہ تھے، انہوں نے اخوان المسلموں کی بنیاد میں تصوف کی پوری روح شامل کرلی تھی۔ اسی طرح

ترکی کی موجودہ اسلامی تحریک سعید النرمان نورسی اور ترکی کے سیکڑوں صوفیائے کرام کی کاوشوں کا نتیجہ ہے، اگرچہ مصر اور ترکی کے مخصوص حالات کی وجہ سے جہاں اسلام کا نام لینا حرم تھا، وہاں داڑھی جیسی سنت کے عدم اہتمام کی گنجائش جبر کی وجہ سے دی گئی تھی۔ ان شاء اللہ اب اس میں تبدیلی آئے گی۔

جماعت اسلامی کی فکر یا تربیت کا ایک نقص جس نے مذہبی اور روایتی دینی حلقوں میں جماعت کے بارے میں پیدا ہونے والی مغائرت دور کرنے میں مدد نہیں دی، وہ کارکنوں میں علمائے کرام اور اولیاء کرام کے بارے میں ادب وآداب واحترام کی کمی، بلکہ ان پر تنقیدی رجحان کا غلبہ ہے۔ چونکہ عام طور پر جماعت اسلامی کے کارکنوں کی ساری ذہنی، فکری وعلمی تربیت مولانا مودودی کی فکر اور اس فکر کے حامل تربیتی اداروں کے ذریعہ ہوئی ہے اور اسلام کے بارے میں ان کی معلومات کا واحد ذریعہ مولانا مودودی کا لٹریچر ہی ہے، اس لئے مولانا مودودی کی شخصیت سے ان کی محبت ایک فطری بات ہے، لیکن اس محبت کا مطلب دوسرے فضلائے اسلام اور علمائے اسلام کی عظمت سے انکار یا ان سے سوئے ظنی یا ان کے بارے میں اس تاثر کا پیدا ہونا کہ اسلام کی ساری تاریخ میں صحابہ کرام کے بعد اسلام کی حقیقی روح اور اس کے نصب العینی فکر کو مولانا مودودی کے علاوہ کسی نے نہیں سمجھا، جماعت اسلامی کے کارکنوں کا یہ عمومی تاثر ایسا ہے، جو جماعت کو سارے دینی ومذہبی حلقوں سے قریب کرنے کی راہ میں حائل ہے۔

اسلامی تحریک کی تو اہم خصوصیت ہی یہی ہے کہ اس تحریک سے وابستہ افراد اپنے آپ کو اہل اللہ اور مصلحین امت کے فیوض وبرکات کا مرہون منت سمجھتے ہیں اور ان کے خادمین کی لسٹ میں شمار کرنے کو وہ اپنے لئے اعزاز سمجھتے ہیں۔ اسلامی تحریک کے کارکنوں میں یہ دعویٰ پیدا ہوجانا کہ اسلامی تاریخ میں ۱۳ سو سال سے پہلی بار دین کے حقیقی پیغام اور اس کے بنیادی ہدف کو ہم نے ہی سمجھا ہے۔ اور اس معاملہ میں ہم سب سے بازی لے گئے ہیں اور ہم سلف وخلف سب سے حقیقی فہم دین کے معاملہ میں آگے ہیں، یہ ایسی بات ہے جو اسلامی تحریک کے کارکنوں کے لئے نہ صرف یہ کہ زیبا نہیں، بلکہ ان کے لئے بے برکتی کا بھی باعث ہے تو سارے دینی حلقوں سے دور کرنے کا ذریعہ بھی۔

سابق امیر جماعت اسلامی محترم قاضی حسین احمدؒ نے اپنے خالص مذہبی خاندانی پس منظر، اس کے گہرے اثرات اور اپنی فطرت سلیمہ کی وجہ سے جماعت کے ان فکری اثرات کے ازالہ اور دینی حلقوں سے جماعت کے قرب کی کافی کاوشیں کیں، اس کی وجہ سے جماعتی کارکنوں میں دینی حلقوں کے بارے میں وسعت فکر پیدا ہوتی جارہی تھی۔ لیکن قاضی صاحب کے بعد جماعت میں اس فکری وسعت کی حامل شخصیت نظر نہیں آتی، جو علمائے کرام اور اولیائے کرام کے احترام کے جذبات کو بڑھانے میں کردار ادا کر سکے۔

(۱۱)

یہ کہا جا سکتا ہے کہ راقم السطور کے بیان کردہ ان نکات میں ایسی سیاسی حکمت عملی، جس کے ذریعہ جماعت سیاست میں پیش قدمی کر سکے، اس کا تو کوئی ذکر ہی نہیں، اس اعتبار سے محض فکر اور حکمت عملی کے بعض نقائص کی نشاندہی تو کوئی معنیٰ نہیں رکھتی۔ اس ضمن میں ہمارا کہنا یہ ہے کہ بہتر تنظیم اور وسیع تجربات کا پس رکھنے، کارکنوں کی مؤثر ٹیم کی موجودگی اور میڈیا میں اثرات اور مالی اعتبار سے بھی بہتری، طویل عرصہ سے کام کرتے رہنا وغیرہ یہ ایسی چیزیں ہیں، جو سیاست میں کامیابی کے لئے اہم اجزاء کی حیثیت کی حامل ہیں، لیکن ان ساری چیزوں کی موجودگی میں اگر پیش قدمی نہ ہوسکی ہے تو اس کا بنیادی سبب فکر کے ساتھ دل کی صلاحیتوں کی عدم بیداری، سلف صالحین کی فکر اور ان کے روحانی اداروں سے عدم استفادہ کا مزاج، ذکر واذکار سے طبعی مناسبت کا فقدان، اور ادب وآداب کی کمی اور صدیوں کی مسلم نفسیات سے ناآشنائی معاشرے میں اپنی دینی حیثیت کے مستحکم نہ ہونے جیسی بنیادی چیزیں شامل ہیں۔ ہر اسلامی تحریک کا اصل سرمایہ یہی چیزیں ہوتی ہیں۔ ان بنیادی چیزوں سے بہرہ وری کے بغیر کوئی بھی اسلامی تحریک عوام میں نفوذ حاصل کر سکے اور بڑی کامیابی اور بہتر نتائج حاصل کر سکے، دشوار تر ہے۔

(۱۲)

ہمارے بیان کردہ ان نکات کو صوفیانہ باتیں کہکر مسترد کرنا صحیح نہ ہوگا۔ ہمارے یہ نکات انسانی جسم میں خون سے مشابہت والی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر جسمِ انسانی میں خون

نہ ہوگا یا کم ہوگا تو انسان کی ساری سرگرمیاں بُری طرح متاثر ہوں گی اور سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ جائیں گے، جب تک اللہ سے والہانہ محبت پیدا نہ ہوگی، اللہ والوں سے تعلق خاطر نہ ہوگا۔ ادب وآداب اور علمائے ربانیین کے سامنے چھوٹے پن کی حیثیت سے بن کر رہنے کا سلیقہ حاصل نہ ہوگا، تزکیہ کے مراحل طے نہ ہوں گے، تب تک نہ تو لوگوں کے دلوں میں مقام پیدا ہوسکتا ہے، نہ ہی اسلامی تحریک کے فروغ کی صورت پیدا ہوسکتی ہے۔

اسلامی تحریک جہاں جدید اسلوب میں اسلامی فکر کی پیش کش کا کام کرتی ہے، ذہن سازی کا فریضہ سرانجام دیتی ہے اور معاشرے میں رفاہی سرگرمیوں کا جال بچھا کر، لوگوں کی خدمات سرانجام دیتی ہے، وہاں وہ تجدید ایمان کے کام پر سب سے زیادہ زور دیتی ہے، اس لئے کہ تجدید ایمان کی دعوت سے ہی افراد معاشرہ کو مادیت پر دیوانہ ہونے اور اس کے سیلاب میں بہنے سے بچایا جا سکتا ہے۔ ہر دور میں اسلامی تحریک نے یہی فریضہ سرانجام دیا ہے۔

یہ ایسا عظیم کام ہے، جس کے لئے غیرمعمولی اخلاقی اور روحانی قوت کی ضرورت ہے۔ اور صبر، تحمل، بُردباری، حکمت وفراست مطلوب ہے۔ یہ ساری چیزیں ہمارے بیان کردہ نکات کے ذریعہ بہتر طور پر حاصل ہوسکتی ہیں۔

اللہ کرے ہمارا یہ مضمون جماعت اسلامی کے ذمہ داروں اور ان کے اہل علم واہل دانش کی تنقیدی حس کو بیدار کرنے کی بجائے ان نکات پر غور وفکر کرنے پر آمادہ کر سکے۔

ہماری نظر میں جماعت اسلامی کے لئے بہتر اور سب سے مؤثر صورت یہ ہے کہ اس کی قیادت اور اہل دانش کی ایک ٹیم ڈیڑھ دوماہ کے لئے ترکی اور مصر کی اسلامی تحریکوں کے مشاہداتی اور تجزیاتی مطالعہ کے لئے ان ممالک کا دورہ کرے۔ اور جماعت کے فکری اثرات سے بلند ہو کر وہ یہ دیکھنے کی کوشش کرے کہ ان تحریکوں نے عوام میں نفوذ کی صلاحیت کیسے پیدا کی اور وہ صوفیائے کرام کے فیوض وبرکات سے متمتع ہوکر اپنے ایمان کے استحکام کے ساتھ عام مسلمانوں سے رابطہ رکھنے اور انہیں اپنے آپ سے قریب کرنے اور ان کا اعتماد حاصل کرنے میں کیسے کامیاب ہوئے۔ **(ماخوذ ماہنامہ ''بیداری'' جون ۲۰۱۳ء)**

عالم عرب کی مؤثر اسلامی تنظیم

اخوان المسلمون پر ایک نظر

اخون المسلمون اس وقت شدید ابتلا وآزمائش میں مبتلا ہے، ان کے ہزاروں کارکن شہید کردیئے گئے ہیں، ان کی سو سے زائد ممتاز شخصیتوں، جس میں صدر مرسی اور مرشد عام اور علامہ یوسف قرضاوی بھی شامل ہیں، انہیں پھانسی کی سزا سنادی گئی ہے۔

ان نئے حالات میں اخوان کے کردار کے بارے میں مزید توضیح کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

اخوان المسلمون کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ مصر کا علمی، ادبی حلقہ، دانشوروں کا طبقہ اور ان کے زیر اثر سارے متوسط طبقات تیزی سے الحاد ودہریت ولادینیت کی تحریک کا شکار ہورہے تھے اور مصر میں انقلاب روس کی طرح کے حالات سازگار ہورہے تھے، جس میں خدا اور دین ومذہب سے آزاد خالص مادی نظریہ پر مبنی ریاستی نظام کی تشکیل ہو، اخوان نے علم، ادب، صحافت اور تعلیم کے محاذ پر مصر میں لادینیت کے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روک دیا۔ اور نوجوان نسل کے ہزاروں سے زیادہ ایسے باصلاحیت افراد پیدا کئے، جو اسلامی نظریہ کے لئے اپنی ہر چیز قربان کردینے کے لئے تیار تھے اور اب بھی تیار ہیں۔

اخوان کی دوسری بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے ہاں ذکر واذکار اور عبادت کی روح موجود ہے، جس نے اخوان سے وابستہ افراد کے کردار میں نکھار پیدا کر دیا، دوسرے الفاظ میں ان کے ہاں ذہن کی تربیت کے ساتھ ساتھ دل کی تربیت کا بھی بہتر اور مؤثر نظام موجود ہے۔ عبادت کی اس روح کی وجہ سے ان کے ہاں ہر طرح کی تنقید کو سننے اور تنقید سے استفادہ کرنے کا میلان موجود ہے، چنانچہ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے ۱۹۵۱ء میں ان کے اعلیٰ سطح کے اجتماع میں ایک تقریر فرمائی تھی، جس میں معاشرہ کو بڑی حد تک تبدیل کئے بغیر سیاست میں ان کے داخلہ کی حکمت عملی پر دردمندانہ تنقید کی گئی تھی، یاد پڑتا ہے کہ

مولانا نے اس تقریر میں انہیں اہل اللہ سے روحانی استفادہ کی طرف بھی توجہ دلائی تھی۔ مولانا کی اس تنقیدی تقریر کی نہ صرف یہ کہ ان کی اس وقت کی مرکزی قیادت نے تحسین کی تھی، بلکہ اسے کتابچہ کی صورت میں شائع بھی کیا تھا اور اس سے استفادہ کا خصوصی اہتمام کیا تھا۔

اخوان کی ایک تیسری بڑی صفت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی تنظیم میں مواخاۃ کا ایسا نظام قائم کیا ہے کہ معاشی اعتبار سے کمزور افراد کو معاشی اعتبار سے مستحکم افراد کے خاندانوں کا حصہ بنا دیا ہے، اس طرح مفلس اور غریب کارکنوں کو معاشی اور معاشرتی طور پر غیر معمولی سہارا دیا۔ اخوان میں مواخاۃ کے اس نظام کا بڑا سبب ان کے ہاں موجود تعلق باللہ کے استحکام کا نظام ہے اور ذکر واذکار اور عبادت کے ذریعہ دلوں کی تبدیلی کا نظام ہے۔ ورنہ اس طرح کا رضاکارانہ نظام محض نظم وضبط اور عقلوں کی تبدیلی، نظریاتی ذہن سازی اور لٹریچر اور وعظ ونصیحت سے ممکن نہیں۔

حسن البنا کی شخصیت میں اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی کشش رکھی تھی۔ بالکل اس طرح کی کشش، جو یہاں حضرت مولانا الیاس رحمتہ اللہ علیہ کی شخصیت میں تھی، جو شخص ایک بار عقیدت سے ان کی صحبت میں آیا، وہ حرارت اور گرمی محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا، چنانچہ حسن البنا کی شخصیت سے ہر مکتبہ فکر کے ذہین وباصلاحیت افراد متاثر ہوکر اخوان کا حصہ بن گئے۔

اخوان المسلمون نے نہ صرف مصری معاشرہ میں تبدیلی برپا کی، بلکہ پورے عالم عرب میں اس کے اثرات پھیلنے لگے۔ یہ ایسی چیز تھی، جو عالمی سرمایہ دار اور بین الاقوامی یہودیت کے لئے ناقابل برداشت تھی، چنانچہ ۱۹۴۹ء سے اخوان پر مسلسل وار کئے گئے۔ ۴۹ میں حسن البنا شہید کئے گئے، اس کے بعد اخوان پر پابندی عائد کرکے، ان کی قیادت کو پھانساں دی گئیں۔ اخوان پر ابتلا وآزمائش کا یہ عمل پچھلے ستر، اسی سال سے مسلسل جاری ہے۔ اس طرح انہیں معاشرہ میں یکسو ہوکر دعوتی کام کرنے اور معاشرہ کو بڑی حد تک تبدیل کرکے انہیں اپنی پشت پر کھڑا کرنے کا بہتر طور پر موقعہ ہی نہیں مل سکا۔

ہماری نظر میں اخوان سے شروع سے حکمت عملی کی جو غلطی ہوئی، وہ وقت سے پہلے سیاسی تبدیلی کا کام ہاتھ میں لینا تھا۔ اگر اخوان بیس پچیس سال تک صبر سے دعوتی اور علمی

محاذ پر ہمہ جہتی کام کرتے رہتے، عالمی سرمایہ دار اور بین الاقوامی یہودیت کو چیلنج دیئے بغیر اپنی ساری قوتیں افراد معاشرہ کی ذہنی واخلاقی تربیت میں صرف کرتے تو محاذ آرائی سے بچ کر وہ معاشرہ کو بڑی حد تک تبدیل کرنے میں کامیاب ہوتی اور اُس وقت جب قوم کے مؤثر طبقات اور پوری قوم ان کی پشت پر کھڑی ہوتی تو اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر مصر کی ریاستی قیادت انہی کے ساتھ میں ہوتی یا ان کے تیار کردہ افراد کے ہاتھ میں ہوتی اور عالمی سرمایہ دار پوری قوم سے مقابلہ کے قابل نہ ہوتا اور نہ ہی اسے اس سلسلہ میں مصری معاشرہ سے طاقتور افراد ملتے۔

حکمت عملی کی اس غلطی کو حسن البنا نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں شدت سے محسوس کر لیا تھا، اور اس حکمت عملی میں تبدیلی کی صورت بھی پیدا ہوتی، لیکن سید قطب شہید نے اپنی فکر میں سیاسی تبدیلی کے کام کو دین کے نصب العینی کام کی حیثیت سے پیش کر کے اور اس پر اپنی عملی وذہنی توانائیاں صرف کر کے اہم لٹریچر تیار کیا، اس طرح اخوان کے سیاسی رخ میں مزید اضافہ ہوا۔

اگرچہ موجودہ دور میں اعلائے کلمۃ اللہ، اقامت دین اور اسلام کے سیاسی غلبہ کی بات کو بلند آہنگی سے پیش کرنا اور اسلام کے اس بڑے محاذ کو سنبھالنے کے لئے کوشاں ہونا اور اسلامی فکر کی پیشکش میں اسے نمایاں اہمیت دینا ہر اعتبار سے ضروری ہے۔ تاہم اسے دین کے نصب العینی کام کی حیثیت سے پیش کرنے سے دین کے دوسرے بنیادی کاموں کی حیثیت مجروح ہوتی ہے اور دین کے خارجی نوعیت کی جدوجہد کے کام داخلی جدوجہد کے کاموں پر غالب ہونے لگتے ہیں، پیر حسن البنا کی فکر میں سیاسی تبدیلی کا کام حکمت عملی کا حصہ تھا یا حمیت دین کا نتیجہ تھا کہ دین اور ملت کو دشمنوں کی یلغار سے نجات دلانے کی صورت یہی ہے کہ ریاستی نظام میں تبدیلی برپا کی جائے، اس تبدیلی کے لئے بھی وہ افراد کی روحانی، اخلاقی وباطنی تبدیلی، وتطہیر کو ناگزیر سمجھتے تھے، اس لئے کہ وہ خود ایک ممتاز صوفی کی صحبت کے ذریعہ برسوں تک مجاہدوں کے عمل سے گذرے تھے۔

مصر میں پچھلے ستر سال سے اخوان المسلمون کے کارکنوں کے ساتھ جبر وستم کی جو کارروائیاں ہوتی رہی، صدر ناصر کے دور حکومت میں پچاس ہزار سے زائد اخوان کارکنوں کو گرفتار کر کے، جیلوں میں ان سے جو انسانیت سوز سلوک ہوتا رہا اور اب السیسی نے ان

پر جبر وستم کے جو پہاڑ توڑے ہیں، لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں مجاہدوں، شہیدوں اور غازیوں کے درجات عطا فرمانا چاہتا ہے، مادیت کے اس دور میں شہادت اور غازیوں کا مقام حاصل ہونا، اس سے بڑھکر دوسری سعادت اور کیا ہوسکتی ہے۔

اللہ کی حکمتوں اور مصلحتوں کو سمجھنا فرد وافراد کے بس کی بات نہیں۔ اللہ نے بیسیوں صدی میں حسن البنا اور مولانا الیاسؒ کی صورت میں دو عظیم داعی پیدا کئے، جنہوں نے افراد ملت کو سرگرم ومتحرک کر دیا اور اسلام کے لئے ایثار کے جذبات پیدا کئے، اور لاکھوں سے زیادہ افراد کو دین کی راہ پر لگایا۔ لیکن ہماری ناقص نظر میں اخوان کا وقت سے پہلے سیاست میں عمل دخل اور تبلیغی جماعت کے ہاں دعوتی حکمت عملی میں جدید تقاضوں کو پوری طرح پیش نظر نہ رکھنے اور چھ نکات سے آگے نہ بڑھنے کے عمل نے ملت میں وہ نتائج پیدا نہیں ہونے دیئے، جو ان جماعتوں کی تیز رفتاری سے ترقی دیکھتے ہوئے ان سے بجا طور پر متوقع تھے۔

اخوان المسلمون کی دینی خدمات اور ان کے کردار کے سلسلہ میں ''صدق جدید'' کے ۲۸ جنوری ۱۹۵۵ کے شمارے میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا ''اخوان کی مظلومیت'' کے عنوان سے ایک تفصیلی خط نما مضمون چھپا ہے، یہ مضمون دراصل انہوں نے مولانا عبدالماجد دریابادی کے ایک ادارتی نوٹ کے جواب میں لکھا ہے، جس میں ۱۹۵۴ء میں پانچ اخوانی شخصیتوں کو صدر ناصر کے قتل کے جرم میں ملنے والی پھانسی کی سزا کی حمایت وتائید کی گئی تھی (ان شخصیتوں میں عبدالقادر عودہ جیسی ممتاز علمی شخصیت بھی شامل تھی)۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کا یہ ادارتی نوٹ معلومات کے فقدان یا مولانا کے مخصوص نقطہ نگاہ کی علامت تھا۔

ہم یہاں مولانا علی میاں کے اس مضمون کے کچھ اقتباسات پیش کر رہے ہیں۔

(۲)

جناب والا کو علم ہے کہ موجودہ ہندوستانی مسلمانوں میں سے اگر کسی شخص کو مشرق اوسط سے قریبی واقفیت اور وہاں کی شخصیتوں اور تحریکوں سے تعارف کے زیادہ سے زیادہ قابل اعتماد ذرائع اور طویل مواقع حاصل ہوئے ہیں تو بلاشائبہ تکبر عرض ہے کہ وہ آپ کا

یہ نیازمند ہے۔ جناب کو میری افتادِ طبیعت کا بھی اندازہ ہے کہ عمومی تحریکات اور ہنگاموں سے مجھے زیادہ مناسبت نہیں اور خود بھی ایک خاموش دیرحاصل تعمیری و تعلیمی کام میں مشغول ہوں، لیکن اس کو ایک شہادت حق سمجھ کر عرض کرتا ہوں کہ پورے مشرق اوسط میں صرف الاخوان ہی وہ جماعت ہے جو الحاد وزندقہ اور ذہنی وتہذیبی ارتداد اور لادینیت کے راستہ میں سنگ گراں ہے۔ اور اس سے ان آمادہ الحاد ممالک میں دینی نشاۃ ثانیہ کی امید کی جاسکتی ہے، میرے سامنے ۴۷ء کا شرق اوسط منظر ہے اور ۱۵ء کا بھی، میں نے اس مختصر سے وقفہ میں زمین آسمان کا فرق دیکھا، جو عرب نوجوان ملحدانہ خیالات پر فخر کرتے تھے اسلام کے انتساب سے شرماتے تھے۔ میں نے چار برس کے اندر ان میں یہ انقلاب دیکھا کہ وہ اسلام پر فخر کرنے لگے اور اپنے عمل واخلاق سے اس کا مظاہرہ کرنے لگے، جو دیندار پارکوں اور عمومی مقامات پر نماز پڑھنے سے شرماتے تھے وہ برسرِ راہ اور منظر عام پر جرأت کے ساتھ فریضہ ادا کرنے لگے ہیں ان سے پوچھا تو انہوں نے صاف کہا کہ یہ ''الاخوان المسلمون'' کی دعوتی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔

مصر کی صحافت، مجلسی زندگی اور ادب میں خدا کا نام لینا اور اسلام کی دعوت دینا اکبر مرحوم کے الفاظ میں سوسائٹی کا جرم ہوگیا تو طہٰ حسین۔ محمد حسین ہیکل۔ عباس محمود العقاد خود مسلمانوں میں سے لادینیت اور الحاد کے نقیب تھے۔ الاخوان کی دعوت نے اسلامی حس اور ضمیر کو ایسا بیدار کیا کہ ان کے لئے ان ملحدانہ خیالات کی اشاعت مشکل ہوگئی، اسی طرح اس نے اس مخالف اسلام ''ادبی اجارہ داری'' کو بھی ختم کیا اور نئے مسلمان ادیب سید قطب۔ محمود محمد شاکر علی طنطاوی وغیرہ پیدا کئے جنہوں نے خالص ادبی حلقوں پر بھی اپنے قلم کا سکہ بٹھادیا۔ اسی طرح نئے ماہر طبعیات ماہر کیمیا۔ ماہر ہیئت وفلکیات پیدا کئے، جنہوں نے ان مضامین پر فاضلانہ کتابیں تصنیف کیں اور ان کے اندر کھل کر اپنی اسلامیت اور اسلامی فکر کا اظہار کیا۔ جامعہ فواد (حال جامعۃ القاہرہ) میں کسی دینی شخصیت کو بلانا اور اسلامی تقریر کرانا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا، فضا ایسی مخالف تھی کہ دینی تقریر مضحکوں اور قہقہوں کے شور میں گم ہوجاتی، اخوانی نوجوانوں نے طلبہ کی مجالس (یونین وغیرہ) پر قبضہ کیا اور ملحد عناصر کو طلبہ کی تنظیمات سے بے دخل کر دیا، گذشتہ انتخاب میں جامعۃ القاہرہ وغیرہ کی مجالس پر اخوان کا پورا قبضہ ہوگیا تھا، مصر میں اب بھی چہرہ پر داڑھی اور جیب میں

چھوٹا سا قرآن شریف، اخوانی نوجوانوں اور طالب علم کی علامت سمجھی جاتی ہے اور مصری پولیس کا بیان ہے کہ گذشتہ ہنگامہ (ابراہیم عبدالہادی پاشا کے دور میں) گرفتاری اور خانہ تلاشی کے لئے اخوانی نوجوانوں کی یہی پہچان بتلائی گئی تھی۔

بلاشبہ مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ اخوان کی تحریک نے ایمانی حرارت اور حمیت اسلامی کی چنگاریوں کو سارے ملک سے جمع کرلیا اور وہ اس وقت ایمانی حرارت اور اسلامی حمیت کا سب سے بڑا مخزن ہے۔ اس کا نتیجہ تھا کہ فلسطین کے معرکہ میں جو کم سے کم عالم عربی کے لئے موت وحیات کی کشمکش تھی، انکے نوجوانوں نے وہ کام انجام دیا، جو سات عربی حکومتوں سے مل کر بھی بن نہ آیا مصری افسران فوج نے جو محاذ جنگ پر موجود تھے، اس کا برملا اعتراف کیا ہے۔

آپ یہ سب ملاحظہ فرما کر ارشاد فرمائیں گے کہ یہ سب تسلیم اور باعث مسرت! لیکن اس سے ایک مسلمان حکومت کے خلاف بغاوت دہشت انگیز ہی کا جواز کہاں سے نکلتا ہے۔ خوارج میں یہی بڑی ایمانی حرارت اور جذبہ تھا، لیکن ہر جمے جمائے نظام اور ہر حکومت کے خلاف بغاوت اور جہاد کرنا ان کا تاریخی شعار ہے۔

میں بڑے ادب سے عرض کروں گا، کہ میری مستند معلومات یہ ہیں کہ اخوان کو اس معرکہ میں گھسیٹا گیا ہے اور ایسے حالات پیدا کئے گئے ہیں کہ ان پر بغاوت کا الزام لگا کر ان کے زعما کو پھانسیاں دی جائیں اور ان کی تحریک کو ہمیشہ کے لئے کچل دیا جائے کہ آیندہ کے ملحدانہ منصوبوں اور برسرِ حکومت جماعت کی آزادی اور مطلق العنانی کے لئے اس تحریک وجماعت کا وجود سب سے بڑا خطرہ تھا، میرے پاس اس بات کے ثبوت کے لئے مسلسل ومفصل واقعات ہیں، جن کی ایک جھلک اس مضمون میں دیکھی جا سکتی ہی، جو ''اخوان کا مقدمہ تصویر کا دوسرا رخ'' کے عنوان سے قومی آواز اور الجمعیۃ میں شائع ہو چکا ہے اور آپ کی نظر عالی سے ضرور گذرا ہوگا۔

آپ فرمائیں گے کہ یہ سب یک طرفہ بیانات ہیں، میں اس کے جواب میں اس سے زیادہ کیا گزارش کرسکتا ہوں کہ باور کرنے کے لئے اور خارجی شہادتیں بھی موجود ہیں اور عرب ممالک بالخصوص شام لبنان اور عراق کے آزاد اسلامی پریس نے انہیں واقعات کو دہرایا ہے اور الاخوان کو مظلوم ٹھہرایا ہے حجاز کو چھوڑ کر تمام عرب ممالک میں حکومت مصر

کے خلاف اتنی نفرت کا اظہار کیا گیا ہے کہ خود حکومت مصر مضطرب ہوگئی اور اس نے اس کے خلاف احتجاج کیا۔

مجھے ذاتی طور معلوم ہے کہ شیخ حسن البناء مرحوم کی شہادت کے بعد الاخوان میں عملی سیاست سے کنارہ کشی کا اچھا خاصا رجحان پایا جاتا تھا۔ اور ایک طاقتور اور موثر گروہ تھا جو اخوان کی سرگرمیوں کو (حالات کے سازگار ہونے تک) اصلاحی وتربیتی دائرہ میں محدود رکھنا چاہتا تھا۔ اس گروہ کی قیادت خود استاذ حسین الحضیبی کرتے تھے، ان کا یہ رجحان ان کے اس دیباچہ ظاہر ہوتا ہے، جو انہوں نے میرے رسالہ ''اریدان التحدیث الی الاخوان'' کے تیسرے ایڈیشن کے لئے لکھا تھا۔ حسن الحضیبی کا مرشد عام کے منصب کے لئے انتخاب اس رجحان اور اس مکتبہ خیال کی فتح تھی۔ اسی بنا پر مصر کی فوجی حکومت نے تمام سیاسی پارٹیوں کو ختم کرنے کے باوجود الاخوان کو باقی رکھا، اور الاخوان اور مرشد عام نے اپنے امکان بھر فوجی حکومت کو اخلاقی امداد پہونچائی اور اس سے پورا تعاون کیا، لیکن دو واقعات ایسے پیش آئے کہ کسی غیر سیاسی سے غیر سیاسی جماعت کے لئے ان سے بے تعلق رہنا اگر ناممکن نہیں تو حد درجہ وشواد ہے۔ (صدق جدید ۲۸ جنوری ۱۹۵۵ء)

(۳)

مولانا علی میاں نے ''کاروان حیات'' کتاب میں بھی اخوان المسلمون کے بارے میں اپنے تجربات ومشاہدات کے حوالے سے اپنے تاثرات بیان فرمائے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''جب مصر کا سفر پیش آیا، تو مجھے اس کی شدید خواہش تھی کہ اخوان کی تحریک کا مطالعہ کروں اور اس کے متعلق براہِ راست معلومات حاصل کروں، شیخ کے پرانے رفیقوں، ان کے معتمدین اور ان کے تربیت یافتہ نوجوانوں سے ملاقات کروں اور اس عظیم الشان دعوت کے اصول ومبادی، اور اس کی کامیابی کے اسباب معلوم کروں، ۱۹۴۹ء میں شیخ کی شہادت کا واقعہ پیش آچکا تھا، لیکن میری خوش قسمتی سے اس وقت شیخ کے تمام پُرانے رفقاء وشرکاء کار اور ان کے تلامذہ وحلقۂ احباب کے خواص موجود تھے، میری عربی تصنیف ''ماذا خسر العالم بالخاط المسلمین'' جو میرے سفر مصر سے چند ہی مہینے قبل شائع ہوئی تھی، اخوان کے حلقہ میں کثرت سے پڑھی گئی تھی، اور اخوان نے اپنی روایتی فراخدلی اور بے تعصبی

سے اس کو اپنے مخصوص تبلیغی لٹریچر میں جگہ دی تھی، یہ کتاب میرا ذریعۂ تعارف تھی، پھر ہندی مسلمان ہونا اور ایک معروف ادارہ سے تعلق رکھنا، اخوان کے لئے (جو عالم اسلام کی وحدت اور تعارف وتعاون کے سب سے بڑے داعی ہیں) کافی وجہ کشش تھی، جہاں تک شیخ کے متعلق تاریخی وشخصی معلومات کا تعلق تھا، اس کے لئے سب سے مستند اور قابلِ اعتماد ذریعہ ان کے والد محترم شیخ احمد عبدالرحمٰن البنا کی ذات تھی، جنہوں نے ازراہِ شفقت بزرگانہ اپنے قابلِ فخر وذریعہ نجات فرزند کے متعلق تمام ضروری وجزوی معلومات فراہم کیں۔ ان کے علاوہ شیخ کے رفیق درس وشریکِ کار اور اخوان کے مربی استاذ بہی الخول (صاحب ''تذکرۃ الدعاۃ'') اس عاجز کے مخصوص دوستوں اور کرم فرماؤں میں تھے، انہوں نے بحیثیت ایک دوست، رفیق، مشاہد ومعاصر کے اپنے مشاہدات، معلومات اور تاثرات سنائے، ان دونوں بزرگوں کے علاوہ، ان چند نوجوانوں سے بھی ملاقات ہوئی، جو شیخ کے معتمد خاص، سکریٹری اور دست راست رہ چکے تھے، مثلا استاذ صالح عشماوی مدیر الدعوۃ، استاذ منیسر ولہ جج ہائی کورٹ، استاذ عبدالحکیم عابدین، استاذ سعید رمضان، استاذ فرید عبدالخالق، ان اصحاب سے شیخ کی زندگی اور ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کے متعلق مستند معلومات حاصل ہوئیں اور ایسا محسوس ہوا کہ ان حضرات سے ملنے کے بعد شیخ کی زیارت سے کلی طور پر محرومی نہیں رہی۔

ان اصحاب سے جو کچھ سنا اور خود شیخ کے جو اثرات دیکھے، اس سے اس بات کا یقین پیدا ہوا کہ ان کی شخصیت تاریخ کی ان غیر معمولی شخصیتوں میں سے تھی، جن کو اللہ تعالیٰ کسی تحریک ودعوت کو چلانے اور کسی عہد میں اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لئے پیدا فرماتا ہے اور اس کو قیادت کی وسیع اور متنوع صلاحیتیں عطا فرماتا ہے، وسیع وروشن دماغ، گرم وپرمحبت ودردمند دل، فصیح وبلیغ زبان، تسخیر کرلینے والے اخلاق، دل آویز شخصیت، یہ ان کے عناصر ترکیبی تھے، میں جب اقبال کا یہ شعر پڑھتا ہوں تو بے ساختہ شیخ حسن البنا کی شخصیت، آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے انہیں کو دیکھ کر کہا ہے۔

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

بدقسمتی سے جس زمانہ میں میرا قیام مصر میں تھا، اخوان کی تحریک خلافِ قانون تھی اور ان کے اجتماعات نہیں ہو سکتے تھے، لیکن اس اعتماد کی بناء پر جوان کے ذمہ داروں کو میری حقیر ذات پر پیدا ہوگیا تھا، مجھے ان کی مخصوص مجلسوں میں شرکت کی عزت حاصل ہوئی، مجھے ان کے حالات وخیالات سننے اور اپنے ناچیز خیالات پیش کرنے کا موقع مِلا، ایک مخصوص مجلس میں، جس میں اخوان کی مجلس انتظامی (مکتب الارشاد) کے ارکان اور دل ودماغ شریک تھے، مجھے منضبط طور پر اپنے خیالات اور تجربات پیش کرنے کا موقعہ مِلا، اخوان نے ان کی جس درجہ پذیرائی کی، اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ انہوں نے اس کو علٰحدہ رسالہ کی شکل میں شائع کیا، اور جب تک اخوان کی تحریک دوبارہ خلاف قانون قرار نہیں دی گئی، اس کے تین ایڈیشن شائع ہوئے۔ اس رسالہ کا نام ہے ''اریدان اتحدث الی الاخوان'' (اخوان سے دو دو باتیں) مجھے کسی دینی وسیاسی جماعت کے متعلق اتنی فراخدلی اور عالی ظرفی کا تجربہ نہیں ہوسکا۔

اسی زمانۂ قیام میں مجھے شیخ محمد الغزالی کی معیت میں (جو اخوانی لٹریچر کے سب سے بڑے مصنف ہیں) مصر کے قصبات اور دیہاتوں میں بارہا جانے کا اتفاق ہوا، ہر جگہ اخوان کے دینی جوش وخروش، مہمان نوازی اور اسلام دوستی، محبت واخلاص اور بے تعصبی وسیع النظری کے ایسے مناظر دیکھے، جو ساری عمر یاد رہیں گے اور جن سے شیخ حسن البنا کی تربیت وتاثیر اور ان کی مردم گری، اور سیرت سازی کا اندازہ ہوا، اور معلوم ہوا کہ اس شعلۂ جوالہ نے کتنی ایمانی حرارت پیدا کردی ہے۔'' (کاروان حیات، جلد اول صفحہ ۳۷۸۔۳۷۶)

''اخوان کی تحریک کا سب سے کامیاب اور روشن پہلو یہ ہے کہ اس نے مصر (اور اس کی پیروی میں ممالک عربیہ) کے بڑھتے ہوئے الحاد ولادینیت کے دھارے کو روکا اور دین کے استخفاف وبے وقعتی اور ذہنی ارتداد وبغاوت کا جو رجحان روزافزوں تھا، اس پر اثر انداز ہوئی، جو لوگ مصر کی صحافت وادب سے واقف ہیں، وہ خوب جانتے ہیں کہ اس ملک میں دین کے خلاف ایک منظّم سازش اور کوشش تھی، مصر کے ادیبوں اور صحافیوں، مصنفین وباحثین سب نے دین کے خلاف ایک محاذ بنا رکھا تھا اور انقلاب فرانس کے علمبرداروں کی طرح وہ پوری مصری اسلامی سوسائٹی کو اپنے ''ترقی پسند'' ادب، اپنے ''شک آفریں

خیالات وتحقیقات'' اپنے طنز وتمسخر سے ڈائنا میٹ کررہے تھے اور ''**یوحی بعضهم الیٰ بعض زخرف القول غرورا**'' کا مصداق تھے، اس متحدہ محاذ کے خلاف کسی دینی جماعت، حتیٰ کہ ازھر تک میں آواز بلند کرنے اور اس کا مقابلہ کرنے کی جرأت نہ تھی، اخوان کے مخالفین کو بھی اعتراف ہے کہ اخوان کی تحریک نے اس مورچہ کو کمزور وخوف زدہ کر دیا، الحاد کی علانیہ دعوت دینے اور دین کے استخفاف کی جرأت بڑے بڑے زعمائے ادب کو نہ رہی، اخوان نے غیور نوجوانوں اور صاحب حمیت مسلمانوں کا ایک ایسا لشکر پیدا کر دیا کہ ملحدین کو اپنے ملحدانہ خیالات وتصنیفات کی اشاعت، اور اخبارات ورسائل کو دین واسلامی تہذیب کے ساتھ تمسخر واستہزاء کی جسارت باقی نہ رہی، پھر اس کے ساتھ اس نے اسلام پسند ادیبوں، ناقدین واہلِ قلم اور ماہرین فن کی ایسی جماعت پیدا کی، جو علمی وفنی طور پر، ان ملاحدہ کا مقابلہ کرسکیں اور اسلامی ادب کو پیش کریں، اخوان کا یہ کارنامہ اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ کوئی شخص جس کے دل میں نورِ ایمان ہے، اس کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا، راقم سطور کے سامنے چونکہ ان ممالک کی سابقہ زندگی، اور موجودہ دینی وفکری انقلاب ہے اور اس کو اپنے طویل قیام کی بنا پر اس کا مشاہدہ وتجربہ ہو چکا ہے کہ اخوان نے جدید نسل کے دل ودماغ کو کس طرح متاثر کیا ہے اور دین وشعائر دین کے اظہار واعلان کی کیسی جرأت پیدا کردی ہے اور جو لوگ دینی مظاہر وشعائر اور دینی عقائد وحقائق کے اظہار میں شرمندگی اور حقارت محسوس کرتے تھے، اب کس طرح علانیہ منظر عام پر دینی فرائض وشعار کو ادا کرتے ہیں اور احساس کمتری کے بجائے برتری کا احساس رکھتے ہیں، ان ذاتی مشاہدات وتجربات کا نتیجہ تھا کہ ہندوستان میں میری زبان سے ایک تقریر میں اخوان کے متعلق بے ساختہ یہ لفظ نکل گئے کہ:

''**لایحتبهم الا مومن ولا یبغضهم الا منافق**'' (اخوان سے اسی کو محبت ہوگی جس کے دل میں ایمان ہے، اور اسی کو نفرت ہوگی جس کے دل میں نفاق ہے۔)

تاریخ اسلام میں جن جرائم اور سفاکیوں نے ملتِ اسلامیہ کو عظیم ترین نقصان پہنچایا، اور تاریخ کا دھارا بدل دیا، ان میں ایک شیخ حسن البنا کا مجرمانہ قتل ہے، جس نے کم سے کم مشرق وسطیٰ کو ایک مفید ترین شخصیت سے محروم اور صالح دینی انقلاب سے عرصہ تک کے لئے بہت دور کر دیا۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر اخوان کچھ عرصہ اور عملی سیاست میں حصہ نہ لیتے (یا اس عملی سیاست میں الجھا نہ لئے جاتے) اور اپنا اصلاحی ودعوتی کام پوری قوت سے جاری رکھتے تو ممالک عربیہ میں ایک اسلامی انقلاب برپا ہوجاتا، اور ایک نئی زندگی پیدا ہوجاتی، مجھے مستند اور باوثوق ومتعدد ذرائع سے معلوم ہوا کہ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں شیخ حسن البنا کو خود اس کا شدید صدمہ اور قلق تھا کہ ان کو قبل از وقت سیاسی میدان میں اترنا پڑا، اور ان کا دامن ان کانٹوں سے الجھ گیا، ان کو اس کی بڑی تمنا تھی کہ ان کو پھر خالص دعوتی وتربیتی کام کا موقعہ ملے اور وہ جماعت اور جمہور مسلمین میں وہ استعداد پیدا کرلیں، جس کے بعد وہ ہر طرح کی ذمہ داری کو پورا کرسکیں اور ہر امتحان وآزمائش سے گزر سکیں۔ (''کاروان حیات'' صفحہ ۳۸۰ سے ۳۸۲)

مولانا عبید اللہ سندھی
کی فکر پر ایک نظر

زیر نظر مضمون مفتی رضوان احمد صاحب کی مرتب کردہ کتاب ''مولانا عبید اللہ سندھی کے افکار اور تنظیم ولی الٰہی کے نظریات کا تحقیقی جائزہ'' پر تبصرہ کے طور پر لکھا گیا ہے۔

زیر نظر کتاب مولانا عبیداللہ سندھی کی فکر پر سیر حاصل تنقیدی کتاب ہے، کتاب میں شامل بیشتر مضامین وہ ہیں، جو مولانا سندھی کی زندگی میں ہی برصغیر ہند کی ممتاز اور مسلمہ علمی شخصیتوں اور علماء وفضلا نے لکھے تھے۔ ان سارے مضامین کو مفتی رضوان احمد صاحب نے کتابی صورت میں جمع کرکے، اپنے ادارہ کی طرف سے شائع کیا ہے۔

مفتی رضوان احمد صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے مولانا سندھی کی فکر جو پچھلے سو سال سے مذہبی طبقہ کے ذہین افراد کی مارکسزم سے ہمہ آہنگ ذہن سازی کا کردار ادا کر رہی ہے، علمائے ہند کی تحریروں کے آئینہ میں اس فکر کے صحیح خدوخال بہتر طور پر واضح کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ یہ کام جو آج سے ساٹھ ستر سال پہلے ہونا چاہئے تھی، وہ تاخیر سے ہی سہی، بہرحال اہم کام ہے، اس پر مفتی صاحب، صحیح اسلامی فکر کے حاملوں کی طرف سے تحسین وتبریک کے مستحق ہیں۔

مولانا عبیداللہ سندھی، انقلابی ذہن وفکر کی حامل شخصیت تھے، برصغیر کی آزادی کے سلسلہ میں ان کی جدوجہد بھی مثالی نوعیت کی ہے۔ مولانا سندھی کی شخصیت میں بزرگوں کی صحبت سے دنیا سے بے نیازی، زہد، توکل، قناعت، اور درویشی جیسی صفات بھی موجود تھی، لیکن ان کی انقلابی فکر نے انہیں اسلام کی ایسی تشریح کرنے پر مجبور کیا، جس میں مالداروں کے خلاف جہاد اور انقلابی جدوجہد کو دین کا نصب العین قرار دیا گیا ہے۔ اس فکر کو مولانا کے متعدد شاگردوں نے پھیلانے میں اپنی زندگیاں صرف کر ڈالیں۔ مولانا سندھی نے

سارے قرآن کی تشریح اسی انقلابی فکر کی بنیاد پر کی اور دین کی ساری تعلیمات کو اسی مرکزی نکتہ کے تابع بنا کر پیش کیا، نماز، روزہ، حج زکوٰۃ وغیرہ ان سارے فرائض کو اس جہاد کی ادائیگی کے ذریعہ کے طور پر پیش کیا، چنانچہ اس رنگ میں تفسیری نکات پر مشتمل قرآن کی متعدد تفاسیر سامنے آئیں، جس میں سلف سے متصادم قرآن کی جدیدیت سے ہمہ آہنگ نئی تعبیر سامنے آئی، مولانا سوویت یونین جانے سے پہلے ہی اس فکر کے علمبردار بن چکے تھے، اور متعدد طلبا تیار کر چکے تھے۔ لیکن سوویت یونین میں قیام کے بعد ان کی اس فکر پر یقین میں مزید پختگی پیدا ہوگئی اور اس فکر میں مارکسزم کے مزید اجزاء شامل کرنے کا داعیہ پیدا ہوا، چنانچہ مولانا فرماتے ہیں کہ مجھے اسلام کی حقیقی روح سوویت یونین (روس) میں جا کر حاصل ہوئی۔

حضرت مولانا عبید اللہ سندھی کی جلاوطنی سے واپسی کے بعد انہیں سب سے زیادہ پذیرائی سندھ میں حاصل ہوئی اور سندھ کے علماء، ان کی شخصیت پر ٹوٹ پڑے اور متعدد بڑے علماء نے اپنی زندگیاں اس فکر کے فروغ میں صرف کر ڈالی۔

سندھ میں دیوبند مکتبہ فکر کے علمائے کرام یا تو مولانا سندھی کی فکر کے داعی رہے ہیں اور اب ہیں۔ یا پھر مولانا سندھی کی فکر سے ہمدردی کا میلان رکھتے ہیں۔ ایسے علماء کرام، جو اس فکر کی کمزوری کو سمجھکر اسے صحیح اسلامی تسلسل کے لئے نقصان دہ تصور کرتے ہوں، نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ سندھ کی اس دور کی سب سے بڑی بزرگ شخصیت نے مولانا سندھی کے ایک شاگرد کے ہاں بارہ سال تک دینی علوم حاصل کئے، موصوف کی شخصیت تقویٰ، روحانیت اور بزرگی کے اعتبار سے مثالی شخصیت تھی، لیکن فکری طور پر وہ مولانا سندھی کی فکر کے زیر اثر تھی، جس کے نتیجہ میں سندھ کے دیوبند مکتبہ فکر کے خاصے علما کرام اور ذہین افراد کی ذہنی نشوونما اس فکری سانچہ میں ہوئی۔

ادھر کراچی سے مولانا محمد صادق کھڈویؒ اور ان کے مدرسہ سے اَسی سال سے مارکسزم کے اجزاء کے حامل اس فکر کی فروغ پذیری کا کام ہورہا ہے۔ روہڑی (سکھر) سے

ایک مولانا اور مفتی صاحب پچھلے پتیس سال سے ''شریعت'' کے نام سے سندھی زبان میں باقائدہ رسالہ نکل رہا ہے، اس رسالہ نے بھی مولانا سندھی کی فکر کی اشاعت میں کردار ادا کیا ہے۔ کراچی میں سندھیکا کے نام سے ادارہ نے اس فکر پر سندھی زبان میں بیسیوں کتابیں شائع کی ہیں۔ سندھ ساگر پارٹی کے پلیٹ فارم سے مولوی عزیز اللہ بوہیو صاحب بھی عرصہ سے سرگرم ہیں اور سندھ میں نئی نسل کی ایک ذہین ٹیم تیار کر چکے ہیں مولوی عزیز اللہ صاحب پرویزی فکر کی حمایت اور نماز کی مخالفت میں بھی کئی کتابیں لکھ چکے ہیں۔

مفتی محمد رضوان صاحب کی زیر نظر کتاب ان سارے حلقوں میں پھیلانے کی ضرورت ہے۔ کتاب کی زبان کو مزید ناصحانہ بنا کر اس کا سندھی میں ترجمہ کرکے، اسے اس حلقہ تک پہنچانا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ کاش کہ اس کام کے لئے ایک دو کام کے افراد تیار ہوجائیں۔

مولانا سندھی کے ایک شاگرد پروفیسر محمد سرور صاحب تھے، جو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکھن میں پروفیسر تھے، اس وقت کے یونیورسٹی کے وائس چانسلر صاحب کو مولانا سندھی نے لکھا کہ میں چاہتا ہوں کہ میری فکر مدون ہوجائے، تاکہ زندگی بھر کے مطالعہ ومشاہدہ کے نتیجہ میں، میں امت کو جو فکر دینا چاہتا ہوں، اس سے استفادہ کی صورت پیدا ہو، اس مقصد کے لئے آپ مجھے باصلاحیت اور ذہین فرد دیدیں۔ وائس چانسلر موصوف نے یونیورسٹی کے استاد پروفیسر محمد سرور صاحب کو اس مقصد کے لئے مکہ میں مولانا کی خدمت میں بھیجا، موصوف نے مولانا کی فکر سے بھرپور استفادہ کیا، اور ''افادات وملفوظات مولانا عبیداللہ سندھی'' کے نام سے کتاب لکھی، جو مولانا سندھی کی نظرثانی یا بھرپور تائید سے چھپی ہے۔ اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے ہیں، اس کتاب نے مولانا سندھی کی فکر کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ پروفیسر محمد سرور صاحب نے متعدد کتابیں لکھی ہے۔ انہوں نے شاہ ولی اللہ کی فکر پر بھی قلم اٹھایا ہے۔

اس فکر کے نتیجہ میں پروفیسر موصوف کی جو حالت ہوئی، اسے ملک کے ممتاز دانشور

صحافی عبدالکریم عابد صاحب نے اپنی کتاب میں ظاہر کیا ہے، لکھا ہے کہ پروفیسر موصوف ایک زمانہ میں لاہور میں میرے محلّہ میں رہتے تھے، وہ کہتے تھے کہ میرا خدا پر یقین ختم ہوچکا ہے، عابد صاحب نے یہ بات مجھے خود بھی بتائی تھی۔ اسلام کا مارکسزم کا ایڈیشن تیار کرنے کا اس کے علاوہ اور کیا نتیجہ نکل سکتا ہے۔ (اللہ معاف فرمائے)۔

مولانا سندھی کے ایک دوسرے شاگرد الطاف جاوید صاحب تھے، جو پیر جھنڈو میں مولانا کے ہاں آٹھ ماہ تک پڑھے تھے، ان موصوف نے مولا سندھی کی قرآن کے حوالے سے انقلابی فکر کو فلسفیانہ بنیادیں فراہم کرنے کی کوشش کی اور طبقاتی جدوجہد کو تاریخ کے آئینہ میں پیش کیا، ان موصوف نے یہ نکتہ نگاہ بھی پیش فرمایا کہ قرآن کے نزول کی اصل ترتیب کو پیش نظر رکھا جائے، جو خالص طبقاتی نوعیت کی ہے۔ اس اعتبار سے قرآن، مالداروں اور سرداروں اور سرمایہ داروں کے خلاف سراپا غیظ وغضب ہے، اس موضوع پر ان کی کتاب، ''انقلاب مکہ اور فہم قرآن کے جدید منہاج'' کے نام سے مشہور ہے، موصوف نے مولانا سندھی کی فکر کو جدید نسل کے لئے قابل قبول بنانے کے لئے فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ تنظیم فکر ولی اللہی اور سندھ میں اس فکر کے ذہین نوجوان زیادہ تر الطاف جاوید صاحب کی کتابوں ہی سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔

سندھی علماء کے قابل ذکر اور مؤثر طبقہ میں اس وقت یہ فکر راسخ ہے کہ دور جدید میں مولانا عبیداللہ سندھی کی فکر ہی صحیح اور حقیقی اسلامی فکر ہے اور قرآن کا حقیقی پیغام یہی ہے۔

مولانا سندھی کے فکر کے کچھ اجزاء تو دین کے نئے نصب العینی ہدف کے سلسلہ میں ہیں۔ جو شعوری یا غیر شعوری طور پر مارکسزم سے ماخوذ ہیں۔ فکر کے کچھ اجزاء دین کی بعض اہم تعلیمات کے سلسلہ میں جدیدیت سے تاثیر پذیری اور ان کی نئی تعبیر کے سلسلہ میں ہیں۔ مثلا عبادت کی نئی تعبیر وتشریح، قصہ آدم وحیاء کی غلط توجیہ، عورتوں کے گھروں سے باہر نکل کر مردوں کے شانہ بشانہ کام کرنے کا نکتہ، نزول عیسیٰ علیہ السلام اور عقیدہ ظہور

مہدی کی اہمیت سے انکار، وحدت ادیان کے نظریہ کی حمایت ووکالت، نماز میں قرآن کا ترجمہ پڑھنے کی تلقین، کفار کے خلود جہنم کے عقیدہ سے انحراف، بعض قرآنی احکام اور سزاؤں میں تبدیلی کا نقطہ نظر اور داڑھی کی تقدیس کی تردید وغیرہ وغیرہ۔

مولانا کی فکر کے ان سارے نکات کے بارے میں زیر نظر کتاب میں کافی بحث موجود ہے۔ اس اعتبار سے یہ کہنا بجا ہوگا کہ مولانا سندھی کی فکر کی نوعیت اور ان کی کمزوریوں کو سمجھتے اور اس فکر کو ہر اعتبار سے سلف سے متضاد ومخالف فکر کے فہم کے سلسلہ میں زیر نظر کتاب مؤثر ترین کتاب ہے۔

ہماری نظر میں دعوتی نکتہ نگاہ سے اس کتاب کا متعلقہ حلقوں میں پھیلاؤ وقت کی اہم ضرورت ہے۔ تاکہ مولانا سندھی کے حوالے سے اسلام کے تسلسل کو پہنچنے والے نقصان سے بچاؤ کی صورت پیدا ہو سکے۔

کتاب میں جن ممتاز علماء وفضلا کے مضامین شامل ہیں، ان میں مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ مناظر احسن گیلانیؒ، مولانا ظفر احمد عثمانیؒ، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ مولانا مسعود عالم ندویؒ اور مولانا محمد تقی عثمانی، مولانا ڈاکٹر مفتی عبدالواحد اور مولانا ابن الحسن عباسی وغیرہ شامل ہیں۔

الحمدللہ ہم پچھلے پینتیس سال سے مولانا سندھی کی فکر میں موجود کمزوریوں کی نشاندہی کرتے رہے ہیں اور ہماری مختلف کتابوں میں یہ تنقید شامل ہے، لیکن چونکہ ہماری حیثیت ایک صحافی سے زیادہ نہیں، اس لئے طبقہ علماء میں ہماری اس آواز کو اہمیت نہیں دی گئی، ہماری آرزو تھی کہ طبقہ علماء میں کوئی شخصیت اس موضوع پر قلم اٹھائے، تاکہ عالم دین ہونے کی حیثیت سے طبقہ علماء میں ان کی آواز کو سنا جائے، مفتی رضوان احمد صاحب نے ہماری اس خواہش کو پورا کرکے، ایک دینی فریضہ سرانجام دیا ہے۔ الحمدللہ، مختصر عرصہ میں اس کتاب کو علماء کے طبقہ میں کافی پذیرائی حاصل ہوئی ہے، چند ماہ کے دوران کتاب کی

دوسری ایڈیشن شایع ہوئی ہے، متعدد علماء نے اس کتاب کے مطالعہ سے اپنی فکر میں تصحیح فرمائی ہے۔

مولانا سندھی کی فکر اور انقلابی شخصیت کے زیر اثر طبقہ علماء میں جو مثبت اثرات پیدا ہوئے، اس کا اعتراف بھی ضروری ہے۔ ان صحتمند اثرات میں سامراج کے کردار اور عالمی شاہوکار کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا ہوئے اور اس کے خلافِ انسانیت کردار کے خلاف مزاحمانہ رجحانات پروان چڑھے، دیوبند مکتبہ فکر سے وابستہ ایک مؤثر طبقہ کے افراد میں عالمی سامراج کی سازشوں کے بارے میں ادراک کا پیدا ہونا اور ان سازشوں کو ناکام بنانے کے سلسلہ میں اپنے حصہ کے کچھ نہ کچھ کردار ادا کرنے کی فکر کا ہونا، یہ بڑا کام ہے، جو شیخ الہند اور اس کے بعد مولانا سندھی کی انقلابی شخصیت کے زیر اثر پیدا ہوا۔ لیکن اس فکر کے نقصانات کا پہلو ایسا ہے، جو افادیت کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔ وہ پہلو یہ ہے کہ سرمایہ دار دشمنی اور ان کے خلاف جہاد کا کام دین کا نصب العینی کام شمار ہونے لگا اور دین کے سارے کام اس نصب العین کا ذریعہ قرار پائے۔ اس طرح کمیونزم سے ایک طرح کی ہمہ آہنگی کی صورت پیدا ہونے لگی اور پچھلے ستر اَسی سال سے سندھ ساگر پارٹی، تنظیم فکر ولی اللہی اور متعدد علماء کرام کی صحبت کے زیر اثر مذہبی طبقات کے ہزاروں افراد ایسے پیدا ہوئے جو کمیونسٹوں اور ترقی پسندوں کے لئے خام مال کے طور پر استعمال ہوئے اور جو دین کو اصلاح نفس، آخرت کی تیاری، پاکیزہ انسانی صفات اور اسلامی شریعت پر عمل پیرا ہونے کی بجائے خالص دنیاوی مقصد اور طبقاتی کشمکش کا باعث باور کرنے لگے۔

کتاب میں حضرت مولانا احمد لاہوریؒ کا خط بھی شامل ہے، جس میں حضرت موصوف نے مولانا سندھی کی سوویت یونین سے واپسی والی ان کی فکر سے برأۃ کا اظہار فرمایا ہے۔

واضح ہو کہ سوویت یونین جانے سے پہلے مولانا سندھی نے نئی طرز پر قرآن کی تشریح کے لئے جن دو شاگردوں پر غیر معمولی محنت کی تھی، ان میں ایک حضرت مولانا احمد

علی لاہوریؒ بھی شامل تھے۔

مولانا موصوف پر اس فکر کے کافی اثرات موجود تھے، لیکن سوویت یونین جانے کے بعد مولانا سندھی کے اس فکر میں جو مزید گہرائی و گیرائی آئی تھی، حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ اسے کسی صورت قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اس سلسلہ میں کتاب کے حوالے سے حضرت مولانا احمد لاہوریؒ کا خط پیش کیا جاتا ہے۔

مخدومی ومکرمی حضرت مولانا سلیمان صاحب ندوی دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ!

عرض ہے کہ حضرت مولانا عبیداللہ صاحب (سندھی) مرحوم سے میں نے طالبِ علمی کے زمانہ میں سارا قرآن شریف پڑھا تھا۔ اس وقت وہ تردیدِ شرک وبدعت اور اشاعتِ کتاب وسنت پر زیادہ زور دیا کرتے تھے۔ اس کے بعد جب انہوں نے دہلی میں نظارۃ المعارف القرآنیہ قائم کی، اس وقت واقعی ان کے ذہن میں دو چیزیں نمایاں تھیں، جن کا آپ نے اپنے ۱۱ رمضان المبارک کے گرامی نامہ میں ذکر فرمایا ہے۔

(۱) سیاست وحکومت وسلطنت کا تخیل زیادہ قوت کے ساتھ ان کے ذہن میں تھا، (۲) اور مسلمانوں کی موجودہ سیاسی غلامی پر قناعت کے زہر کا تریاق اسی طریقِ تفسیر کو قرار دیتے تھے۔

جناب والا کو یہ بھی یاد ہوگا کہ نظارۃ المعارف القرآنیہ کی کلاس میں پانچ گریجویٹس اور پانچ روشن خیال نوجوان عالم لیے گئے تھے۔ اسی لئے مولانا مرحوم نے سیاست وحکومت وسلطنت کے تخیل کو مدِ نظر رکھ کر ہم لوگوں کو قرآن شریف پڑھایا تھا۔

یہ عرض کرنا ضروری خیال کرتا ہوں کہ مولانا سندھی مرحوم کے قبل از ہجرت جو خیالات تھے، جن کی بنیاد خالص کتاب وسنت پر تھی، اور مسلکِ اسلاف سے نکلنا جرم عظیم سمجھتے تھے، میں فقط انہیں خیالات سے متاثر اور مستفید ہوں۔ بعد از ہجرت جو اُن کے خیالات میں مذہبا یا سیاستا تبدیلی آ گئی تھی، میں اس سے ہرگز متفق نہیں ہوا، حالانکہ وہ

مجھے اپنا ہم خیال بنانے میں مصر تھے، اسی لئے وہ مجھ سے آخر دم تک ناراض رہے، اور اسی مخالفت کے باعث بہت کچھ برا بھلا کہا کرتے تھے"۔

احقر الانام احمد علی عفی عنہ ۲۳ جون ۱۹۴۶ء (ماہنامہ معارف اعظم گڑھ جون ۱۹۶۵ء)

کتاب سے ایک بات اور جو سامنے آئی ہے، وہ یہ ہے کہ حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ کو مولانا سندھی کی فکر کے بارے میں کافی تشویش تھی کہ کہیں یہ فکر، طبقہ علما، اور علماء سے باہر فروغ پذیر نہ ہو، اس طرح قرآن وسنت کی سلف کی تعلیمات اور اس کی روح مجروح ہو، چنانچہ مولانا موصوف نے دیوبند مکتبہ فکر کے اس وقت کے اکابر علماء کو خطوط لکھے کہ اس فکر کے اثرات کے ازالہ کے لئے کاوش فرمائیں۔ حضرت مولانا یوسف بنوریؒ صاحب کے توجہ دلانے سے حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کا وہ مفصل بیان سامنے آیا، جس میں آپ نے کچھ اس طرح فرمایا ہے کہ مولانا سندھی کے آخری دور کے فکر کا شیخ الہند کی فکر سے کوئی تعلق نہیں۔

اس سلسلہ میں حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ نے حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کو جو خط لکھا تھا، اس کا جواب موصوف نے دیا ہے، وہ خط کتاب میں شامل ہے۔ وہ ہم استفادہ کی خاطر یہاں نقل کررہے ہیں۔

برادرِ محترم (جناب مولانا محمد یوسف بنوری) دامت مکارمہم (مجلس علمی سملک، ڈاک خانہ ریسی، ضلع سورت، گجرات)

بعد سلام مسنون! خط کا جواب بہت دیر سے دے رہا ہوں، معاف کیجئے۔

جو کچھ آپ نے مولانا عبیداللہ مرحوم کے سلسلہ میں لکھا ہے، میرے نزدیک یہ مسئلہ بے حد قابلِ توجہ اور اہم ہے، نہ صرف یہ ہی بلکہ جماعتِ دیوبند میں اب بہت سی شاخیں ایسی نکل رہی ہیں، جو آزادی کی مسموم ہوا سے کم وبیش متاثر ہیں، شاید کچھ مدت کے بعد ہمارے اکابر کا مسلک ایسا ملتبس (یعنی خلط ملط) ہوجائے کہ کوشش کرنے والوں کے

نزدیک بھی منقح (یعنی صاف) نہ ہو سکے۔ کئی مرتبہ اس سلسلے میں قلم اٹھانے کا خیال ہوا، لیکن کم ہمتی کے سوا کیا کہوں کہ کیا چیز مانع ہوئی۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ کے حقائق ولطائف کو جس طرح تیز مگر زہر آلودہ چھری سے ذبح کیا جارہا ہے، اس کا احساس بہت ہی دردناک ہے۔

خط میں زیادہ لکھنے کا موقع نہیں، انشاء اللہ اُدھر آنا ہوا تو زبانی اس پر تفصیل سے صحیح مشورہ ہوجائے گا۔ یہ کوئی جزئی چیز نہیں، ایک فتنہ ہے، جس کے آغاز کا انجام خدا جانے کہاں تک پہنچے۔ آپ کا دینی احساس اور صحیح مسلک کے لئے غیرت وجوش یقیناً مستحق تبریک وآفرین ہے۔

اللہ تعالیٰ برکت دے اور اعتدال پر قائم رکھے۔

شبیر احمد عثمانی از دیوبند، ۱۰ شوال ۱۳۶۲ ہجری مطابق ۱۹ اکتوبر ۱۹۴۳ء

کتاب میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسنؒ کے سلسلہ میں حضرت مفتی محمد شفیعؒ کا بیان کردہ یہ نکتہ سامنے آیا ہے کہ مولانا سندھی کی طرف سے پیش ہونے والے نئے غلط فکری نکات پر حضرت شیخ الہند مولانا سندھی کو تنبیہ فرماتے رہتے تھے، ایک بار تو شیخ الہند کی ہدایت پر انہوں نے سلف سے مخالف نقط نگاہ پر مسجد میں علی الاعلان اپنی غلطی کا اعتراف اور ندامت کا اظہار کیا، اس پس منظر میں شیخ الہند کی طرف سے مولانا سندھی کی سرپرستی کرنے کی بات ایسی ہے جو کافی حیرت انگیز ہے، اس عاجز کی نظر میں شیخ الہند، مولانا سندھی کی فکر سے متفق نہ ہونے کے باوجود ان کی انقلابی شخصیت سے آزادیٔ ہند کے سلسلہ میں کافی توقعات وابستہ رکھتے تھے، اور ان کی نظر میں اس مقصد کے لئے مولانا سندھی سے بڑھکر دوسری موزون شخصیت موجود نہیں تھی۔

شیخ الہند کا موقف یہ تھا کہ اس وقت عالم اسلام اور خود ہندستان کا بنیادی مسئلہ انگریز سامراج سے نجات حاصل کرنا ہے۔

ہندوستان سے انگریز کی نجات کے نتیجہ میں انگریز کی کمر ٹوٹ جائے گی۔ اور یہ

دوسرے ممالک کی آزادی کی نوید ثابت ہوگی۔ نیز ہمارے بیشتر مسائل کا سبب انگریز کی غلامی ہی ہے۔

آزادی کے اس بڑے ہدف کی خاطر شیخ الہند، مولانا سندھی کی فکر کی کمزوریوں کے باوجود انہیں اس مقصد کے لئے بہت زیادہ کارآمد تصور فرماتے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر حالات ناسازگار نہ ہوتے تو مولانا سندھی، شیخ الہند کے اس ہدف کی تکمیل کے لئے فیصلہ کن کردار ادا کرتے، ریشمی رومال تحریک کے راز افشاں ہونے کی وجہ سے اس تحریک کو غیر معمولی نقصان پہنچا۔ یہ جداگانہ بحث ہے۔ جو کتاب کے اس تبصرہ سے غیر متعلق ہے۔

مولانا سندھی کی شخصیت کے حوالے سے ایک سوال، جواب طلب ہے، وہ یہ کہ جو شخصیت سندھ کی یکتائے روزگار بزرگ حضرت حافظ محمد صدیق بھرچونڈی اور ان کے دو ممتاز خلفاء مولانا تاج محمود امروٹیؒ اور حضرت دین پوریؒ اور دیوبند کے ممتاز فضلاء کی سرکردگی وسرپرستی میں رہی ہو، جس کی نشوونما ایسی متقی شخصیتوں کی صحبت میں ہوئی ہو، ان کے فکری اہداف میں سلف سے متصادم فکری ہدف کیسے شامل ہوگیا اور وہ مارکسزم سے ہمنوا فکر کی علمبردار کیسے ہوگئی؟

(۲)

مذکورہ سوال کے پس منظر میں مولانا سندھی کی شخصیت کے بارے میں ہم مختصرا یہ عرض کریں گے کہ موصوف، شروع سے طبعا انقلابی خیالات کے حامل تھے اور غیر معمولی طور پر ذہین بھی۔ مولانا سندھی کی جس دور میں نشوونما ہوئی، وہ سامراج دشمنی اور سرمایہ دار دشمنی کے نظریات اور انقلابی فکر کا دور تھا، کمیونزم اور جدید مغربی نظریات کا دور دورہ تھا، پھر برصغیر میں ایک تو جاگیرداری نظام کا تسلط تھا، دوم یہ کہ علمائے کرام میں نئے دور کے چیلنج کو سمجھکر اس سے عہدہ برآ ہونے کا رجحان نہ ہونے کے برابر تھا، ان حالات میں مسلم امت میں متعدد ذہین مسلم نوجوان ابھرے، جنہیں جدید فکر نے مہمیز دی اور وہ مغربی سامراج کے خلاف جدوجہد کے سلسلہ میں مضطرب ہوگئے، چونکہ مغربی سامراج کے خلاف

جہاد اور انقلابی جدوجہد کے کام کو اسلامی نصب العینی کام کی حیثیت سے پیش کئے بغیر اس کے حق میں مسلم معاشرے میں فضا ہموار نہیں ہوسکتی تھی، اس لئے ان ذہین شخصیتوں نے قرآن کی نئی تشریح کا کام ہاتھ میں لیا، جس سے سامراج کے خلاف جدوجہد قرآن کا ہدف بن کر سامنے آیا، مولانا سندھی اور مولانا ابو الکلام آزاد دراصل انہی ذہین شخصیتوں میں شامل تھے اور ان کے ترجمان بھی۔ یہ دونوں شخصیتیں بے داغ کردار کی مالک تھی اور وہ قربانی وایثار کا مجسمہ بھی تھے، وقت کے چیلنج کا جواب دینے کے سلسلہ میں ان کی اس فکر میں کچھ مثبت اجزاء بھی موجود تھے، لیکن یہ شخصیتیں دراصل مسلم معاشرے کے فرسودہ جاگیردانہ اور درگاہی نظام اور روایتی مذہبی طرز عمل کا ردعمل تھے۔ (اگرچہ مولانا آزاد کی فکر میں وہ بیشتر نقائص موجود نہیں ہیں، جو مولانا سندھی کی فکر میں ہیں، تاہم مولانا آزاد کی فکر میں جہاد اور سامراج دشمنی غالب صورت میں موجود ہے۔ اور وہ دین کے نصب العین کی صورت میں سامنے آتی ہے)۔

بعد میں کچھ دیگر شخصیتیں بھی عالمی جدید فکری زاویوں سے شعوری یا غیر شعوری طور پر متاثر ہوکر، اسلام کی ایسی تشریح کی علمبردار بنی، جس میں دنیاوی اقتدار اور سیاست وحکومت مقصود کی حیثیت اختیار کر گئے۔

بیسویں صدی کا بڑا المیہ یہ ہوا کہ بہت سارے ذہین افراد معاشرے کے تضادات، علمائے کرام کے فکری جمود اور ہمہ گیر جدید فکری اثرات کے زیر اثر اسلام کی جدیدیت سے ہمہ آہنگ نئی تشریح کی طرف راغب ہوئے۔ اس طرح ان ذہین افراد سے اسلام اور ملت کو فائدہ کے ساتھ بہت سے نقصانات بھی ہوئے۔ اس کی وجہ سے اپنی ذات کی فراموشی، تزکیے اور لوگوں کی آخرت بنانے کی دعوت کی قیمت پر سیاسی جدوجہد اور حکومت کی تبدیلی کا کام مقصود قرار پایا۔

ان حالات میں علامہ اقبال اور ڈاکٹر محمد رفیع الدین، یہ دونوں مسلم فلاسفر ایسے ہیں، جنہوں نے جدیدیت سے صحتمند اجزاء تو ضرور لئے، لیکن انہوں نے ان مادہ پرست

نظریات کی روح میں کارفرما مقاصد کو کلی طور پر مسترد کیا اور رومی، غزالی، شاہ ولی اللہ اور سلف کی فکر کو انہوں نے حرف آخر سمجھا، اس لئے یہ دونوں فلاسفر ایک طرف اسلامی فکر کے تسلسل کو قائم رکھنے میں کامیاب ہوئے تو دوسری طرف انہوں نے دور جدید کی نظریاتی یلغار کے مقابلہ میں مؤثر کردار ادا کیا۔

دور جدید کے حالات کی سنگینی کو دیکھکر ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ آج بھی مذہبی طبقات میں ہر ذہین فرد، جو جدید لٹریچر پر نگاہ رکھتا ہے، وہ حالت خطرہ میں ہے، وہ جاوید غامدی جیسے جدیدیت کے شکار دانشوروں سے متاثر ہوئے بغیر رہ سکے، مشکل ہے۔ چنانچہ دینی مدارس میں جدید فکر کی نظریاتی کمزوریوں کا تجزیاتی مطالعہ وقت کی ناگزیر ضرورت ہے۔

آج مولانا سندھی کی جدیدیت سے ہمہ آہنگ فکر سے متاثر ہوکر، مذہبی طبقہ کے ہزاروں افراد بُری طرح اس فکر کی زد میں ہیں۔ یہ فکری یلغار اس قدر تیز ہے کہ محض ذاتی اصلاح اور تصوف کی ریاضتوں سے بھی ذہن کو فکری کجی سے نہیں بچایا جا سکتا، اس لئے کہ اگر شروع سے ہی جدیدیت سے ہمہ آہنگ ذہنی سانچہ بن گیا، اس کے بعد اصلاح نفس کے مجاہدے ہونے کے باوجود اس فکری سانچے کی ٹوٹ پھوٹ کا عمل شروع نہیں ہوتا، بلکہ یہ مستحکم ہی ہوتا ہے، ذکر وفکر کے مجاہدے دل اور ذہن کی اصلاح کا ذریعہ ضرور بنتے ہیں، لیکن جب ذہن کی خاص فکری خطوط پر تشکیل ہوجاتی ہے تو اصلاح نفس کے باوجود ذہن، جدید فکری زاویوں سے دستبردار ہونے اور سلف کی فیصلہ کن فکری وعلمی حیثیت کو سمجھنے اور قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا، ذہن کی یہ عدم آمادگی نفسی خرابیوں کا نتیجہ نہیں ہوتی، بلکہ ناقص فکری تربیت کا نتیجہ ہوتی ہے۔

یہ بہت اہم نکتہ ہے، جو دینی ومذہبی حلقوں کے لئے ازحد قابل غور ہے۔

(ماخوذ ''بیداری'' جون ۲۰۱۵ء)

تحریکِ سیکولرزم کے سو سالہ بانی دانشور کی کہانی

محمد ابراہیم جویو صاحب سندھ میں تحریکِ سیکولرزم کے بانی ہیں، جو سو سالہ عمر کے مرحلہ سے گذر رہے ہیں۔ پچھلے دنوں ان کی سو سالہ زندگی کا جشن منایا گیا، جس میں مختلف شہروں میں ان کے حوالے سے تقریبات منعقد کرکے، انہیں خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔ سرکاری ادارہ سندھی ادبی بورڈ نے ان کی فکر، کام، شخصیت اور ان کے طریقِ کار اور علمی و ادبی خدمات پر اپنے رسالہ سہ ماہی ''مہران'' کا خصوصی نمبر نکالا۔ یہ نمبر ڈبل کراؤن سائز کے پونے چھ سو صفحات پر مشتمل ہے، اس خصوصی نمبر میں جویو صاحب نے پچھتر سالہ زندگی میں کمیونزم اور سیکولرزم کے لئے جس فنائیت و جفاکشی سے کام کیا ہے، افراد کی تربیت سے لے کر کتابوں کی اشاعت اور علمی و ادبی مضامین کی تیاری تک، اس کی تفصیل بیان کی گئی ہے اور محترم جویو صاحب کے تیار کردہ شاگردوں نے ان کی شخصیت کے حوالے سے اپنے تاثرات و تجربات وواقعات بیان کئے ہیں۔ اور ان کی زندگی کے اہم پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے، سندھی اخبارات نے بھی اس موقعہ پر محترم جویو صاحب کے کام پر خصوصی مضامین کی اشاعت کا اہتمام کیا۔

محترم محمد ابراہیم جویو صاحب اس اعتبار سے منفرد شخصیت کے حامل ہیں کہ انہوں نے سندھ میں کمیونزم اور اس کے جدلیاتی مادیت کے نظریہ کے حق میں اس وقت کام شروع کیا، جب سندھ میں مسلمان اہلِ علم میں کوئی ایک فرد بھی اس نظریہ کا حامل نہیں تھا۔ محترم جویو صاحب نے ۱۹۳۸ء میں ڈی جی سندھ کالج سے بی اے کا امتحان پاس کیا، اُسی سال سندھ مدرسہ کراچی میں ان کا اسسٹنٹ استاد کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ ۱۹۴۰ء میں سندھ مدرسہ نے انہیں بی ٹی کرنے کے لئے گورنمنٹ ایس ٹی کالج بمبئی بھیجا، بمبئی میں ان کا فکری تعلق مشہور کمیونسٹ دانشور و لیڈر ایم این رائے کی

کتابوں سے ہوا۔ جس سے ان کی شخصیت اور فکر میں بنیادی تغیر واقع ہوا اور انہوں نے کمیونزم اور سیکولرزم کے فلسفہ کے پرچارک کی حیثیت سے اپنی زندگی وقف کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ بمبئی سے واپسی کے بعد ۱۹۴۱ء میں ہی وہ دوبارہ سندھ مدرسہ میں اسسٹنٹ ٹیچر کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ ان دنوں سندھ مدرسہ کی بڑی اہمیت تھی، جدید تعلیم کے لئے اندرونِ سندھ سے ذہین بچے سندھ مدرسہ کی طرف ہی رجوع ہوتے تھے۔ جویو صاحب نے استاد کی حیثیت سے ذہین طلبہ پر کام کرنا شروع کیا۔ اس دور کے ان کے تیار کردہ نظریاتی شاگردوں میں عوامی تحریک کے بانی رسول بخش پلیجو صاحب اور ''نئی زندگی'' رسالہ کے سابق ایڈیٹر اور مشہور ادیب شمشیر الحیدری صاحب وغیرہ شامل ہیں۔

جویو صاحب بعض ذہین مذہبی شخصیتوں پر بھی اثرانداز ہوئے اور انہیں بھی اس فکر کا حامل بنایا۔ ایسی شخصیتوں میں قرآن پریس کے بانی محمد عثمان ڈیپلائی صاحب اور مولانا غلام محمد گرامی صاحب شامل ہیں۔ محمد عثمان ڈیپلائی صاحب سندھی زبان کے بڑے ادیب تھے، انہوں نے اسلام کی اشاعت کے لئے کافی کتابیں لکھیں، لیکن پاکستان بننے کے بعد محترم جویو صاحب کی صحبت نے انہیں اسلام سے باغی بنادیا۔ غلام محمد گرامی صاحب عالم دین تھے اور غیرمعمولی تحریری صلاحیتوں کے حامل تھے۔ جویو صاحب کی صحبت نے انہیں لادین بنایا۔ اور انہوں نے اس وقت کے ملحد شیخ ایاز کی حمایت میں اکابر بزرگ صوفی شاعروں کی حالت سکر میں کہے گئے اشعار کو جمع کرکے سہ ماہی ''مہران'' کا ضخیم نمبر نکالا، جس میں خدا اور مذہب کی تضحیک کا پہلو اجاگر ہوتا ہے۔ صوفی شاعر تو محبت میں استغراق کی وجہ سے معذور تھے، لیکن شیخ ایاز نے تو شعوری حالت میں خدا، مذہب اور دین کے بنیادی عقیدوں کا انکار کیا تھا اور ان کی تضحیک کی تھی۔ جویو صاحب، جو اس وقت سندھی ادبی بورڈ کے سیکریٹری تھے، انہوں نے گرامی صاحب سے کئی سو صفحات کا یہ مقالہ لکھوا کر اور اسے خصوصی نمبر اور بعد میں کتابی صورت

میں شایع کرکے، اسلام کے خلاف بڑا علمی محاذ کھڑا کردیا، جس پر اس وقت کے سندھ کے اسلام دوست ادیبوں نے سخت احتجاج کیا۔

محترم جویو صاحب نے کمیونزم اور سیکولرزم کے حق میں جس استقامت اور مستقل مزاجی سے مختلف محاذوں پر کام کیا ہے، وہ حیریت انگیز ہے۔ ۱۹۴۱ء میں سندھی مسلمانوں میں وہ واحد کمیونسٹ تھے، لیکن اِس وقت سندھی ادیبوں اور دانشوروں کی ایک بڑی ٹیم پیدا ہوچکی ہے، جو الحادی نظریات کی حامل ہے، سندھ کی میڈیا، صحافت اور بیشتر علمی اور ادبی ادارے محترم جویو صاحب کے براہِ راست یا بالواسطہ طور پر تیار کردہ افراد کے حوالے ہوچکے ہیں۔ علمی و ادبی اداروں اور میڈیا کے اعتبار سے اسلام دوست افراد تہی دست اور بالکل خالی ہیں۔ ٹی وی کے آٹھ چینل ہیں اور آٹھ دس سندھی اخبارات ہیں، جن پر محترم جویو صاحب کے فکر کے تیار کردہ افراد چھائے ہوئے ہیں۔ اور اسی فکر کو پھیلانے میں مصروف ہیں۔

اسی طرح سندھی زبان میں لادینیت، جدید مادی نظریات، دھرتی ماتا اور سندھی قوم پرستی پر لٹریچر کا ایک بڑا ذخیرہ ہے، جو تیار ہوچکا ہے، اس طرح کی سیکڑوں کتابوں پر محترم جویو صاحب کے مقدمے لکھے ہوئے ہیں۔ اس لئے کہ ہر سیکولر ادیب کی تمنا رہی ہے کہ ان کی کتاب کا تعارف جویو صاحب جیسی سندھ میں سیکولرزم کی بانی شخصیت کے قلم سے لکھا جائے۔ جویو صاحب اس کام کو سعادت سمجھ کر کرتے رہے ہیں۔ اوپر سہ ماہی ''مہران'' کے جس خصوصی نمبر کا ذکر کیا گیا، جس میں جویو صاحب کے تیار کردہ نظریاتی شاگرد اور ان کے ساتھیوں نے ان کی شخصیت اور خدمات پر مضامین لکھے ہیں، اس نمبر میں محترم شیخ ایاز صاحب کا بھی ایک پرانا مضمون شامل ہے۔ اس مضمون میں محترم شیخ ایاز صاحب لکھتے ہیں: ''۱۹۴۵ء کی بات ہے، میں نے محمد ابراہیم جویو صاحب سے کہا کہ میں نے اردو میں شاعری کی ہے، وہ آپ کو سنانا چاہتا ہوں، میں نے اسے اردو شاعری سنائی تو وہ سخت ناراض ہوئے، کہنے لگے، تم اس طرح اپنی صلاحیتوں کو

ضایع نہ کرو، تم سندھی شاعری میں ہی اپنی توانائیاں صرف کرو اور اپنے جوہر دکھاؤ، میں نے انہیں کہا کہ میری سندھی شاعری کو تمہارے علاوہ اور کون سنے گا۔ اس پر جویو صاحب نے کہا کہ تم اور میں مل کر اگر کام کرنے کا فیصلہ کریں تو ہم دونوں مل کر سندھ کی فضا کو بدل سکتے ہیں''۔ شیخ ایاز صاحب کی بیان کردہ اس بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ محمد ابراہیم جویو صاحب نے انتہائی نامساعد حالات میں کام کیا تھا۔ لیکن مستقل مزاجی سے کام کے نتیجہ میں ان کے نظریات کے حامل افراد کا قافلہ بنتا چلا گیا، اس وقت سندھ میں تیرہ ترقی پسند اور قوم پرست تنظیمیں کام کر رہی ہیں۔ ان کے باہمی اختلافات کتنے ہی شدید ہوں، لیکن وہ محمد ابراہیم جویو صاحب کی شخصیت پر متفق ہیں اور وہ ان کو اپنا فکری قائد و محسن سمجھتی ہیں۔

جویو صاحب کی ایک اہم کتاب سیکولرزم اور عقلیت پسندی کے نام سے ہے۔ جس میں انہوں نے کمیونزم اور جدید مادی نظریات کا حاصل پیش کیا ہے۔ ان کی اس کتاب پر انہیں بڑی داد دی گئی۔ اس کے کئی ایڈیشن شایع ہوئے۔ یہ کتاب دراصل ان کی فکر پر میرے لکھے گئے ایک مضمون کے جواب میں تحریر کی گئی ہے۔ اس کتاب میں جویو صاحب نے واضح کیا ہے کہ انسان، کائنات، تخلیق کائنات اور زندگی گذارنے کا اصل حقیقی نظریہ سیکولرزم اور عقل ہی ہے۔ جدید سائنس جو انسانی عقل کی معراج ہے۔ وہ یہ نکتہ واضح کرچکی ہے کہ مافوق الفطرت ہستی یا اس ہستی کی طرف سے رہنمائی یہ سب خلاف عقل باتیں ہیں۔ خدا، مذہب، وحی اور آخرت وغیرہ یہ سارے عقیدے اُس وقت کے پیداوار ہیں، جب انسان، عقلی اعتبار سے پست حالت میں تھا، دورِ جہالت کا غلبہ تھا۔ اسے سیلابوں، طوفانوں اور وحشی جانوروں سے خطرات درپیش تھے، لیکن اب سائنس نے جو حیرت انگیز ترقی کی ہے، اسے دیکھتے ہوئے محمد موسیٰ بھٹو صاحب جیسے مولوی حضرات کا پرانے عقیدوں پر اصرار عقل کے سراسر منافی ہے۔ جویو صاحب کی یہ کتاب اَسی صفحات پر مشتمل ہے۔ ہم نے الحمدللہ ان کی اس کتاب کے علمی جواب پر

تین سو صفحات پر مشتمل کتاب لکھی ہے، جو ''سیکولرزم اور عقلیت پسندی کا ایک تنقیدی مطالعہ'' کے نام سے مارکیٹ میں موجود ہے۔ محمد ابراہیم جویو صاحب کا ایک اہم کام جی ایم سید صاحب کی بعض اہم کتابیں لکھنے کا کام ہے۔

جی ایم سید صاحب نے اسلام کے خلاف جو علمی محاذ کھڑا کیا اور اسلام کی ایک ایک چیز کے خلاف لکھا، ان کا یہ بیشتر کام محمد ابراہیم جویو صاحب کی محنت کا حاصل تھا۔ جی ایم سید صاحب اپنی کتاب ''جنب گذاریم جن سین'' (جن کے ساتھ میں نے زندگی گذاری) میں لکھتے ہیں: میری بیشتر کتابیں محمد ابراہیم جویو صاحب کی مرہونِ منت ہیں۔ یہی بات سندھ کے پرانے کمیونسٹ دانشور صوبھو گیان چندانی صاحب نے محمد ابراہیم جویو صاحب کی ایک کتاب کے تعارف میں دہرائی ہے کہ جی ایم سید صاحب کی کافی کتابیں جویو صاحب کی لکھی ہوئی ہیں۔

جی ایم سید کے نام سے کتابیں لکھنے کا ایک سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جویو صاحب خود سرکاری ملازم تھے، اسلام اور پاکستان کے خلاف سرکاری ملازمت کی مجبوریوں کی وجہ سے اپنے نام سے اس طرح کھل کر نہیں لکھ سکتے تھے۔

سہ ماہی مہران کے صد سالہ جشن نمبر میں محترم جویو صاحب کے بارے میں ہر لکھنے والے دانشور واہل قلم نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ جدید سیکولر اور قوم پرست سندھ کے بانی جویو صاحب ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کی ساری توانائیاں اور خون پسینہ ایک کرکے، بلکہ خون جگر صرف کرکے اپنے نظریے کے فروغ کے لئے مجنوں وار طور پر کام کیا ہے۔ مجلسوں اور نشستوں کے ذریعہ، تحریر کے ذریعہ، مختلف علمی وادبی اداروں کے قیام وتشکیل کے ذریعہ، نئے لکھنے والوں کی تحریری زبان واسلوب کو درست کرکے انہیں علم وادب میں آگے بڑھانے کے ذریعہ، سندھی ادبی بورڈ جیسے سرکاری ادارہ کے برسوں تک سیکریٹری کی حیثیت سے کام کے ذریعہ، غرض کہ انہوں نے وقت اور توانائیوں کا آخری حد تک استعمال کرکے، سیکولرزم اور ترقی پسندی کے لئے ایسی فضا

پیدا کردی ہے کہ سندھ کے سیکڑوں قصبات میں سندھی ادبی سنگت اور ۱۳ قوم پرست تنظیمیں جویو صاحب کے فکر کی صدا بلند کررہی ہیں اور وہ جویو صاحب کو اپنا فکری قائد وامام سمجھکر، ان کی احسان مند ہیں کہ انہوں نے سندھی علم وادب کے ذریعہ ترقی پسندی کی یہ راہ دکھائی ہے۔

اس سلسلہ میں سہ ماہی مہران کے جویو نمبر کے دوچار اقتباسات پیش کرنا شاید افادیت سے خالی نہ ہو۔ عبدالواحد آریسر صاحب لکھتے ہیں۔

''جویو صاحب نے اپنے نظریہ کے حق میں سندھ میں بنیادی تبدیلیاں برپا کی ہیں، یہ تبدیلیاں مجلسوں سے لے کر علم، ادب اور فلسفہ تک پھیلی ہوئی ہیں۔ بالخصوص انہوں نے سندھی ادب کی رفتار اور رخ میں جو انقلاب برپا کیا ہے، اسے آج شاید کوئی کوتاہ نظر نہ مانے، لیکن سندھ کے وسیع میدانوں اور وسیع ریگستانوں میں منعقد ہونے والی ہزاروں محفلوں میں، جنہوں نے سرزمین سندھ کی قسمت ہی تبدیل کردی ہے۔ وہ اس بات کی شاہد ہیں کہ ماضی کے مکروہ اور غلاظت سے بھرپور کردار کے خلاف جو خوبصورت ہوا چل رہی ہے، وہ ضعیفی کی اس عمر میں نوجوانوں سے بھی زیادہ جذبہ رکھنے والے شخص محمد ابراہیم جویو صاحب کی ان تھک محنت کا نتیجہ وثمرہ ہے۔ (صفحہ نمبر ۵۷)

غلام ربانی آگرو صاحب (جو سندھی ادب کی اہم شخصیت ہیں) لکھتے ہیں۔

سندھی ادبی سنگت (جس نے ترقی پسند تحریک کو ہزاروں ادیب دیئے) میں جویو صاحب کا بڑا احترام کیا جاتا تھا۔ جب وہ کسی مسئلہ پر رائے دیتے تھے تو اس کے بعد اس مسئلہ پر کوئی بھی لب کشائی نہیں کرتا تھا، سندھ میں ادبی سنگت، ترقی پسند تحریک کی علمبردار تھی، محمد ابراہیم جویو صاحب رسمی طور پر نہ سہی، لیکن عملی طور اس کے پیش امام تھے، ہم جیسے نوجوان اور کالجی ادیب صف بندی کے وقت نیت کرنے کے دوران دل میں یہی کہتے تھے کہ پیچھے اس امام کے۔ (صفحہ ۵۴)

محمد ابراہیم جویو صاحب نے اپنی سرکاری ملازم کا بڑا حصہ سندھی ادبی بورڈ کے

سیکریٹری کی حیثیت سے گذارا، ان کے دور میں سندھی ادبی بورڈ کی طرف سے شائع ہونے والی کتابوں میں ترقی پسند فکر اور ترقی پسند ادب کے گہرے اثرات شامل تھے، سندھی ادبی بورڈ کا رسالہ سہ ماہی مہران خالص ادبی اور علمی رسالہ تھا، اس رسالہ کے ذریعہ جویو صاحب نے نئے ترقی پسند ادیبوں کی تخلیقات کو اپنی ترمیم واضافہ کے ساتھ شائع کرتے رہے، اس طرح سہ ماہی مہران سیکڑوں نئے ادیبوں کی تیاری وتربیت کا ذریعہ بن گیا۔

جویو صاحب سو سال کی عمر میں شاداں وفرحاں ہیں کہ انہوں نے سیکولرزم اور الحادی نظریات کا جو بیج آج سے ۷۵ سال پہلے بویا تھا، وہ تناور درخت کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ ہم نے دوچار سال پہلے ان سے ملاقات کرکے، ان کے سامنے حکمت سے یہ نکتہ پیش کرنے کی کوشش کی تھی کہ موت، زندگی ہی کا ایک تسلسل ہے۔ زندگی کے اس تسلسل کی فکر بھی ضروری ہے۔ نیز انسان کی فہم وفراست اور حکمت کا بیشتر تعلق فطرت میں موجود قدرت کی دی ہوئی صلاحیتوں سے کام لینے سے وابستہ ہے۔ فطرت کی ان صلاحیتوں کے مقابلہ میں مادی عقل کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتی۔

شیخ ایاز صاحب، جو محمد ابراہیم جویو صاحب کی تیار کردہ شخصیت تھے اور سندھی نوجوانوں کو سیکولرزم اور قوم پرستی کی راہ پر گامزن کرنے کے سلسلہ میں جویو صاحب نے ان سے بہت زیادہ کام بھی لیا۔ لیکن شیخ ایاز اور محترم جویو صاحب کی شخصیت کے درمیان ایک بنیادی اور فیصلہ کن فرق تھا۔ وہ فرق یہ تھا کہ شیخ صاحب پر جب حق واضح ہوگیا تو انہوں نے اپنے سابقہ نظریات سے توبہ کی اور حق پر گامزن رہے اور زندگی بھر کے اپنے ساتھیوں کی قربانی دینا گوارا کی۔ اس سلسلہ میں ان کے کردار کا ایک پہلو قابلِ قدر ہے۔ ہم نے ''بیداری'' سندھی میں شیخ ایاز کی پرانی فکر پر تنقیدی مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ یہ غالبا ۱۹۹۴ء کی بات ہے۔ شیخ ایاز نے مجھے خط لکھا کہ محمد ابراہیم صاحب (جو رشتہ میں میرے عزیز بھی ہیں) انہوں نے مجھے ''بیداری'' کا تازہ

شمارہ دیا اور کہا کہ اس میں شیخ ایاز کے خلاف تنقیدی مضمون کی دوسری قسط چھپی ہے۔ میں نے محترم جویو صاحب سے کہا کہ محمد موسیٰ بھٹو نے جس شیخ ایاز کا احتساب کرنا شروع کیا ہے، وہ شیخ ایاز مر چکا ہے۔

واضح ہو کہ ہم نے شیخ ایاز پر یہ تنقیدی سلسلہ اس لئے شروع کیا تھا کہ سندھی ادبی بورڈ نے شیخ ایاز کی ملحدانہ شاعری کو جواز فراہم کرنے کے لئے سہ ماہی ''مہران'' کا جو نمبر نکالا تھا، اسے انہوں نے بعد میں باقاعدہ کتابی صورت میں شایع کیا تھا، اس لئے اس کا علمی تعاقب ضروری تھا۔

محمد ابراہیم جویو صاحب کی کہانی کا ایک اہم حصہ یہ ہے کہ وہ زندگی بھر ایک ایسے نظریہ کے حسن پر فریفتہ رہے، جو اگرچہ فطرت سے متصادم ہے، لیکن چونکہ فطرتِ انسانی میں حسن کمال کی جستجو فرد کا سب سے طاقتور نصب العینی داعیہ ہے، انسان کی ساری جدوجہد اسی فطرتی نصب العینی داعیہ کے گرد گھومتی ہے۔ جب فرد کسی نظریے کی طرف حسن کی ساری صفات منسوب کرکے، اس سے والہانہ محبت کرنے لگتا ہے تو اس نظریے سے والہانہ محبت کی بنا پر اس کی جدوجہد کا مرکز اس نظریے میں موجود حسن کے جذبات کی تسکین ہی ہوتا ہے۔ محترم جویو صاحب کو کمیونزم کے نظریہ میں موجود انسانی مساوات کے تصور نے مسحور کیا، چونکہ فطرت میں انسانی مساوات کے احساسات موجود ہیں، حسن کے اس تصور سے وابستگی کے نتیجہ میں فرد کی زندگی میں ایک غیر معمولی تحرک آجاتا ہے اور اسے (غلط طور پر) فطرت میں موجود اپنے کمال حسن کے سارے جذبات کی تسکین کی صورت نظر آتی ہے، اس لئے ایسا فرد اپنی ساری توانائیاں حسن کے اس تصور اور نظریے کے فروغ میں صرف کرنے لگتا ہے۔ اگرچہ عملاً اس تصور میں حسن کمال کی حقیقی صفات موجود نہ ہوں، لیکن چونکہ فرد غلط فہمی سے اس نظریے میں حسن کی ساری صفات منسوب کرکے، اس پر فدائیت کا مظاہرہ کرتا ہے، اس لئے اس کی زندگی مقصدی ہوجاتی ہے۔

جب فطرت سے مطابقت نہ رکھنے والے ایک نظریے اور تصور میں ایسی کشش موجود ہے کہ وہ فرد کو مسحور کرکے، زندگی بھر اس نظریے کی اشاعت اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اس نظریے کا حامل بنانے کی جدوجہد پر اکسانے کا موجب بن سکتا ہے تو فطرت سے کامل مطابقت رکھنے والا اسلامی نظریہ جس میں کمال حسن کی ساری صفات موجود ہیں، اس نظریے سے والہانہ محبت کی بنیاد پر اس نظریے کے فروغ کے لئے فرد کی جدوجہد میں جو تیزی آنی چاہیے، وہ غلط نظریے کے حسن پر فدائیت کے مقابلے میں کئی سو گنا زیادہ ہے۔ لیکن دکھ کی بات ہے کہ ہمیں اسلامی نظریہ میں موجود حسن کمال کی صفات سے تعلق خاطر نہ ہونے کی وجہ سے اسلام کے لئے ہماری فنائیت اور اس کی جدوجہد وتحرک میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔

جدید سندھ کے بانی دانشور محمد ابراہیم جویو صاحب کو اپنے باطل نظریے کے لئے جدید تعلیم یافتہ افراد کی جو فوج ظفر موج حاصل ہوئی ہے، اس میں ان کی جدوجہد کے پہلو بہ پہلو دوسرے خارجی بنیادی عوامل بھی کارفرما ہیں۔ ان عوامل میں سندھ میں جاگیرداری نظام کے غلبہ اور اس کے خلاف ردعمل، جدید بے مقصد نظامِ تعلیم کی وجہ سے، اسلامی نظریے سے ناآشنائی کی عمومی فضا، عالمگیر سطح سے مادی نظریات کے غلبہ کی صورت وغیرہ جیسے عوامل کارفرما ہیں۔ جویو صاحب کے تیار کردہ افراد پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعہ شب و روز اسلام کے پاکیزہ نظریے کے برعکس باطل نظریات کے حق میں کام کررہے ہیں۔ ہماری نوجوان نسل ان نظریات سے متاثر ہوکر باطل نظریات کی اسیر ہوتی جارہی ہے اور ہزارہا دیندار افراد یہ سارا منظر آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور انہیں زندگی کے ہر موڑ پر باطل نظریات کے حامل ایسے افراد سے مستقل واسطہ بھی پڑتا ہے، لیکن افسوس ہے کہ وہ اس سلسلہ میں اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے اور اسلام کے حوالے سے اپنے حصہ کا کردار ادا کرنے کے یا تو احساس سے عاری ہیں یا اس پر دکھ اور غم کا اظہار کرنے پر اکتفا کرکے رہ جاتے ہیں۔ جو خود ایک بے عملی کی صورت

ہے۔

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب کہا کرتے تھے کہ ہماری جدید سندھی نسلوں کو اپنی تہذیب سے دور کرکے، جس طرح جدید مادی اور ترقی پسند نظریات کا اسیر بنانے کی کاوشیں ہورہی ہیں، وہ ہمارے صدیوں کے پاکیزہ تہذیبی تسلسل سے انقطاع کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔ ان حالات میں اسلام اور ملت کے سب سے زیادہ محسن وہی افراد شمار ہوں گے، جو سندھ کی جدید نسلوں کی پاکیزہ تہذیب اور پاکیزہ قدروں سے وابستگی اور اسلامی نظریہ پر ان کے اعتماد کو بحال کرنے کا کام سرانجام دیں گے۔

سندھ میں نظریاتی ودعوتی کام
اور اس کے لئے صحیح حکمت عملی

سندھ کا ایک علمی ادبی و نظریاتی ادارہ جو متعدد اسباب کی بنا پر پچھلے ۲۵ سال سے تعطل کا شکار رہا، جسے اللہ نے بے پناہ وسائل سے بہرہ ور کیا ہے۔ لیکن ساتھیوں کی باہمی رنجش، صحیح حکمت عملی کے فقدان اور علمی مزاج کے افراد کی کمی کی وجہ سے وہ پچھلے ۲۵ سال کے دوران سندھ کی نظریاتی کشمکش کی صورتحال میں کوئی کردار ادا نہ کرسکا۔ اس ادارہ کے ذمہ داروں کی دعوت پر راقم الحروف نے مذکورہ عنوان سے ایک مقالہ لکھا، جو ادارہ کے مرکز میں ذمہ داروں کی مجلس میں پڑھا گیا۔ اس مقالہ کی اہمیت کے پیش نظر اس کے بعض اہم حصے ''بیداری'' کے قارئین کے لئے پیش کیے جا رہے ہیں۔ یہ مقالہ سندھی زبان میں لکھا گیا تھا، جس کا اردو ترجمہ ڈاکٹر غازی شہاب الدین صاحب نے کیا ہے۔ ڈاکٹر شہاب الدین صاحب سندھی ''بیداری'' کے مستقل مضمون نگار ہیں۔ اللہ نے انہیں درد دل عطا کیا ہے، اس مضمون کے ترجمہ کے لئے ہم ان کے از حد ممنون ہیں۔ **(محمد موسیٰ بھٹو)**

سندھ میں گذشتہ ساٹھ ستر برسوں میں سیکولرزم، کمیونزم اور ترقی پسند فکر کے لئے جو علمی اور نظریاتی کام کیا گیا ہے، اس نے سندھ کی جدید نسلوں کے افراد (جس میں کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ، اساتذہ، اخبارات کے کالم نگار اور میڈیا کے تمام شعبوں سے تعلق رکھنے والے لوگ شامل ہیں) کے مزاج، رویوں اور ذہنوں کو تبدیل کرکے رکھ دیا ہے۔ اب سندھی میڈیا مکمل طور پر سیکولرسٹوں اور ترقی پسندوں کے سپرد ہو چکا ہے۔

پاکستان کے کسی بھی دوسرے علاقے کے جدید طبقات میں لادینیت، دین بیزاری اور جدید نظریات سے اثر پذیری کا ایسا مزاج پیدا نہیں ہوا ہے، جو بدقسمتی سے سندھ میں پیدا ہو چکا ہے۔ اس میں محمد ابراھیم جویو، جی ایم سید اور رسول بخش پلیجو جیسے دانشوروں کی تحریروں، کتابوں اور ان کی جدوجہد کو بڑا عمل دخل حاصل ہے۔

سندھ کے اس مزاج کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ امریکہ میں ورلڈ سندھی کانگریس کا ہر سال سہ روزہ پروگرام منعقد ہوتا ہے، چند سال پیشتر اس تنظیم کے ایک سالانہ پروگرام میں ایک امریکی دانشور، جو ایشیائی امور کا ماہر تھا، نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ میں پاکستان کے سارے صوبوں کے لوگوں کے ذہن اور مزاج سے واقف ہوں۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے کہ سندھ کے لوگ پاکستان کی ساری قومیتوں میں سب سے زیادہ سیکولرسٹ اور مذہب بیزاری کا رجحان رکھتے ہیں۔ اس پر سندھی کانگریس کے صدر نے اٹھ کر کہا کہ آپ کا یہ تجزیہ بالکل درست ہے اور سندھ کی جدید نسلوں کے لوگ اسلام کے بجائے سیکولرزم پر یقین رکھتے ہیں اور پاکستان کے دوسرے لوگوں کی طرح مذہب سے جڑے ہوئے نہیں ہیں۔ (یہ رپورٹ روزنامہ کاوش میں شایع ہوئی تھی)

سندھ میں ترقی پسند اور سیکولر تحریک بہت سارے مرحلے طے کر کے، فتحیابی کے مرحلے میں داخل ہوا چاہتی ہے۔ حالات بتا رہے ہیں کہ اگلے دس سالوں میں اگر کوئی معجزہ رونما نہ ہوا تو سندھ اسمبلی کے ارکان کی ایک نمایاں تعداد ترقی پسندوں پر مشتمل ہوگی اور وہ سندھی بولنے والوں کی نمائندہ تنظیم کی صورت میں ابھر کر سامنے آئے گی، بالکل اسی طرح جس طرح ایم کیو ایم نے اردو بولنے والوں کی نمائندہ تنظیم کی صورت اختیار کر رکھی ہے۔ 1987ع کے بلدیاتی انتخابات سے پہلے تک بہت کم لوگوں کو ایم کیو ایم کی کامیابی کا درست اندازہ ہوسکا تھا۔ مہاجر آبادی کے بارے میں اکثر اہل دانش کو یہ خوش فہمی تھی کہ وہ قوم پرستی کے مرض میں مبتلا ہوکر، کفران نعمت کی مرتکب نہ ہوگی اور نہ ہی ہجرت جیسے عظیم عمل کی نفی کرے گی۔

نظریاتی طور پر سندھ کی صورتحال میں اتنی تیز رفتار تبدیلی کے باوجود افسوس ناک بات یہ ہے کہ سندھ کا مذہبی طبقہ، چاہے وہ روایتی طبقہ ہو یا جدید تعلیم یافتہ طبقہ، ان دونوں طبقوں کے لوگوں کو اس سنگین صورتحال کا نہ کوئی احساس ہے اور نہ ہی وہ اس سلسلے میں کوئی موثر کردار ادا کرنے کے لئے سوچ رہا ہے۔

اگرچہ ترقی پسندوں کی افرادی قوت، نظریاتی اعتبار سے اتنی زیادہ نہیں ہے۔ خاص طور پر عام سندھی اس فکر سے زیادہ متاثر نہیں ہیں۔ ان کی افرادی قوت چار پانچ ہزار سے بمشکل زیادہ ہوگی۔ لیکن نظریاتی افراد کی اتنی بڑی تعداد کسی بھی معاشرے میں بڑی قوت ہوتی ہے، جو اپنے گرد معاشرے کے کثیر افراد کو اکٹھا کرنے میں کامیاب ہوتی ہے۔ رسول بخش پلیجو کی عوامی تحریک اپنے نظریاتی کارکنوں کی مدد سے کسی بھی جلسے، جلوس اور مظاہرے کے لئے آٹھ دس ہزار لوگوں کو جمع کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ سارے لوگ نظریاتی ہوں، لیکن وہ ان کی فکر سے کسی نہ کسی حد تک متاثر ضرور ہیں۔

ترقی پسندوں، قوم پرستوں اور سیکولرسٹوں کو سندھ میں جتنی افرادی قوت ملی ہے، وہ لٹریچر اور اسٹڈی سرکلز کی بدولت ملی ہے، کافی مدت تک جیئے سندھ کے حلقوں اور ''عوامی تحریک'' سے وابستہ ترقی پسندوں کی نظریاتی تربیت کے لئے مطالعہ کتب کا باقاعدہ نصاب تھا، سندھ کے اخبارات میں لکھنے والے جو سینکڑوں مضمون نگار اور کالم نگار پیدا ہوئے ہیں، جن کے مضامین روزانہ چھپتے ہیں، ان کی اکثریت ان تنظیموں کے نظریاتی لٹریچر کے ماحول میں پیدا ہوئی ہے۔ جبکہ عالمی صورتحال کے پس منظر اور جدیدیت کے پیش منظر میں حالات و واقعات اور مسائل کا تجزیہ کرنے والے افراد اسلامی مکتب فکر میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔

روس میں 1917ء میں لینن کو کمیونسٹ انقلاب برپا کرنے کے لئے جتنی افرادی قوت حاصل تھی، وہ اتنی بڑی طاقت نہ تھی۔ وہ قوت لگ بھگ اتنی ہی تھی، جتنی سندھ میں ترقی پسندوں کو حاصل ہے۔ سندھ میں ترقی پسندوں کو کام کرتے ہوئے ستر اسی برس

ہو چکے ہیں۔ روس میں لینن کو حالات سازگار ملے اور اس کو جرمنی کی بھرپور مالی امداد بھی حاصل تھی اور لینن کی شخصیت بھی غیر معمولی صلاحیتوں کی حامل تھی۔ موجودہ دور میں پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا بہت مئوثر طاقت اختیار کر چکے ہیں۔ قوموں کی ذہن سازی میں ان کا کردار بہت اہم اور فیصلہ کن ہے۔ اس سے پہلے میڈیا کے اس فیصلہ کن کردار کا تصور کرنا بھی مشکل تھا۔ سندھی زبان کا پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا دونوں ترقی پسندوں اور سیکولرسٹوں کے قبضے میں ہیں۔ وہ وقت قریب ہے، جب عام سندھی، مزارع تو وڈیرے کا ہو، لیکن وہ اپنا ووٹ میڈیا سے متاثر ہوکر سیکولر قیادت کے حق میں استعمال کرے۔ یہ سب کچھ وہ سندھ کی بقا کو لاحق خطرات وجہ سے کرسکتا ہے۔ وڈیرہ اس صورتحال کو بھانپ کر سیکولر قیادت کے پیچھے چلنے اور قوم پرستی کی روش اختیار کرنے پر مجبور ہوسکتا ہے۔

سندھ درحقیقت باب الاسلام ہے۔ تحریک خلافت اور تحریک پاکستان میں اس کا کردار سب سے اہم تھا۔ سندھ کی موجودہ نظریاتی صورتحال ہمارے لئے لمحہ فکریہ ہے۔ اس کی بہت سی وجوہات ہیں، لیکن سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ دور جدید میں مغرب کے لادین نظریات نے عالم اسلام کے دوسرے علاقوں کی طرح سندھ کے جدید تعلیم یافتہ لوگوں کو متاثر کرنا شروع کیا۔ عالم اسلام کی سطح پر ان نظریات کا توڑ علامہ اقبال، ڈاکٹر رفیع الدین، مولانا مودودی، حسن البنا اور سید قطب نے کیا۔ پاکستان کے دوسرے علاقوں کے اعلیٰ تعلیمی میں مولانا مودودی کی فکر کی توسیع و اشاعت کے لئے باصلاحیت افراد میسر ہوگئے۔ دوسرے علاقوں میں اس فکر کے علمی مقابلے کی صورت میں پیدا ہوگئی، لیکن یہاں ابتدا میں سندھی زبان میں اسلام کا یہ استدلالی لٹریچر چھپ نہ سکا۔ یہاں ذہن خالی تھے۔ اس خلا کو جی ایم سید نے محمد ابراھیم جویو اور دوسرے لوگوں کے تعاون سے پُر کرنے کی کوشش کی۔ چالیس پچاس سالوں میں دیکھتے ہی دیکھتے ہماری نئی نسلوں کی سوچ میں بنیادی تبدیلی آنے لگی۔

اس اعتبار سے سندھ کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ بدقسمتی سے سندھ میں

اسلام نظریاتی اعتبار سے مظلوم رہا ہے۔ الحمدللہ یہ عاجز گذشتہ چالیس سال سے اس محاذ پر سرگرم ہے۔ ڈیڑھ سو کتابوں کی اشاعت کے علاوہ بیس سال سے ایک ماہنامہ بھی باقاعدگی سے شایع ہو رہا ہے۔ کام کے آغاز کے وقت میں اکیلا تھا۔ اب بھی میرے ادارے کا حال یہی ہے کہ میں اس میں اکیلا کام کر رہا ہوں۔ اداروں، جماعتوں اور معاون حضرات سے مطلوبہ تعاون کی کمی کی وجہ سے میں اپنے لٹریچر کو بڑے پیمانے پر نہ پھیلا سکا۔ شایع شدہ کتابوں کی دوسری تیسری ایڈیشنوں کی اشاعت کے قابل نہ ہوسکا۔ آج جبکہ میری ذہنی توانائیاں کافی کم ہوگئی ہیں اور وسائل کا حصول بھی بڑا مسئلہ ہے تو میں اپنے اس کام کے بارے میں بہت فکرمند ہوں کہ اس پیغام کو سندھ میں کس طرح جاری رکھا جائے اور پھیلایا جائے۔

سندھ میں ترقی پسندوں اور قوم پرستوں کی تقریباً ۱۳ تنظیمیں سرگرم ہیں۔ ان سب کا دعویٰ ہے کہ وہ جی ایم سید کی فکر کی علمبردار ہیں اور ان سب کا محمد ابراھیم جویو کی شخصیت پر مکمل اعتماد ہے۔ جویو صاحب ان سب کا مشترکہ فکری امام ہے۔ جی ایم سید اور محمد ابراھیم جویو کی فکر کے بنیادی اجزا ان مغربی مفکرین سے ماخوذ ہیں، جنہوں نے عیسائی مذہب کو مکمل طور پر مسترد کر کے سیکولرزم کی بنیاد پر اپنے ملکوں کا نظام استوار کیا۔

جس فکر نے سندھ کی ذہین نسلوں کو متاثر کیا ہے۔ اس کے کچھ نکات یہ ہیں۔

(۱) خدا اور مذہب کا تصور سائنسی اور دنیاوی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ مغرب کی ترقی خدا اور مذہب کو چھوڑنے کے بعد ہوئی ہے۔

(۲) اس دور کا سب سے مقبول نظریہ سیکولرزم ہے۔ جس کے مطابق ریاست کا پورا اجتماعی نظام، معاشرتی، معاشی اور ریاستی نظام عقلیت کا مرہون منت ہے۔ خدا اور مذہب کا دنیا کے اس کاروبار سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ سیکولرزم، روشن خیالی اور ترقی کے دور میں داخل ہونے کا نام ہے۔ زندگی، کائنات، انسانی تخلیق اور زندگی کے مسائل کے بارے میں سیکولر فکر کی کئی ایسی جہتیں ہیں، جنہوں نے انسانی تہذیب کو خدا پرستی کے تصور سے ہٹا کر

خالص مادہ پرستی کی طرف دھکیلا ہے۔ ان میں ایک ڈارون کا نظریہ ارتقا ہے۔ اس کے مطابق انسان کا ارتقا سمندر کے نزدیک پیدا ہونے والے کیڑوں سے شروع ہوا ہے۔ اس کا درمیانی مظہر باندر ہیں۔ باندر سے ترقی کرکے، اس نے انسان کی موجودہ صورت اختیار کی ہے۔ دوسرا فرائیڈا کا نظریہ ہے کہ انسانی نفسیات کی طاقتور محرک اس کے جنسی جذبات وخواہشات ہیں۔ یہ خواہشات اتنی طاقتور ہیں کہ وہی افراد کی ساری زندگی اور ان کی جملہ سرگرمیوں کا رخ متعین کرتے ہیں۔ اس لئے جنسی جذبہ کی تسکین پر اخلاقی پابندیاں عائد کرنا غلط ہیں، ورنہ انسانی معاشرہ بیمار معاشرہ میں تبدیل ہوجائے گا۔

سیکولر فکر کا تیسرا پھل میکڈوگل کا نظریہ ہے۔ جس کے مطابق انسان میں حیوانی خواہشات اور حیوانی جذبات کے سوا دوسرا کوئی جذبہ موجود نہیں ہے۔ روح یا روحانیت کے نام سے انسان میں کوئی قوت موجود نہیں ہے، انسان کی زندگی کا مقصد ترقی یافتہ حیوان کی مانند مادی خواہشات کو پورا کرنا ہے۔

سیکولر فکر کا چوتھا پھل ایڈلر کا نظریہ ہے۔ جس کے مطابق انسان میں سب سے زیادہ طاقتور جذبہ دوسروں کو نچلا دکھا کر اور ذلیل کرکے ان پر برتری حاصل کرنا ہے۔ انسانی زندگی میں مادی طور پر مسابقت کا جذبہ اپنی بالادستی قائم کرنے والی سرگرمیوں پر مشتمل ہے اور یہی داعیہ انسان کا سب سے طاقتور نصب العینی داعیہ ہے۔

سیکولر فکر کا پانچواں پھل مارکسزم کا نظریہ مادیت ہے۔ جس کے مطابق مذہب، تہذیب، کلچر، اخلاق وغیرہ یہ سب سرمایہ داروں کی ایجاد کردہ چیزیں ہیں۔ انسان کا سب سے طاقتور نصب العینی جذبہ جس کے لئے اس کی ساری جدوجہد ہوتی ہے، وہ معاش ہی ہے۔

الغرض یہ کہ سیکولر فکر کے یہ سارے پھل ایسے ہیں، جنہوں نے انسانی زندگی کو زہریلہ بنا دیا ہے۔ مغرب میں سیاسی، اجتماعی اور تعلیمی نظام اور زندگی کا سارا نقشہ سیکولرزم کے رجحانات کے مطابق ہی ترتیب دیا گیا ہے۔ اگرچہ ڈارون کا نظریہ ارتقا سائنسی تحقیق

کی رو سے مسترد ہوچکا ہے، لیکن مغرب کا ملحدانہ ذہن اس سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہیں ہے۔ اس کے سیاسی اثرات ونتائج تو اپنی جگہ پر جوں کے توں موجود ہیں۔

سیکولرزم، اشتراکیت اور جدلیاتی مادیت کے نام سے یہ نظریات سندھ کی تعلیم یافتہ آبادی میں ایک مدت سے زیر بحث ہیں، ان نظریات کی تشریح کے لئے سینکڑوں کتابیں چھپ چکی ہیں۔ ترقی پسندوں اور قوم پرستوں کی فکر میں ان نظریات کی روح کارفرما ہے۔ اس لئے سندھ کی قوم پرستی کی تحریک پر مجموعی طور پر لادینیت کا رجحان غالب ہے۔

ان نظریات کی نوعیت، حقیقت، ان کی گہرائی اور ان کے تباہ کن اثرات کو سمجھنا، ہمارے لئے وقت کی اہم ضرورت ہے۔ ان کو سمجھے بغیر ان کے مقابلے کی فکر کرنا ممکن نہیں ہے۔

گذشتہ پچاس ساٹھ سالوں میں سندھ میں اسلام کو نقصان پہنچانے اور سیکولرزم کے فروغ کے لئے ترقی پسند اور سیکولر دانشوروں نے ایک اہم علمی کام جو کیا ہے، جس نے منفی ذہن سازی کے معاملے میں بنیادی کردار کیا ہے، وہ یہ ہے کہ سندھ کے مقبول عوام صوفی شعرا کے کلام کی ایسی تشریح کی گئی ہے، جس کے مطابق انہیں بغیر کسی مذہبی تفریق کے اور مخالف شریعت اور قوم پرستی اور طبقاتی کشمکش پر یقین رکھنے والے شاعر کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ صوفی یونیورسٹی کا قیام بھی اسلام کے صحیح تصور کو مسخ کرنا، شاہ لطیف اور سچل سرمست وغیرہ کو خدا اور دین دشمن شاعر کی حیثیت سے پیش کرنا اور تصوف اور صوفی ازم کو محض موسیقی کی محافل منعقد کرنا اور عرس میلے سجانا ہے، تاکہ روح کو تسکین ملے۔ اس کے سوا تصوف کا دوسرا تصور ان کے ہاں۔ پاکستان میں اس موضوع پر سب سے زیادہ کام سندھی زبان میں ہوا ہے۔ اس کے سدباب کے لئے ضروری ہے کہ سندھ کے مقبول عوام صوفی شعراء کے کلام کی درست، بہتر، مؤثر اور اسلام کی مناسبت سے اس کی حقیقی تشریح کی جائے۔ یہ ایک ایسا کام ہے، جس کو ترجیحی بنیاد پر کیا جائے۔ ورنہ دوسری صورت میں صوفی یونیورسٹی کے طلبہ کو ان

موضوعات پر مارکیٹ سے جو کتب ملیں گی، وہ ملحدانہ نوعیت کی ہوں گی، جس سے مزید ملحد دانشور پیدا ہوجائیں گے۔

موجودہ دور میں دین و مذہب سے عاری تصوف ایک تو سیکولر قوتوں کی ضرورت ہے۔ دوسرا وہ دین کی پابندیاں قبول نہ کرنے والے دنیاداروں کی ضرورت ہے اور تیسرا ایسا تصوف عالمی سرمایہ داری کی ضرورت ہے۔ عالمی سرمایہ داری کو دولت جمع کرنے اور پوری دنیا کو مارکیٹ بنانے کے لئے ایسا ماحول چاہیے، جو دین، مذہب، اخلاقی اقدار اور حقیقی روحانی مظاہر سے عاری ہو۔ جس میں دینی حمیت، خاندانی نظام، شرم و حیا، دینی اقدار اور شریعت کی نفی ہو۔ ایسے تصوف کو عوامی بنانے میں موجودہ دور میں عالمی سرمایہ داری کا کردار بھی ہے۔

تنظیم کے دوستوں کے احساسات و جذبات کو دیکھتے ہوئے میں اپنی زندگی بھر کے اپنے تجربات و مشاہدات کی روشنی میں چند مشورے دینا مناسب سمجھتا ہوں۔

(ا) نظریاتی کام کی اشاعت کے لئے آمدنی کا کم از کم پانچ فیصد وقف کیا جائے اور مخصوص کیا جائے۔

(ب) اشاعتی کام کے لئے باصلاحیت افراد کی خدمات حاصل کی جائیں۔ ان کی تربیت کی جائے۔ ایسے افراد کام سیکھنے کے لئے چند ماہ کی چھٹی لیکر ہمارے زیر تربیت کام کریں۔

(ث) ماہوار یا سہ ماہی علمی، ادبی اور نظریاتی میگزین نکالنے کا فیصلہ کرنا چاہیے، تاکہ نئی نسل کے ادیبوں کی ذہن سازی کا کام ہوسکے۔

(ج) ہمارے دوستوں کو یہ نکتہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ دین کے اجتماعی کام کے لئے باصلاحیت افراد کی طرف سے ایک پلیٹ فارم پر مشترکہ کام کرنے میں خیر و برکت ہے۔

اس نیک کام کے لئے مزاج اور رائے کی قربانی دینا اور برداشت سے کام لینا اور ایک دوسرے کے لئے عزت و تکریم کا ہونا، بڑی سعادت کی بات ہے۔ اس سے بڑھ کر

دوسری سعادت کیا ہوسکتی ہے؟ جب باصلاحیت افراد کی صلاحیتیں اور توانائیاں یکجا استعمال ہوتی ہیں تو مشترکہ جدوجہد سے معاشرے میں تحرک پیدا ہوتا ہے اور باطل سے بہتر اور مئوثر طور پر مقابلہ کرنے کی صورت پیدا ہوتی ہے، اس لئے ذمہ دار افراد کو اجتماعی مقصد کی خاطر مزاج اور رائے کی قربانی دینے کے لئے اپنے آپ کو ہر صورت میں آمادہ کرنا چاہیے۔ دوسری صورت میں بے شمار فنڈز کی دستیابی کے باوجود قیل وقال، دفتری کاروائیوں اور رسمی فیصلوں کے سوا عملی پیش رفت مشکل ہوتی ہے۔

(د) کام کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ مختلف مقامات پر کام کرنے والے نظریاتی اور فکر مند افراد کے ساتھ مالی تعاون کے ذریعے ان کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ جو ساتھی وسائل کی کمی کی وجہ سے مشکلات کا شکار ہیں، ان کی مدد کی جائے یا ان سے کتابیں خریدی جائیں۔ معمولی سطح کا مالی تعاون بھی تنظیم کے لئے باعث سعادت ہوگا۔ یہ ایک علامتی اظہار ہوگا کہ مالی وسائل سے بہرہ ور ایک تنظیم کام کرنے والے ساتھیوں کی سرپرستی کر رہی ہے۔

ہمارے ادارے سندھ نیشنل اکیڈمی نے اپنے ابتدائی دور میں کمیونزم، اسلام اور سرمایہ داری اور دیگر جدید نظریات پر علمی تنقید اور اسلام کی جدید اسلوب اور نہج میں تفہیم و تشریح کے سلسلہ میں عالم اسلام کے ممتاز مفکرین کی منتخب کتابوں کی تلخیص پر مشتمل بہت سارا لٹریچر سندھی زبان میں چھاپا تھا۔ ان میں سے کچھ کتابوں کی دوبارہ سہ بارہ اشاعت کی ضرورت ہے۔ ایسی کتابوں کی فہرست کچھ اس طرح ہے۔

(۱) مذہب اور سائنس (۲) خدا، اسلام اور جدید سائنس (۳) مارکسزم عقل و تجربہ کی روشنی میں (۴) علم جدید کا چیلنج (۵) مارکسزم کیا ہے (۶) مارکسزم کیوں اور کس لئے (۷) قومیت ایک تجزیہ ایک مطالعہ (۸) زندگی، سائنس اور آخرت (۹) کامریڈ دوستوں دعوت فکر (۱۰) قرآن حکیم اور جدید سائنس (۱۱) بائبل، قرآن اور سائنس (۱۲) ڈارون کا نظریہ ارتقا (۱۳) عقل اور کائنات کی گواہی (۱۴) مذہب اور تخلیق کائنات (۱۵) خدا اور

مذہب، عقل اور سائنس کی روشنی میں (۱۶) انسان، کائنات اور قانون فطرت (۱۷) خدا موجود ہے، چالیس سائنسدانوں کی گواہی (۱۸) جو کچھ میں نے دیکھا (۱۹) دینیات (۲۰) تلاش حق (۲۱) فکر اسلامی کی تشکیل جدید (۲۲) مزارعت، جاگیرداری اور اسلام (۲۳) اسلام اور سائنس (۲۴) کیا خدا ہے؟ (۲۵) اللہ کا پیغام انسانوں کے نام (۲۶) جدلیاتی مادیت (۲۷) سچ کی آگاہی (۲۸) اسلام اور تھیوکریسی (۲۹) انسانوں کا نفسیاتی تجزیہ۔ (۳۰) مغربی تہذیب اور اسلامی تہذیب (۳۱) اسلام دور جدید میں (۳۲) لادینی دور کا تاریخی پس منظر (۳۳) دانائی کا راستہ (۳۴) ترقی پسند فکر کا تنقیدی مطالعہ (۳۵) اسلام اور جدید بیداری کی تحریک (۳۶) اسلام کا معاشی نظام (۳۷) زندگی اور موت کا فلسفہ (۳۸) پیغام حق (۳۹) مشاہدہ حق (۴۰) پرویزی فکر ایک مطالعہ ایک جائزہ (۴۱) عورت جدید معاشرے میں (۴۲) اسلام نے ہمیں کیا دیا؟ (۴۳) اسلام میں حلال وحرام (۴۴) اسلام کا اخلاقی نظریہ (۴۵) مینارہ نور (۴۶) اسلام جدید فکر کے حوالے سے (۴۷) قرآن اور علم جدید (۴۸) اسلامی منشور (۴۹) اسلام، مسلمان اور قوم پرستی (۵۰) اسلام میں علاقائی حقوق کا تصور (۵۱) عالم اسلام دوراہے پر (۵۲) عالمی سامراج اور عالم اسلام (۵۳) کامل رہبر (۵۴) قومی زوال کے اسباب (۵۵) شیخ ایاز کے آخری دس سال (۵۶) علامہ قاضی کے مضامین۔

ان کتابوں کو نئی ترتیب و تدوین کے ساتھ دوبارہ زیر اشاعت لایا جاسکتا ہے۔ یقیناً اسلامی تعلیمات کی تلقین اور اسلام کی مذہبی تشریح اور اسلامی عقائد کی وضاحت کے لئے خالص مذہبی نوعیت کی کتابوں کی بھی ضرورت ہے۔ اس ضرورت کو غیر اہم سمجھنا دین سے عدم تعلق کی علامت ہے۔ اس طرح کے موضوعات پر دوسرے ادارے بھی کام کر رہے ہیں، جو تاجرانہ ضرورت کے مطابق کتابیں چھاپتے ہیں، جبکہ جدید ملحدانہ نظریات پر علمی تنقید اور جدید نہج اور اسلوب میں اسلام کی تفہیم وتشریح کے لئے سندھی زبان میں قابل ذکر کام نہیں ہورہا اور اس میدان میں کام نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس خلا کو بھرنا وقت کی

اہم ضرورت ہے۔

اسلامی نظریاتی کتابیں مارکیٹ سے خرید کر پڑھنے والے لوگ بہت کم ہیں، اس کے باوجود مارکیٹ میں کتاب رکھنا ضروری ہے۔ کچھ نہ کچھ کتابیں نکلیں گی، لیکن جب تک یہ رجحان بڑھے، تب تک ایسی کوشش ہو کہ سندھ کے اہم علمی اداروں، سیکولر دانشوروں، جامعات کے اساتذہ اور لائبریریوں میں کتابیں جانے چاہئیں۔ مشاہدہ ہے کہ کتابیں ضایع نہیں ہوتیں۔ کوئی نہ کوئی فرد ان کتابوں کی طرف دھیان دیتا ہے۔ مجھے گذشتہ تیس سالوں میں ایسے بہت افراد ملے ہیں، جنہوں نے بتایا کہ ہمیں آپ کی کتاب یا رسالے فلاں صاحب سے ملے تھے۔

کسی بھی دعوتی یا علمی ادارے کے کام کو آگے بڑھانے اور کام کو نتیجہ خیز بنانے کے لئے جن بنیادی اوصاف وخصوصیات کی ضرورت ہے، اس کا ذکر بھی ضروری ہے۔ تاکہ یہ اندازہ ہو کہ خواہشات، آرزوؤں اور کاوشوں کے باوجود اداروں کا کام آگے کیوں نہیں بڑھتا۔

(۱) پہلی بات اخلاص ہے، جو تعلق باللہ اور عبادت میں انہماک اور ذکر وفکر کے ذریعے پیدا ہوتا ہے۔ اخلاص کے بغیر دین کے کام میں برکت پیدا ہونا ممکن نہیں ہے۔ اخلاص کے قابل ذکر اجزا کا ہونا ضروری ہے، اگرچہ اخلاص کا اعلیٰ مقام حاصل نہ بھی ہو۔

(۲) استعداد اور صلاحیت کا حاصل ہونا: شروع کردہ کام کے مختلف پہلوؤں اور ان کے بنیادی تقاضوں کا شعور اور ادراک حاصل ہو۔ دور جدید کے علمی چیلنج کا مقابلہ اور اسلام کے علمی اور نظریاتی کام کو آگے بڑھانے کے لئے باطل نظریاتی فکر کا گہرا اور وسیع مطالعہ ضروری ہے، تاکہ اس کا بہتر طور پر توڑ ہوسکے۔ اگر چیلنج کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت و استعداد موجود نہیں ہے تو سینکڑوں کتابیں شایع کرنے کے باوجود باطل قوت، باطل فکر اور باطل تحریکوں کے مقابلے اور ان کے توڑ کی صورت پیدا نہیں ہوسکے گی۔ دعوتی، علمی اور نظریاتی کام کے لئے مطلوبہ صلاحیت و استعداد نہایت ضروری ہے۔ اس صلاحیت کے بغیر

درست سمت میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھایا جاسکتا۔

(۳) بہتر حکمت عملی: دعوتی اور علمی کام کے لئے مخالف کی عزت نفس کو مجروح کیے بغیر اس کے دل اور ذہن کو اپیل کرنے کے لئے بہتر اور مئوثر دلائل دیے جائیں، تاکہ تحریر کے ذریعے دوستانہ ماحول پیدا کرکے علمی مکالمہ کیا جائے، حکمت عملی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ عام مسلمانوں کو خطاب کے لئے خالص مذہبی اسلوب اختیار کیا جائے، ملحدوں، دھریوں، سیکولرسٹوں اور ترقی پسندوں کے لئے جدید علمی اسلوب اختیار کیا جائے۔ ان لوگوں کے لئے مذہبی نوعیت کے حوالے اور مذہبی دلیل نتیجہ خیز نہیں ہوتے۔ یہ لوگ اسلام کے بنیادی عقائد کے منکر ہوتے ہیں۔ علمی اور عقلی استدلال بھی اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے۔ اس طرح کی صلاحیت کو استعمال میں لانا بھی بہتر حکمت عملی کا لازمی حصہ ہے۔

(۴) استقامت کا مظاہرہ کرنا: مسلسل کام کرنا اور ہر قسم کے حالات میں کام کرتے رہنا ضروری ہے۔ اسی سے کام کے اثرات ونتائج پیدا ہوتے ہیں اور نئی راہیں کھلتی ہیں۔

(۵) صلاحیتوں اور توانائیوں کا مکمل استعمال: شروع کیے ہوئے کام میں فرد جز وقتی نہیں، بلکہ کل وقتی اپنی ذہنی اور عملی صلاحیتیں اور توانائیاں خرچ کرے۔ اس طرح کی فنائیت سے افراد پر کام کے اسرار کھلتے ہیں۔ ساری توجہ ایک نکتے پر مرکوز ہونے کی وجہ سے ساری توانائیاں کام میں خرچ ہوتی ہیں، اور وقت کے ساتھ اس کے ہمہ جہتی نتائج ظاہر ہوتے ہیں۔ اگر ایک اسلامی دعوتی، علمی اور ادبی ادارے میں کوئی ایک بھی باصلاحیت فرد اپنی تمام صلاحیتیں صرف کرنے والا نہیں ہے تو وہ ادارہ آگے چل سکے، مشکل ہے۔

(۶) تواضع وانکساری: کسی بھی اسلامی ادارے کے کام کے لئے ایک اہم شرط یہ بھی ہے کہ اس ادارے کے افراد میں ضد، ہٹ دھرمی، اور تکبر نہ ہو۔ انکساری، عاجزی، ملنساری، برداشت، وسعت ظرفی اور وسعت نظری کے بنیادی اجزا کا ہونا ضروری ہے، تاکہ وہ معاشرے کے دیگر افراد کو اپنے علمی کام کے ساتھ ساتھ اپنے اخلاق وکردار کے ذریعے قریب کرسکے۔ تواضع جیسے اوصاف نہ ہونے کی وجہ سے افراد نزدیک ہونے کے

بجائے دور ہوجاتے ہیں۔ علمی اور دعوتی کام، لوگوں کی ذہن سازی کے معاملے میں تو مؤثر ہوتا ہے، لیکن سیرت وکردار کی پاکیزگی سے متاثر کرکے اسلامی دعوت کے کام کے لئے متحرک کرنے میں مددگار ثابت نہیں ہوتا۔

یہ نکتہ نہایت اہم ہے، جس کو ذہن نشین ہونا چاہیے کہ اسلامی فکر کے فروغ کے لئے علمی اور دعوتی کام کی حیثیت روایتی اکیڈمک نوعیت کی نہیں۔ دنیا میں جو علمی ادارے عام طور پر کام کرتے ہیں، ان کا مقصد علم، برائے علم ہوتا ہے یا علمی کام کے ذریعے دولت اور شہرت مقصود ہوتی ہے یا مادی نوعیت کے مفادات ہوتے ہیں۔ مادہ پرستانہ نظریات کا فروغ بھی ان کا مقصد ہوتا ہے۔ جبکہ اسلام کے علمی اور دعوتی ادارے کا مقصد ذہنی تبدیلی کے ساتھ افراد کی حقیقی اور معنوی تبدیلی ہوتی ہے۔ اس کے بغیر اسلام کا علمی کام محض اکیڈمک نوعیت کا ہوتا ہے جو اہم ضرور ہے، لیکن بڑی حیثیت کا حامل نہیں۔

(۷) ایک بڑا وصف جو علمی اور دعوتی ادارے کے افراد میں ہونا ضروری ہے، وہ ہے حقیقی دردمندی، فکرمندی اور کام کے لئے والہانہ جذبے کا ہونا۔ یہی دردمندی ہے، جو آدمی کو کام کے لئے بے چین رکھتی ہے اور اسی فکرمندی اور بے قراری سے کام کی نئی نئی راہیں کھلتی ہیں اور کام کے لوگ ملنے کی صورت پیدا ہوتی رہتی ہے۔ اس فکرمندی اور دردمندی کی بدولت آدمی علمی اور دعوتی کام میں فنا ہوجاتا ہے اور اسی سے افراد کار ملتے ہیں اور افراد سے کام لینے کا طریقہ اور سلیقہ حاصل ہوتا ہے۔

حقیقی دردمندی وہ چیز ہے، جو مارکیٹ سے نہیں خریدی جاسکتی۔ یہ دردمندی اور فکرمندی حقیقی داعیوں کی صحبت اور ان کی برکت سے حاصل ہوتی ہے۔

علمی اور دعوتی ادارے حقیقت میں ایک دو مخلص، دردمند اور باصلاحیت افراد ہی کی کوششوں سے چلتے ہیں۔ یہ کام ہر فرد کے بس کا نہیں ہوتا۔ علمی ادارے اس بات کے متحمل نہیں ہوتے کہ ان میں علمی اور دعوتی مزاج نہ رکھنے والے، تربیتی مراحل اور تجربات و مشاہدات سے گذر کر ایک حد تک پختگی حاصل نہ کرنے والے افراد کو عہدیدار یا ممبر کی

حیثیت سے شامل کیا جائے۔ یہ بڑی غلط فہمی ہے، جو دور ہونی چاہیے۔ اس کی وجہ سے ادارے آگے نہیں بڑھتے اور ان میں، جھگڑے اور تنازعات جنم لیتے ہیں۔ کاروبار کی صلاحیت نہ رکھنے والے فرد کو بہت بھاری سرمایہ بھی فراہم کیا جائے تو وہ کاروبار نہ چلا سکے گا اور سرمایہ ضایع ہوجائیگا۔ ناتجربہ کاری اور کاروباری مزاج نہ رکھنے کا نتیجہ اس کے دوسرا کوئی نہیں نکل سکتا۔

تعاون حاصل کرنے کے لئے افراد کو شامل کیا جاسکتا ہے، لیکن ناتجربہ کار اور صلاحیتوں سے بے بہرہ افراد کو عہدیدار بنانا ایسا ہے کہ اس کا نتیجہ مسلسل کھینچا تانی کے علاوہ برآمد ہونا مشکل ہے۔

ہمارے ملک میں جتنے بھی علمی، دعوتی اور سماجی نوعیت کے ادارے ہیں، ان سب کے پیچھے ایک فرد کی فنائیت کارفرما رہی ہے۔ صدیقی ٹرسٹ، محمد منصورالزمان صدیقی صاحب کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ جمعیت تعلیم القرآن ٹرسٹ حاجی محمد رفیع صاحب کی فکر مندی اور دردمندی کا مرہون منت ہے۔

کسی بھی بڑے ادارے کو انتشار اور جھگڑے کا مرکز بنانا ہو تو اس کی صورت یہ ہے کہ اس میں مختلف مزاج کے بے صلاحیت، باتونی اور بے حس افراد کو بھرتی کیا جائے۔ فاران کلب کراچی اور فاران کلب حیدرآباد اس وجہ سے انتشار کا شکار ہوئے اور معاملات عدالتوں تک پہنچے۔ ان تجربات سے سیکھ کر آگے بڑھنا ہوگا۔

میں ۱۹۸۳ تک بہت سارے اداروں کے تجربات کو دیکھنے کے بعد اس نتیجے تک پہنچا تھا، اس لئے میں نے ممبر سازی اور عہدوں سے ہٹ کر تن تنہا سفر شروع کیا۔ البتہ دوستی اور محبت کی بنیاد پر افراد ملتے گئے اور تعاون بھی ملتا رہا۔ ممبر سازی کی کوشش ہر بار مضر ہی ثابت ہوئی۔ تہذیب نفس کی کمی کی وجہ سے احباب، اداروں سے مفاد وابستہ کرنے کا سوچنے لگتے ہیں اور اپنی رائے اور تجاویز پر اصرار کرنے لگتے ہیں۔ پھر ضد اور انانیت کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ مسائل کے فہم کی کمی بھی اختلاف ونزاع کا باعث بنتی ہے۔

یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ممبر اور عہدیدار نہ ہوں بلکہ اس معاملے میں انتہائی احتیاط کی ضرورت ہے۔ منتخب افراد کو اداروں میں شامل کیا جائے۔ جو رائے کی قربانی دینے والے ہوں۔ قیل وقال سے زیادہ کام کا جذبہ رکھتے ہوں اور معاملات کے مختلف پہلوؤں پر نگاہ کی استعداد رکھتے ہوں۔ ایسے افراد اب بھی مل جاتے ہیں۔ ہمارا معاشرہ ایسے افراد کار سے خالی نہیں ہے۔

ایک اہم نکتہ یہ بھی عرض رکھنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے دین کا سلسلہ تا قیامت جاری رکھنا ہے۔ اللہ کا دین ہماری مدد کا محتاج ہرگز نہیں ہے۔ یہ ہماری اپنی خوش قسمتی ہوگی کہ ہم دین کی بقا کے لئے اپنا کردار ادا کریں۔ دوسری صورت میں اللہ ہمیں مسترد کرکے تحفظ دین کے لئے نئے لوگ سامنے لائیگا۔

میں اپنی گفتگو کو شاہ عبداللطیف بھٹائی کے شعر پر ختم کرتا ہوں۔

واکا کرں مون وس، بدں کرں بروج جو

(چیخ وپکار کرنا اور دعوت فکر دنیا میرا کام، مثبت جواب دینا یا نہ دنیا، دوستوں کا کام ہے، میرا کام تو ہر صورت میں بلاتے رہنا اور دعوت فکر دیتے رہنا ہی ہے)۔ **(ماخوذ ماہنامہ ''بیداری'' فروری ۲۰۱۳ء)**